خزاں کی بارش

سوناگاچی کی راتیں

اے حمید

لاہور میں جنوری کی ابر آلود صبح ...... ہلکی بارش میں شہر سے باہر نہر کنارے کے درخت بھیگ رہے ہیں۔ یہ سفیدے کے درخت ہیں جن کے پتے خزاں کی ہواؤں میں جھڑ گئے ہیں۔ یہ زرد پتے گھاس پر پڑے ویران آنکھوں سے اپنی ان شاخوں کو تک رہے ہیں۔ جن پر وہ کونپلیں بن کر پھوٹے۔ بہار کی ہوائیں میں پروان چڑھے۔ ان کے سایوں میں بیٹھ کر پرندوں نے محبت کے گیت گائے اور پھر ایک دن خزاں کے پہلے جھونکے کے ساتھ ٹوٹ کر گر پڑے۔ سب رشتے ناتے ٹوٹ گئے۔ نہ ساون کی ہواؤں میں جھولا جھلانے والی شاخیں رہیں نہ بہار کی صبح کو تازگی بخشنے والی شبنم رہی اور نہ وہ خوش رنگ پرندے رہے جو چمکیلی روشنی میں محبت کے نغمے سنایا کرتے تھے۔ نہر کنارے ان پتوں کا زرد فرش بچھا ہے۔ یہ بڑا پاکیزہ فرش ہے۔ ہوا بھی اس فرش پر ننگے پاؤں چلتی ہے۔ یہ زرد پتے وہ محبت بھرے خط ہیں۔ جو درختوں نے اپنی محبوبہ زمین کے نام لکھ لکھ کر نیچے گرا دیئے ہیں۔ نہر سفیدے کے ان درختوں کے بیچ سے ہو کر گزرتی ہے۔ نہر کا پانی ہلکی بارش میں اپنے سینے پر ننھے ننھے دائرے بناتا اور نیو کیمپس کی طرف بڑھتا جا رہا ہے آگے لکڑی کا چھوٹا سا پل آتا ہے۔ اس پل کی بائیں جانب ہری بھری ڈھلان ہے جس سے ایک پتھریلا راستہ یوکلپٹس اور آم کے درختوں میں گھری ہوئی ایک دو منزلہ کوٹھی کے گیٹ تک جاتا ہے۔ اس کوٹھی کا نام ’’کینال لاج‘‘ ہے۔

’’کینال لاج‘‘ کی اونچی چار دیواری کو سفید جنگلی گلاب کی بیلوں نے ڈھانپ رکھا ہے۔ اس قدیم کوٹھی کی بالکونیوں پر آم کے درختوں کی ٹہنیاں جھکی ہوئی ہیں۔ چیت و ساکھ

(مہینوں کے ہندی نام) کے بعد جب ان شاخوں پر ہری ہری آم کی کیریاں لگتی ہیں تو شبانہ اب بھی بالکونی میں کھڑی ہو کر انہیں توڑ کر کھایا کرتی ہے۔ شبانہ لاہور ہی کے ایک اعلیٰ معیار کے کالج میں بی اے کی سٹوڈنٹ ہے۔ "کینال لاج" میں اس کی بڑی بہن غزالہ بھی ہے۔ دو بڑے بھائی عامر اور عقیل بھی ہیں۔ والدہ اور والد بھی رہتے ہیں۔ والد کا نام خواجہ غلام احمد ہے جو ریلوے کے بہت بڑے ٹھیکیدار ہیں۔ یہ کوٹھی ان کے والد یعنی شبانہ کے دادا نے بنوائی تھی جب وہ لاہور کی گنجان آبادی والے اپنے آبائی مکان سے نقل مکانی کر کے اس کوٹھی میں آ گئے تھے۔ ان کی وفات کے بعد یہ کوٹھی ان کے اکلوتے بیٹے خواجہ غلام احمد کے حصے میں آ گئی جو شاہ خرچ اور آسائش پسند تھے۔ شبانہ کی والدہ سے ان کی شادی اسی کوٹھی میں ہوئی تھی۔ ریلوے کی ٹھیکیداری بھی انہیں اپنے والد سے وراثت میں ملی تھی۔ وہ دن بھر ٹھیکیداری کے جھمیلوں میں الجھے رہتے مگر شام کو گھر آ کر نہا دھو کر بوسکی کی کشمیری کڑھائی والی قمیص اور سفید شلوار پہن کر اپنے دوستوں کے ساتھ کوٹھی کے لان میں کرسیاں ڈلوا کر بیٹھ جاتے اور چائے اور تاش کا دور شروع ہو جاتا۔ رات کے کھانے پر ہر روز ان کے ساتھ چھ سات دوست ضرور موجود ہوتے اور ان کے لیے خانساماں بڑے اہتمام سے کشمیری کھانے پکاتا جن کی نگرانی شبانہ کی والدہ خود کرتی تھیں۔ خواجہ غلام احمد کی شادی کو تیس پینتیس برس گزر چکے تھے۔ ان کے دونوں لڑکے اور لڑکیاں جوان ہو گئی تھیں۔ خود ان کے بال سفید ہو گئے تھے۔ مگر زندگی اب بھی بھرپور طریقے سے بسر کر رہے تھے۔ رات کے کھانے پر اب بھی ان کے دو چار دوست ضرور مدعو ہوتے۔ بڑا لڑکا عقیل ان کے ساتھ ٹھیکیداری کرتا تھا۔ اس سے چھوٹا عامر بی۔اے کرنے کے بعد یورپ جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ بڑی لڑکی غزالہ نے ایف اے تک پڑھنے کے بعد گھر کے کام کاج میں والدہ کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔ شبانہ سب سے چھوٹی تھی اور زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس کا رجحان انگریزی ادب، مصوری اور شاعری کی طرف تھا۔ وہ خود شعر نہیں کہتی تھی مگر انگریزی فرانسیسی اور اردو شاعروں ادیبوں کی کتابیں اس نے اپنے کمرے کی الماریوں میں جمع کر رکھی تھیں جنہیں وہ رات گئے تک پڑھا کرتی۔

ادب کے مطالعہ نے شبانہ کی شخصیت میں ایک جمالیاتی حسن اور وقار پیدا کر دیا تھا۔ اور اس نے خواب دیکھنے شروع کر دیئے تھے۔ ایسے خواب جن میں وہ پائین اور برچ کے درختوں میں بنے ہوئے قدیم محرابی دروازوں والے پر اسرار محل دیکھتی جن کے دھند میں ڈوبے باغوں کے قطعوں میں سرخ اور سفید گلاب کھلے ہوتے۔ کسی سنگ مرمر کی جھکی ہوئی بالکونی میں وہ ایک شہزادے کو دیکھتی کہ سترہویں صدی کے خوش رنگ لباس میں ملبوس ہاتھ میں رباب لئے کھڑا اسے اپنی طرف بلا رہا ہے۔ یہ خواب شبانہ رات کو بھی دیکھتی اور کبھی دن کے وقت بھی وہ ان خواب آلود خیالوں میں کھو جاتی جب وہ اپنی سرخ گاڑی میں کالج جا رہی ہوتی۔ پھر وہ اچانک کسی آواز سے چونک پڑتی اور خوابوں کا یہ رنگین سلسلہ ٹوٹ جاتا اور اس کے سارے رنگ بکھر جاتے۔

کالج میں وہ سب سے خوبصورت اور بہترین لباس والی لڑکی مشہور تھی۔ ایف اے تک وہ ایک شوخ و شنگ لڑکی تھی جس کی شرارتوں سے کوئی پروفیسر اور اس کی کوئی سہیلی نہیں بچ سکتی تھی لیکن انگریزی ادب اور شعر کے مطالعے نے اسے اپنے حلقہ طلسم میں لینا شروع کر دیا اور وہ سنجیدہ ہوتی گئی۔ مگر وہ خشک نہیں ہوئی تھی۔ وہ اب بھی کالج کی سہیلیوں کے ساتھ قہقہے لگاتی تھی مگر اب اس کے قہقہوں میں ایک آہنگ، موسیقی اور دل میں اتر جانے والا وقار پیدا ہو گیا تھا۔ انہی دنوں وہ اپنے بڑے بھائی کے ساتھ گرمیوں کی چھٹیوں میں یورپ گئی تو آسٹریا میں اسے قدیم کلاسیکی موسیقاروں کی کمپوزیشنز سننے کا موقع ملا۔ شوپین اور بیتھوون کی سمفنیز نے اسے بے حد متاثر کیا۔ لاہور واپس آئی تو وہ موسیقی کے آہنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس نے پنجاب کی صوفیانہ موسیقی کے کتنے ہی کیسٹ خرید لئے۔ وہ انہیں روز رات کو اپنے ڈیک میں لگا کر سنتی۔ جدید یورپی موسیقی کی تال اور پنجابی موسیقی کے درد بھرے سروں نے شبانہ کی شخصیت میں ایک گداز پیدا کر دیا۔ وہ اپنے ساتھ یورپ سے شوپین اور بے بیتھوون کے لانگ پلے اور بہت سے کیسٹ لائی تھی۔ وہ انہیں سنتی تو ان گنت وائلنوں کی والہانہ لہریں اسے کشادہ سمندروں میں لے جاتیں جہاں وہ ایک ربی وسعت میں اپنے آپ کو جذب ہوتا محسوس کرتی۔ جدید مغربی موسیقی کی ردھم اس

کے خون میں زندگی اور توانائی کے نئے سورج طلوع کرتی اور پنجاب کی صوفیانہ موسیقی سنتے ہوئے اس کے معصوم اور پاکیزہ دل میں ان جانے جذبوں کی کونپلیں اپنے آپ پھوٹنے لگتیں۔

جس وقت کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس وقت جنوری کی ابر آلود صبح ہے اور لاہور شہر ہلکی ہلکی سرد بارش میں بھیگ رہا ہے۔ شبانہ کی رہائش گاہ "کینال لاج" والی نہر خاموشی سے بہہ رہی ہے۔ کنارے پر بچھا زرد پتوں کا فرش موسم سرما کی ہلکی بارش میں بھیگ رہا ہے۔ "کینال لاج" کے کچن میں خانساماں اور دو نوکرانیاں کوٹھی میں رہنے والوں کے لیے ناشتہ تیاری کر رہی ہیں۔ شبانہ کی بوڑھی والدہ اپنے کمرے میں تخت پر قالین بچھائے بیٹھی آنکھیں بند کیے تسبیح پھیر رہی ہیں۔ ان کے بے آواز ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے ہیں۔ شبانہ کے والد خواجہ صاحب قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے اپنے سفید بالوں میں کنگھی کر رہے ہیں۔ باہر سخت سردی ہے مگر کمرے کے آتشدان میں گیس کے ہیٹر کی وجہ سے ہلکی ہلکی پرسکون گرمائش ہے۔ دوسرے کمرے میں شبانہ کی بڑی بہن غزالہ الماری میں سے دھلے ہوئے میز پوش نکال رہی ہے۔ شبانہ کا بڑا بھائی عقیل بھی اپنے کمرے سے تیار ہو کر نکل آیا ہے۔ اور درمیان والے کمرے کی لمبی میز پر آ کر بیٹھ گیا ہے اور اخبار کھول کر پڑھنے لگا ہے۔ عامر ابھی تک اپنے کمرے میں سو رہا ہے۔ شبانہ بھی کالج جانے کے لیے تیار ہو رہی ہے۔ اس کے ڈیک کے پلیئر میں خواجہ فرید کی کافی کی ٹیپ آہستہ آہستہ چل رہی ہے اور کمرے میں فریدہ خانم کی دھیمی آواز ابھر رہی ہے۔

سانول موڑ مہاراں

شبانہ صبح کو روزانہ کافی سنتی ہے۔ بالوں کو سنوارنے کے بعد شبانہ نے جیکٹ پہنی۔ کلون کا اسپرے کیا اور قد آدم آئینے میں آخری بار اپنے لباس کا جائزہ لیا۔ وہ اب سادہ مگر خوبصورت لباس پہنتی تھی۔ خوبصورت ان معنوں میں کہ وہ اپنے لباس کی کٹنگ اپنی نگرانی میں کرواتی تھی۔ اس کے کمرے کے آتشدان میں لکڑی کے دو بڑے بڑے کندے جل چکے تھے اور ان کے انگاروں پر سفید راکھ کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ شبانہ کو گیس کا ہیٹر پسند

نہیں تھا۔ وہ قدیم کلاسیکی فضاؤں میں رہنے والی لڑکی تھی۔ سولھویں اور سترہویں صدی کی یورپی کلاسیکی فضائیں۔ جہاں آئی وی کی خود رو بیلوں سے ڈھکی ہوئی دیواروں والے پرانے قلعوں کی سبز پوش کھڑکیوں میں چاندنی راتوں کو شہزادیاں اترا کرتی تھیں۔ شبانہ کے کمرے کی فضا نیم گرم تھی۔ جس میں بیش قیمت فرانسیسی کلون کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ شبانہ نے پلیئر کو بند کر دیا اور شیشے کی کھڑکی کھول کر بالکونی میں آئی تو جنوری کی بارش میں بھیگتی سرد ہواؤں نے اس کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ شبانہ نے ایک جھرجھری سی لی مگر وہ بالکونی میں آ کر کھڑی ہو گئی۔

پرانے آم کے درخت کی شاخیں بالکونی پر جھکی ہوئی تھیں۔ ان کے پتوں سے بارش کا پانی بالکونی کے فرش پر ٹپک رہا تھا فضا میں گھاس، درختوں کے پتوں اور نہر کنارے اگی ہوئی جھاڑیوں کی ترو تازہ مہک تھی۔ شبانہ نے گہرا سانس لیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے موسم سرما کی الائچیوں کی خوشبو والی ٹھنڈی مہک اس کے سارے جسم میں سرایت کر گئی ہو۔ بارش کی شفاف ٹھنڈی بوندیں اس کے چہرے پر پڑیں۔ شبانہ کے ہونٹوں پر گرم اور زندگی سے بھرپور مسکراہٹ نمودار ہوئی جیسے اس نے بارش کو ایک حسین شہزادی کے روپ میں اپنے سامنے مسکراتے ہوئے دیکھ لیا ہو۔ وہ بالکونی سے اتر کر واپس اپنے نیم گرم کمرے میں آ گئی۔ پہلی منزل کے ڈائننگ روم میں اس کی والدہ، والد، بڑا بھائی عقیل اور غزالہ پہلے سے موجود تھے۔ دنیا جہان کی باتیں ہو رہی تھیں۔ شبانہ سیڑھیاں اتر کر آئی تو عقیل نے کہا۔

"آج تمہاری سیلون کی چائے تمہیں نہیں مل سکتی۔
تمہیں سبز چائے پینی پڑے گی۔"

شبانہ نے اپنے والد کی طرف دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے اپنے سبز چائے کے پیالے میں باقر خانی بھگو رہے تھے۔

"ابو! ضرور رات آپ نے اپنے دوستوں کو پلا دی ہو گی۔"

باپ نے کہا۔ "ارے بیٹی! تھوڑی سی تو رہ گئی تھی۔ عقیل تمہیں ٹولنٹن مارکیٹ سے نیا ڈبہ لا دے گا۔" عقیل نے ٹوسٹ پر مکھن جماتے ہوئے کہا۔

"میں تو سائٹ پر جا رہا ہوں۔ شبانہ تم خود ہی کالج سے واپس آتے ہوئے لیتی آنا"

غزالہ بولی۔ "آج سبز چائے سے ہی ناشتہ کر لو بے بی۔"

"شبانہ نے تنگ کر کہا۔ "دیکھئے امی جان مجھے باجی نے پھر بے بی کہا۔ میں بے بی نہیں ہوں۔"

غزالہ ہنسنے لگی۔ شبانہ کی والدہ نے سبز چائے کا گھونٹ لیا۔ سفید رومال اپنے ہونٹوں سے لگایا اور کہا۔

"بیٹی! ہمارے لئے تو تم بے بی ہی ہو۔"

شبانہ نے ناراضگی سے کہا۔ "میں بے بی نہیں ہوں۔ میں شبانہ ہوں۔ بی۔اے کی سٹوڈنٹ -----"

عقیل بولا۔ "بی اے کے پہلے سال میں ہی ہو ناں۔"

"پھر کیا ہوا۔" شبانہ نے جھنجھلا کر کہا۔ "اگلے سال دوسرے ایئر میں جاؤں گی۔"

خواجہ صاحب نے خانساماں سے کہا۔ "اسد جو! بھائی میری بچی کے لیے بڑی عمدہ انگلش چائے دم کر کے لاؤ۔"

خانساماں اسد جو فوراً کچن کی طرف چلا گیا۔ غزالہ کہنے لگی۔

"شبانہ! یہ جو تم صبح صبح لپٹن چائے پیتی ہو اس کی جگہ کبھی سبز چائے پی کر دیکھو تو تمہاری طبیعت سارا دن بشاش رہے۔"

شبانہ نے ٹشو پیپر نکالتے ہوئے کہا "باجی! مجھے صبح کو سبز چائے اچھی نہیں لگتی میں کیا کروں۔"

شبانہ کی والدہ بولیں۔

"بیٹی سبز چائے تو ہم کشمیریوں کی گھٹی میں پڑی ہے اور پھر یہ خشک بھی نہیں ہوتی۔"

عقیل ناشتہ کرتے ہوئے اخبار بھی پڑھ رہا تھا۔ بولا۔

"غزالہ اصل میں انگریزی ادب کی اسٹوڈنٹ ہے اسی لیے اسے انگریزی چائے ہی پسند ہے۔"

شبانہ کارن فلیکس میں دودھ ملا رہی تھی۔ کہنے لگی۔ "بھائی جان! آپ بھی انگریزی ادب پڑھیں۔ مگر آپ کو تو ٹھیکیداری ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ اچھا میں آج آپ کو شیلے کی نظموں کی کتاب دوں گی۔"

"یہ تم ہی پڑھا کرو۔" عقیل نے بیزاری سے کہا۔ "اب شیلے ہمارے کسی کام نہیں آسکتا۔"

شبانہ کے والد نے عقیل کی طرف دیکھ کر کہا۔ "ریلوے ہیڈ کوارٹر میں ایکس سی این سے مل کر سائٹ پر جانا۔ اور ہاں ان سے پہلے والے بل کی بات بھی کرنا۔ پندرہ لاکھ کی پے منٹ خوامخواہ رکی ہوئی ہے۔"

خانساماں شبانہ کے لیے انگلش چائے دم کر کے لے آیا۔ شبانہ نے پیالی میں چائے انڈیلی تو اسے یوں لگا جیسے پیالی میں سورج غروب ہو رہا ہے۔ ایک لمحے کے لیے وہ پھر خواب کے جزیروں میں نکل گئی۔ اس کے اردگرد کوئی چہرہ نہیں تھا۔ کوئی شکل نہیں تھی۔ کوئی آواز نہیں تھی۔ صرف ایک آواز تھی۔ ہلکی بارش کے قطروں کی درخت کے پتوں پر گرنے اور پھر وہاں سے پتھریلے فرش پر ٹپکنے کی آواز ----- وہی سبز بیل میں ڈھکا ہوا قلعہ تھا جس کی سبز پوش بالکونی میں سترہویں صدی کا خوش لباس شہزادہ بربط ہاتھ میں لئے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اچانک کسی نے اسے آواز دی۔

"شبو! کیا سوچ رہی ہو۔ کالج سے دیر ہو رہی ہے تمہیں۔"

یہ غزالہ کی آواز تھی۔ شبانہ نے چونک کر دیکھا وہ ایک بار پھر اپنے بہن بھائیوں میں واپس آگئی تھی۔ غزالہ کرسی گھسیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ شبانہ کے والد اور عقیل بھی اٹھ کر اپنے اپنے بریف کیس لیے کمرے سے نکل گئے۔ شبانہ نے اپنی امی جان کے گلے میں بانہیں ڈال کر ان کا نورانی ماتھا چوما اور کہا۔

"امی! میں جا رہی ہوں۔"

ماں نے بیٹی کو پیار کیا اور دعا دی۔ شبانہ کتابیں اٹھائے کمرے سے نکل کر کوٹھی کے برآمدے میں آگئی۔ ہلکی ہلکی بارش ابھی تک ہو رہی تھی۔ اس کے والد اور بھائی کار کو

گیراج سے نکال کر گیٹ کی طرف مڑ گئے۔ لان کے سنگین بھیگے ہوئے فرش پر بارش اور سرد ہواؤں میں دوڑ کر گیراج میں گئی اور اپنی سرخ گاڑی میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کیا اور آہستہ سے اسے باہر نکالا اور پھر اسے گیٹ کی طرف موڑ دیا اور تھوڑی دیر بعد اس کی کار نہر کنارے والی پکی سڑک پر بارش میں رواں دواں تھی۔ آج اس کے صرف دو پیریڈ تھے۔ اسے دو بڑے ضروری کام بھی کرنے تھے۔ ایک تو ٹولنٹن مارکیٹ میں جا کر سیلون کی چائے کا ڈبہ خریدنا تھا اور دوسرے لائبریری سے ہنری تھارو کی کتاب "والڈن" ایشو کروانی تھی۔ اس کتاب کا حوالہ شبانہ نے ولیم فاکنر کے ایک چھپے ہوئے لیکچر میں پڑھا تھا اس نے اپنے لیکچر میں "والڈن" کی کتاب کی اس قدر تعریف کی تھی کہ شبانہ نے فوراً کالج کی لائبریری میں اس کی تلاش شروع کر دی۔ مگر وہاں اسے نہ مل سکی۔ اس نے شہر کی مشہور دکانوں پر بھی اسے ڈھونڈا مگر ناکام رہی۔ اب وہ سرکاری لائبریری میں اس کا پتہ کروانا چاہتی تھی۔ اسے امید تھی کہ لائبریری میں اسے یہ کتاب ضرور مل جائے گی۔

بوندا باندی مسلسل ہو رہی تھی۔ شبانہ نے گاڑی کالج کے پارکنگ میں ایک طرف کھڑی کر دی۔ کالج کے احاطے میں سنبل کے تناور درخت بارش میں ٹپک رہے تھے۔ شبانہ نے دیکھا کہ کلاس رومز کے برآمدے میں اس کی سہیلیاں ٹکریوں میں بیٹھی خوش گپیوں میں مشغول تھیں۔ کئی ایک نے دور سے ہاتھ ہلا کر شبانہ کا خیر مقدم کیا شبانہ ٹپکتے درختوں کے نیچے سے تیز تیز قدموں سے گزر کر برآمدے میں آ گئی۔ نجمی اس کی خاص سہیلی اسے دیکھ کر اسی کی طرف بڑھی۔ "شبو! آج تو غضب کا موسم ہے۔ چلو شیزان میں چل کر کافی پیتے ہیں۔"

شبانہ نے اپنی جیکٹ پر سے بارش کے قطرے جھاڑتے ہوئے کہا۔ "مجھے ٹولنٹن مارکیٹ اور لائبریری تک جانا ہے۔ واپسی پر کافی بھی پیتے آئیں گے۔"

نجمی نے کہا۔ "تم کیسی رومانٹک لڑکی ہو کہ ایسی خوبصورت بارش میں بھی پیریڈ اٹینڈ کرو گی۔ چلو ابھی چلتے ہیں پھر بارش رک جائے گی۔"

شبانہ نے مسکراتے ہوئے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی اور بولی۔ "اری نجمی! ابھی تو نہ

لائبریری کھلی ہو گی نہ ٹولنٹن مارکیٹ"

نجمی نے شبانہ کو بازو سے پکڑ کر برآمدے کی سیڑھیوں کی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ "اتنی دیر ہم شیزان میں بیٹھ کر کافی پیئیں گے۔"

دونوں گاڑی میں بیٹھ کر مال کی طرف روانہ ہو گئیں۔ جنوری کی بوندا باندی کا تسلسل جاری تھا۔ مال روڈ بھیگ رہی تھی۔ دونوں جانب کھڑے پیپل کے گنجان درخت بھی بھیگ رہے تھے۔ کار کے وائپرز مسلسل چل رہے تھے۔ شبانہ گاڑی چلا رہی تھی۔ نجمی نے فوریز گروپ کے گانے کی کیسٹ لگا دی۔ گانے کے بول اور اس کی کمپوزیشن اور انٹرول میوزک کی لہریں شبانہ کو جیسے بہا کر لے گئیں۔ "میں جاننا چاہتا ہوں محبت کیا ہے" گیت کے بولوں میں ایک طلسم تھا۔ ایک کشش تھی جو شبانہ کو ان دیکھے جزیروں اور گمنام جنگلوں میں کھینچ کر لے گئی۔ اس ٹیپ کو وہ کبھی کبھی ہی سنا کرتی تھی۔ خاص طور پر جب کبھی وہ گاڑی میں اکیلی بیٹھی شہر کی سنسان سڑک پر سے گزر رہی ہوتی تھی۔ اسے اپنی والدہ سے سنا ہوا ایک پرانا کشمیری گیت یاد آ گیا جس میں ایک لڑکی جو زعفران کے کھیتوں میں راستہ بھول جاتی ہے اور کہتی ہے۔ "میں زعفران کی تلاش میں نکلی تھی کہ راستہ بھول گئی۔ ڈل پر کھلے ہوئے کنول کے پھول رات کے اندھیرے میں ڈوب گئے ہیں۔ میں گھر کیسے پہنچوں گی؟" شبانہ کو ایسے لگا جیسے وہ بھی زعفران چننے نکلی تھی کہ گھر کا راستہ بھول گئی مگر اسے رات کے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے کنول کے سفید پھول اب بھی دکھائی دے رہے تھے۔

نجمی نے چونک کر کہا۔ "اری شبو! کہاں جا رہی ہو؟ ہم تو شیزان سے آگے نکل آئے ہیں۔"

شبانہ نے ایک دم سے گاڑی کی رفتار کم کر دی اور پھر "سوری" کہہ کر گاڑی کو سائیڈ لین میں لے آئی۔ یہاں سے دوبارہ گاڑی سڑک پر ڈالی اور اسے شیزان کے سامنے درختوں کے نیچے لا کر کھڑا کر دیا۔

شیزان کی فضا نیم گرم اور پرسکون تھی اس کی فضا میں کافی کی دھیمی دھیمی تلخی آمیز مہک رچی ہوئی تھی۔ اس مہک میں یوکلپٹس کی ان شاخوں کی ہلکی خوشبو بھی تھی جو تانبے

کے بڑے گلدان میں سجائی ہوئی تھیں۔ شیزان میں خاموشی تھی۔ صرف دو گاہک کونے کی جانب بیٹھے بڑے سکون سے ناشتہ کر رہے تھے۔ شبانہ اور نجمی بہت خوش ہوئیں۔ ایک تو شیزان میں زیادہ لوگ نہیں تھے۔ دوسرے انہیں اپنی پسند کی شیشے کی دیوار کے پاس والی میز مل گئی جہاں سے بارش میں بھیگتی مال روڈ کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ ان دنوں نجمی کا ندیم سے رومان بڑے زور و شور سے چل رہا تھا جو یونیورسٹی کا اسٹوڈنٹ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو خط بھی لکھتے تھے۔ ٹیلیفون بھی کرتے تھے اور ہفتے میں دو ایک بار کسی خفیہ جگہ پر مل بھی لیتے تھے۔ نجمی ندیم سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ شبانہ کو اس کے رومان کا علم تھا۔ بلکہ شبانہ اس کی رازدار تھی۔ مگر اسے نجمی کے رومان سے کوئی زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اصل میں شبانہ خوابوں میں رہنے والی اور خواب دیکھنے والی لڑکی تھی۔ حقیقت کی دنیا میں رہنے والے لوگ اسے کوئی اجنبی مخلوق نظر آتی تھی اور ان کے مسائل اس کی سمجھ سے باہر تھے۔ شبانہ اپنی خواب کی دنیا کو ہی حقیقت کی دنیا سمجھتی تھی۔ وہ اصلی زندگی میں یوں زندگی بسر کر رہی تھی جیسے سوتے میں کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔ ہوٹل کا ویٹر قالین پر بے آواز قدموں سے چلتا ان کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔

نجمی نے کافی اور کچھ سینڈوچز لانے کا آرڈر دیا۔ شبانہ آرام دہ کرسی میں دھنسی شیشے میں سے باہر مال روڈ کو دیکھ رہی تھی۔ جہاں بارش میں گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ کبھی کوئی رین کوٹ پہنے تیز تیز قدموں سے گزر جاتا۔ سڑک کنارے کے پیپل کے گنجان درختوں کی ٹہنیاں ابر آلود موسم کی سرد ہوا میں ادھر ادھر لہرا رہی تھیں۔ باہر کی آوازیں بہت دھیمی ہو کر شیزان کی فضا میں آتی تھیں۔ شبانہ بھی ذہنی طور پر ایک ایسی ہی پر اسرار گمنام فضا میں رہتی تھی جہاں حقیقت کی دنیا کی آوازیں اور لوگوں کا شور بند شیشے کی دیواروں میں سے بہت ہی دھیما ہو کر اس تک پہنچ پاتا تھا۔ وہ جس فضا میں دن رات کا زیادہ حصہ بسر کرتی اس میں اسے اپنے ہی خیالات آپس میں سرگوشیاں کرتے سنائی دیتے۔ دور شجاعت کے جفاکش نا ت خواتین کی آبرو کی خاطر اپنی جان قربان کرتے نظر آتے اور سبز پوش

بالکونی میں بربط بجاتے خوش لباس شہزادے اسے اپنی طرف بلاتے

نجمی اسے کچھ کہہ رہی تھی۔ شبانہ کی خوابناک محویت کا سلسلہ جہاں ٹوٹا وہاں اسے نجمی کی آواز سنائی دی۔ "میں نے اس کے بعد بالکل فون نہیں کیا۔"

شبانہ نے پوچھا۔ "کس کو فون کیا تم نے؟"

نجمی نے تعجب سے شبانہ کی طرف دیکھا اور بولی۔ "یہ تمہاری بیٹھے بیٹھے گم ہو جانے کی عادت کب پیچھا چھوڑے گی۔ مجھے تم بہت بور لگنے لگی ہو۔"

شبانہ فوراً سمجھ گئی کہ نجمی یقیناً ندیم کی بات کر رہی ہوگی۔ وہ مسکرا دی۔ "ارے میں تو تمہیں مذاق کر رہی تھی تو کیا اب ندیم کو تم فون نہیں کرو گی؟"

نجمی نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "اس نے یہ کہہ کر مجھے اوفنڈ کیا ہے کہ پہلے میں اسے ٹیلیفون کروں۔ کیوں؟ وہ کیوں نہیں کرے گا؟ یہ ایکویٹی کا زمانہ ہے عورت اور مرد کے حقوق برابر ہیں۔"

شبانہ نے ایک گہرا سانس بھرا۔ "اچھا کافی تم بناؤ گی یا میں بناؤں؟"

کافی میز پر رکھ دی گئی تھی نجمی خاموشی سے کافی بنانے لگی۔

"اچھا شبو۔ ایک بات بتاؤ۔ ندیم کا یونیورسٹی میں یہ آخری سال ہے۔ وہ کہتا ہے میں ہائی ایجوکیشن کے لئے باہر جاؤں گا۔ دو سال کے لئے۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے وہاں کہیں فکس نہ ہو جائے۔"

شبانہ کو یہ باتیں عجیب سی لگ رہی تھیں۔ مگر نجمی اس کی بڑی اچھی سہیلی تھی اس کے مسائل میں اسے دلچسپی لینی ہی پڑتی تھی۔ ویسے بھی اسے نجمی سے ہمدردی اور محبت تھی۔ وہ اسے زندگی میں سکھی دیکھنا چاہتی تھی۔ اس نے کہا۔ "تم بھی اس کے ساتھ کیوں نہیں چلی جاتیں؟"

نجمی نے غصے سے شبانہ کی طرف دیکھا۔ "تم مذاق کے موڈ میں ہو تو میں کوئی اور بات شروع کر دیتی ہوں۔"

"ارے بھئی میں تو سیریس ہوں۔" شبانہ نے کہا۔

نجمی جھنجلا کر بولی۔ "میں اس کے ساتھ کیسے جا سکتی ہوں؟ مجھے کون بھیجے گا شادی سے پہلے؟"

"تو پھر اس سے شادی کر لو۔"

نجمی نے چمچ پلیٹ میں رکھ دیا اور ٹشو سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولی۔ "چلو چھٹی ہوئی۔ اچھا کہا گویا شادی اتنی آسان ہے میرے گھر والوں کو تم اچھی طرح سے جانتی ہو وہ میری شادی خالد سے کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔"

خالد نجمی کا قریبی رشتے دار تھا اور باہر سے سول انجینئرنگ کی ڈگری لے کر پاکستان آنے ہی والا تھا۔ نجمی کو وہ ذرا پسند نہیں تھا۔ وہ کہا کرتی تھی کہ وہ چبا چبا کر باتیں کرتا ہے۔ مجھے برا لگتا ہے۔ ویسے بھی وہ ندیم کو پسند کر چکی تھی۔ اس سے محبت کرتی تھی اور دونوں ایک دوسرے کے مزاج سے اچھی طرح نہ صرف واقف ہو چکے تھے بلکہ قبول بھی کر چکے تھے۔ شبانہ بھی ندیم سے مل چکی تھی۔ اس کے خیال میں ندیم غیر سنجیدہ اور متلون مزاج تھا لیکن ابھی لڑکا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ باتیں وقت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہیں اس نے نجمی سے کہا۔ "تم امّی سے کہہ کیوں نہیں دیتیں کہ خالد تمہیں پسند نہیں اور تم ندیم سے شادی کرنا چاہتی ہو۔" نجمی نے اپنا ماتھا پکڑ لیا۔ "کاش میں ایسا کر سکتی شاید ابھی ایسا نہیں کہہ سکتی۔ امّی بھی خالد کے حق میں ہیں۔ دیکھا جائے گا۔ وقت آئے گا تو صاف کہہ دوں گی۔ آخر میری مرضی کے بغیر تو وہ مجھے کسی کے حوالے نہیں کر سکتے۔"

شبانہ نے مذاق کرتے ہوئے کہا۔ "تم جہاں امّی ابو کہتے ہیں وہاں شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟"

نجمی نے چمچہ مٹھی میں دباتے ہوئے کہا۔ "تمہارے سر پر مار دوں گی یہ چمچ۔۔۔۔"

شبانہ کافی پینے لگی۔ وہ مسکرا دی تھی۔ نجمی بولی۔ "جب تمہارے دل پر چوٹ لگے گی تو پوچھوں گی ابھی تو تم کتابوں میں ہی غرق رہتی ہو۔"

شبانہ نے کہا۔ "بھئی میں تو شادی اور محبت وغیرہ کی بالکل قائل نہیں ہوں۔ یہ

دونوں چیزیں وقت ضائع کرنے والی باتیں ہیں۔"

نجمی نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا۔ "برٹرینڈ رسل کی نانی نہ بنو۔ جب تم پر بھی یہ وقت پڑے گا تب پوچھوں گی آرام سے کافی پیو۔ ویسے شبو آج کافی کچھ ٹھیک نہیں بنی۔ میں اور منگواتی ہوں۔"

اس نے میز کی سطح پر آہستہ سے چمچ بجایا۔ کونے میں کھڑے ویٹر نے سر گھما کر دیکھا اور تیزی سے بڑھا۔ نجمی نے اسے دوسری کافی لانے کو کہا۔ شبانہ نے گھڑی دیکھی اور کہنے لگی۔

"نجمی میں پہلا پیریڈ اٹینڈ کر ہی لیتی تو اچھا تھا مس بھگت کا پیریڈ تھا۔ وہ ناراض ہو جائے گی۔"

نجمی نے سر کو ہلکا سا جھٹک دیا۔ "مس بگلا بھگت تمہیں کچھ نہیں کہے گی تم اس کی فیورٹ اسٹوڈنٹ ہو۔ اب بھول جاؤ اور میرا کافی کا موڈ تباہ نہ کرو۔ پہلے ہی کافی خراب نکلی ہے۔"

دوسری دفعہ شبانہ نے خود کافی بنائی۔ وہ دیر تک شیزان کے اس پرسکون کونے میں بیٹھی کافی پیتی اور باتیں کرتی رہی۔ باہر بارش تھم گئی تھی لیکن آسمان پر اسی طرح بادل چھائے ہوئے تھے۔ نجمی نے کہا۔

"شبو! بائی گاڈ آج یہاں سے اُٹھنے کو دل نہیں کرتا۔"

شبانہ باہر مال پر آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔ "اور کافی بناؤں؟"

"تم پیو گی؟" نجمی نے پوچھا۔

"تمہارے ساتھ میں بھی پی لوں گی۔"

شبانہ نے دوسری بار بھی خود ہی کافی بنائی۔ پھر وہ گاڑی میں بیٹھ کر پہلے ٹولنٹن مارکیٹ پہنچیں۔ مارکیٹ کی دکانیں کھل چکی تھیں۔ مارکیٹ کی فضا میں ولائتی پرفیومز کی ملی جلی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں ایک خاص دکان پر فوراً چائے ملتی تھی۔ شبانہ نے سیلون ٹی کے دو ڈبے خریدے۔ نجمی نے چھوٹی بہن کے لئے فوراً چاکلیٹ خریدے

اور دونوں باتیں کرتیں مارکیٹ سے باہر آ گئیں۔

جس لائبریری میں شبانہ کو ولیم تھارو کی کتاب تلاش کرنے جانا تھا وہ وہاں سے چند قدموں کے فاصلے پر تھی۔ شاید یہ پاکستان کی سب سے پرانی لائبریری تھی۔ ایک پرسکون خاموش اکیلی اکیلی سی سڑک مارکیٹ کے پچھواڑے سے گزرتی تھی۔ لائبریری کا محرابی گیٹ اسی سڑک پر تھا۔ اس گیٹ پر بوگن ولا کی گلابی پھولوں والی بیل چڑھی ہوئی ہے نصف دائرے کی شکل میں ایک پکی روش پرانی اور نئی لائبریریوں کے برآمدے کی طرف جاتی ہے۔ پرانی لائبریری کے گنبد پر کائی جمی ہوئی ہے۔ اس کے اندر داخل ہوں تو ٹھنڈا اندھیرا اور کتابوں کی خاص پرانی خوشبو آپ کا خیر مقدم کرتی ہے۔ کتابوں کی الماریاں چھت تک چڑھی ہوئی ہیں۔ کونے میں اخبارات کی فائلوں کے ڈھیر پڑے ہیں فرش اکھڑ کر جگہ جگہ سے بیٹھ گیا ہے۔ جافریوں میں پرانے بوسیدہ میز بچھے ہیں جن پر روز کے اخبارات لا کر ڈال دیئے جاتے ہیں۔ یہاں زیادہ تر تحقیق کا کام ہوتا ہے۔ اکثر عینک پوش اکتائے ہوئے بوڑھے بوڑھے چہرے دکھائی دیتے ہیں۔ لائبریری کے جدید حصے میں کتابوں کے شیلف قرینے سے لگائے گئے ہیں۔ فرش پر پالش چمکتا ہے پہلو کے رخ بنے ہوئے آہنی شیلفوں کے بیچ بیچ میں سبز میز ڈال کر آمنے سامنے کرسیاں رکھی ہوئی ہیں۔ یہاں بیٹھ کر لوگ کتابوں کا مطالعہ بھی کرتے ہیں اور نوٹس بھی تیار کرتے ہیں۔ مغربی کونے میں یہاں ماڈرن طرز کی ایک جافری بنی ہے جس کی دوسری جانب لائبریری کا عقبی لان ہے۔ جافری سے روشنی چھن چھن کر اندر لائبریری کے ہال میں آتی ہے۔ اس جافری میں ایک علیحدہ چھوٹی میز لگی ہے۔ اس میز کے آمنے سامنے بھی اسٹیل کی دو کرسیاں بچھی ہیں۔ شبانہ اور نجمی لائبریری کے جدید پورشن میں داخل ہوئیں تو سکون کا سانس لیا۔ کیونکہ باہر والی شدید سردی اور یخ ہوائیں نہیں تھیں۔ فضا میں ایک سنجیدہ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ لوگ میزوں کے سامنے بیٹھے خاموشی سے مطالعہ کر رہے تھے۔ شبانہ اور نجمی کی ایڑیوں کی ٹک ٹک پر کچھ چہروں نے گردنیں اٹھا کر انہیں ایک لمحے کے لئے دیکھا اور پھر کتابوں اور رسالوں پر جھک گئے۔ شبانہ اور

نجمی ہونٹوں کو دبائے مسکراتی ہوئی لائبریری کے کاؤنٹر پر گئیں۔ شبانہ نے "والڈن" کے بارے میں پوچھا تو کاؤنٹر کلرک نے مغربی کونے کی جانب ایک شیلف کی طرف اشارہ کیا۔ شبانہ کو اس کتاب کے مل جانے کی توقع نہیں تھی۔ وہ نجمی کو ساتھ لے کر شیلف کی طرف آ گئی۔ جافری میں ابر آلود دن کی پھیکی پھیکی روشنی آ رہی تھی۔ اس روشنی میں انہیں میز پر کہنیاں رکھے گردن تک لمبے بالوں والا ایک چوڑے شانوں والا آدمی مطالعے میں محو نظر آیا۔ شبانہ شیلف میں کتاب تلاش کرنے لگی۔ نجمی نے آہستہ سے کہا۔

"آخر تم اس کتاب کے پیچھے کیوں پڑی ہو۔ یہاں اور کتنی کتابیں ہیں۔ کوئی سی لے لو۔"

شبانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آخر تم ندیم کے پیچھے کیوں پڑی ہو۔ شہر میں کئی نوجوان ہیں۔ . . ."

نجمی نے شبانہ کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ "بس بس۔ میں آگے نہیں سن سکتی۔"

نجمی کی شوخ آواز کچھ زیادہ ہی بلند ہو گئی تھی۔ لائبریریوں میں ایسی آواز کو شور کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ جافری میں جو شخص کتاب کے مطالعے میں مصروف تھا اس نے گردن پھیر کر شبانہ اور نجمی کی طرف دیکھا۔ نجمی نے ہنستے ہوئے چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ شبانہ نے معذرت خواہانہ انداز میں آہستہ سے کہا۔ "سوری۔"

اس آدمی نے مسکرا کر اپنے سر کو ایسے ہلایا جیسے کہہ رہا ہو۔ کوئی بات نہیں میڈم اس کی سیاہ چمکیلی آنکھوں میں شبانہ کو ایک اتھاہ گہرائی محسوس ہوئی اس کی عمر چالیس کے قریب ہو گی کنپٹیوں پر بالوں میں سفیدی جھلک رہی تھی۔ کھلتا ہوا سرخی مائل رنگ ناک ستواں آگے سے ذرا سی اوپر اٹھی ہوئی۔ . . . بالکل یونانی ناک. . . .

وہ دوبارہ مطالعے میں اور شبانہ شیلف میں سے کتاب تلاش کرنے میں مصروف ہو گئی کتاب اسے کہیں بھی نظر نہ آئی۔ نجمی نے شبانہ کو بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "اس لڑکے کو یہاں لاتے ہیں۔ ایسے تمہیں کتاب نہیں ملے گی۔"

نجمی کی عادت تھی کہ وہ بازو سے پکڑ کر کھینچنے لگتی۔ شبانہ کو یہ بات شائستگی کے

خلاف لگتی مگر اس نے کبھی تجمی کو نہ ٹوکا تھا۔۔۔۔ وہ کاؤنٹر پر آگئی اور کاؤنٹر کلرک سے کہا کہ شیلف میں کتاب نہیں ہے۔ وہ کاؤنٹر کا تختہ ہٹا کر باہر نکل آیا۔ آئیے میں آپ کو نکال دیتا ہوں۔ وہ واپس شیلف کے قریب آئی تو شبانہ نے دیکھا کہ وہ یونانی ناک اور مقناطیسی سیاہ آنکھوں والا آدمی وہاں نہیں تھا۔ جس میز پر وہ تھوڑی دیر پہلے بیٹھا تھا وہاں گلاب کا ایک مرجھایا ہوا پھول پڑا تھا۔ شبانہ کو یہ بات بڑی عجیب سی لگی۔ اس نے لائبریریوں میں کتابیں اور کتابیں پڑھنے والے تو بہت دیکھے تھے مگر میز پر پڑا مرجھایا ہوا پھول وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ مگر اس نے کوئی خیال نہ کیا اور شیلف کی طرف دیکھنے لگی۔ لڑکے نے فوراً ایک قطار میں سے کتاب نکال کر شبانہ کو دے دی۔

"یہ ہے ولیم تھارو کی کتاب والڈن۔"

شبانہ نے کتاب کو کھول کر ایک نظر دیکھا اور کاؤنٹر پر آکر اپنا کارڈ نکال کر رکھ دیا۔ ضروری اندراج کے بعد کتاب شبانہ کے حوالے کر دی گئی۔ تجمی نے چلتے ہوئے کہا "یہ اتنی باریک چھپائی والی کتابیں نہ پڑھا کرو شبو۔ تمہیں موٹے شیشوں والی عینک لگ جائے گی۔"

شبانہ کتاب کو کھولے اس کے صفحے پر نظریں جمائے تجمی کے ساتھ آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ ایک الماری کے قریب سے گزرتے ہوئے اسے وہی خاص قسم کی تمباکو اور کافی کی ملی جلی مہک محسوس ہوئی جو اس نے تھوڑی دیر پہلے جافری میں محسوس کی تھی جب وہ یونانی ناک والا آدمی کتاب کے مطالعے میں محو تھا۔ شبانہ کی نظریں اپنے آپ کتاب پر سے ہٹ گئیں۔

جب وہ ایک الماری کے قریب سے گزری تو اچانک اس کی نظر بائیں جانب اٹھ گئی۔ وہی باوقار سنجیدہ چہرے والا آدمی ایک شیلف کے سامنے کتاب کھولے اس کے ورق الٹ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ یہ شخص بھی شبانہ کو دیکھتا۔ شبانہ آگے چل دی لائبریری کے سامنے لان میں یوکلپٹس کے درختوں کی لمبی لمبی نازک ٹہنیاں جنوری کی

سرد ہوا میں آہستہ آہستہ لہرا رہی تھیں۔

○

شبانہ اور تجمی کالج واپس آگئیں۔

شبانہ نے آخری پیریڈ اٹینڈ کیا اور لائبریری سے نکلوائی ہوئی کتاب اور سیلون کی چائے ساتھ لئے گھر آگئی۔ آسمان پر سارا دن بادل چھائے رہے تھے رات کو پھر بارش شروع ہوگئی۔ شبانہ کو سردیوں کی بارش سے بہت محبت تھی شیشم اور سفیدے کے گرتے پتے درختوں کے بے برگ و بار ٹہنیاں۔۔۔۔ بارش میں دھلے ہوئے سفید زرد اور سرخ گلاب اور چہروں کو چھو کر گزرتی یخ بستہ ہواؤں کے جھونکے آتش دان کے پاس چائے۔۔۔۔ یہ سب جزئیات تھیں اس تصویر کی جس کے فریم کے اندر شبانہ زندگی بسر کر رہی تھی۔ رات کو ہلکا سا کھانا کھانے کے بعد شبانہ دوسری منزل پر اپنے کمرے میں آگئی۔ آتش دان میں دھیمی دھیمی آگ جل رہی تھی۔ کمرے کی فضا پرسکون، خوشگوار اور نیم گرم تھی۔ شبانہ نے الیکٹرک کیتل میں پانی گرم کیا۔ چیکوسلوکیہ کی نیلے پھولوں والی ٹی پاٹ اور پیالی کھڑکی والی گول تپائی پر رکھی۔ پھر سیلون کی چائے کا ڈبہ کھول کر خوشبو کو سونگھا۔ وہ سری لنکا کے بارش میں بھیگتے چائے کے باغات میں نکل گئی۔ اس نے چائے بنائی اور تھارو کی کتاب کھول کر پڑھنے لگی کمرے میں صرف ٹیبل لیمپ ہی روشن تھا۔ اس کتاب میں تھارو نے ایک جھیل کے کنارے اپنا چھوٹا سا کاٹیج بنایا تھا جہاں اس نے مراقبے میں چھ ماہ بسر کئے تھے۔ یہ کتاب اس طویل مراقبے کی کیفیات کے بارے میں لکھی گئی تھی۔

شبانہ چائے پیتے ہوئے اسے انہماک سے پڑھ رہی تھی۔ کمرے کی کھڑکی بند تھی۔ بالکونی والا شیشے کا دروازہ بھی بند تھا۔ آگے پردہ گرا ہوا تھا۔ کمرے میں خاموشی تھی جس میں سوائے باہر آم اور یوکلپٹس کے پرانے درختوں میں گرتی بارش کی آواز کے دوسری کوئی آواز نہیں تھی۔ شبانہ کو بارش کی آواز بھی خاموشی کا ایک حصہ محسوس

میں اندھیرا ہوگیا۔ پھر اس اندھیرے میں کمرے میں رکھی ہوئی چیزوں کے دھندلے دھندلے خاکے ابھرنے لگے۔ یہ ابرآلود رات کی اس پھیکی دھندلی مرطوب روشنی کی وجہ سے تھا جو کھڑکی اور بالکونی والے دروازے کے سفید پردوں میں سے چھن کر اندر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ روشنی نہیں تھی۔۔۔۔ اسے ہم روشنی کا سایہ کہہ سکتے ہیں ابرآلود رات کی روشنی نہیں ہوتی۔ نیند کی پریاں سنبل کے اڑتے ہوئے پور کی طرح اترنے لگیں۔ شبانہ نے آنکھیں بند کرلیں اور نیند کی پریاں اسے اپنے ساتھ لے کر بحیرہ روم کے تاریک سمندروں میں لے گئیں۔ جہاں بوکاشی کا بادبانی جہاز وقت کی نامعلوم منزلوں کی طرف رواں تھا۔ شبانہ کے پاؤں جہاز کے عرشے پر نہیں لگے ہوئے تھے۔ وہ فضا میں تیرتی ہوئی جہاز کے عرشے پر گھوم رہی تھی۔ پھر اسے ایک آواز سنائی دی۔ یہ بربط کی آواز تھی، دھیمی، پرسوز، دل کی گہرائیوں میں اتر جانے والی۔ شبانہ نے لکڑی کا زینہ دیکھا جو اس قدیم بادبانی جہاز کی نچلی منزل کو جاتا تھا۔ شبانہ زینہ اُتر کر ایک نیم روشن راہ داری میں آگئی۔ بربط کی آواز ایک بند کیبن کے اندر سے آرہی تھی۔ شبانہ جیسے فضا میں تیرتی ہوئی کیبن کے پاس آگئی۔ کیبن کا دروازہ بند تھا لیکن وہ بند دروازے میں سے ہی گزر گئی۔ چھت سے لٹکتے بلوریں فانوس کی دھیمی روشنی میں بابل کے قالینوں والا فرش، دیوار پر لگا سنہری فریم والا آئینہ اور گیارہویں صدی کے مخملیں کاؤنچ نظر آئے۔

فضا میں قدیم شاہی محلات کی خواب گاہوں ایسی خوشبو تھی۔ شبانہ نیند کے شعور سے خالی الذہن تھی۔ وہ خود کو اس ماحول کا ایک حصہ تصور کر رہی تھی۔ ایک چوڑے شانوں اور لمبے بالوں والا آدمی شہزادوں کے لباس میں ملبوس کاؤنچ پر بیٹھا بربط بجا رہا تھا۔ اس کی پشت شبانہ کی طرف تھی۔ اچانک بربط کی آواز تھم گئی۔ نغمات کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور اجنبی شہزادے نے گردن گھما کر شبانہ کی طرف دیکھا۔ ایک پل کے لئے شبانہ کا کھویا ہوا شعور واپس آگیا اس نے شہزادے کو پہچان لیا تھا۔ یہ وہی پراسرار شخص تھا جو لائبریری کی جافری میں کتاب کے مطالعے میں غرق تھا۔ بربط مرمریں گول میز

پر رکھتے ہوئے شہزادہ شبانہ کی طرف بڑھا۔ شہزادے کے ہونٹ بند تھے مگر شبانہ کو اس کی گہری آواز سنائی دی۔

"میں بوکاشی ہوں۔ پنڈورا نے مجھ سے بے وفائی کی۔ میں اس کے دوسرے روپ کی تلاش میں ہوں۔ میرے بادبانی جہاز کا سفر شاید کبھی ختم نہیں ہوگا۔ کیا تم پنڈورا کا دوسرا رُوپ ہو؟"

جہاز سمندر کی لہروں پر ڈول رہا تھا۔ محبت کا فانوس دائیں بائیں ڈول رہا تھا شہزادے نے آگے بڑھ کر شبانہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور ایک گھٹنا قالین پر ٹیک کر تعظیم کی۔ شبانہ کے ہاتھ سے شہزادے بوکاشی کا ہاتھ سنبل کی طرح پھسل گیا اور سمندر کی طوفانی لہر پوری طاقت سے جہاز سے ٹکرائی۔ جہاز کا فانوس ایک طرف کو جھک گیا اور شبانہ کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا سانس زور زور سے چل رہا تھا۔ خواب گاہ کی تاریکی میں بارش کی ہلکی آواز اسی طرح آرہی تھی۔ شبانہ ابھی تک اپنے آپ کو بوکاشی کے بادبانی جہاز میں ہی محسوس کر رہی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ وہ اپنی خواب گاہ میں واپس آگئی۔ اس نے گہرا سانس بھرا اور آنکھیں دوبارہ بند کرلیں۔

رات کو ہم کوئی بھی خواب دیکھیں اس کا اثر ہمارے ذہن پر تھوڑی دیر کے لئے ہی رہتا ہے۔ جوں جوں دن کی روشنی بڑھتی جاتی ہے خواب کی جزئیات معدوم ہوتی جاتی ہیں اور بعد میں ہمیں اس خواب کی ایک پرچھائیں سی ہی یاد رہتی ہے اور ایک خاص مدت گزر جانے کے بعد وہ بھی ہمارے ذہن سے اُتر کر لاشعور کی اتھاہ گہرائیوں میں گم ہو جاتی ہے۔ ہم نے زندگی میں اب تک کروڑوں خواب دیکھے ہوں گے لیکن اگر ہم یاد کرنا چاہیں تو ہمیں مشکل سے دو چار ہی یاد آئیں گے وہ بھی پوری تفصیل کے ساتھ نہیں بلکہ ان کا ایک سایہ سا ہمارے شعور کے پردے پر سے گزر جائے گا۔ لیکن بچپن سے اب تک دیکھے ہوئے ہمارے سارے خواب لاشعور کے اہراموں میں دفن ہیں۔ اپنی تمام جزئیات اور آوازوں اور چہروں کے ساتھ۔۔۔ مگر لاشعور پر ہمارا اختیار نہیں ہے۔ لیکن شبانہ نے رات کو جو خواب دیکھا تھا اس کی ایک ایک تفصیل، ایک ایک جزئیات ہر آواز

تصویر کے پورے رنگ اسے یاد تھے۔ جیسے اس کے شعور میں نقش ہو کر رہ گئے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ صبح و شام کا بیشتر حصہ خوابوں کی دنیا میں ہی گزارتی تھی۔ وہ خود خوابوں کی دنیا کی رہنے والی تھی۔ خوابوں کی دنیا ہی اسے حقیقت کی دنیا لگتی تھی۔

ناشتہ اس نے معمول کی طرح اپنی امیّ، ابوّ، بھائی عقیل اور بڑی بہن غزالہ کے ساتھ ایک ہی میز پر بیٹھ کر کیا۔ چھوٹا بھائی عامر اس روز بھی اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ وہ کہیں دس گیارہ بجے اٹھتا تھا۔ اور پھر تھوڑا بہت ناشتہ کر کے اپنی موٹر سائیکل لے کر کالج نکل جاتا تھا۔ ان دنوں وہ لندن جانے کی تیاریوں میں تھا جہاں وہ سول انجنیئرنگ میں داخلہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ناشتے کی میز پر شبانہ اپنی عادت کے مطابق خاموش تھی مگر آج اس کی خاموشی میں گہری محویت کا عالم تھا۔ فلائنگ ڈچ مین کے بادبانی جہاز کا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ کیا یہ سب خواب تھا؟ نہیں۔۔۔ یہ خواب نہیں تھا۔ شبانہ ناشتہ کرتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ پھر غزالہ نے اس کے آگے سے شوگر پاٹ اٹھاتے ہوئے اس سے کوئی بات کی تو وہ چونک پڑی۔۔۔۔

غزالہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کہاں کھو گئی ہو تم؟"

شبانہ ان لوگوں کی خاطر ان کی پسند کی باتیں کرنے لگی۔ روز کی طرح اس کے ابو اور بڑا بھائی عقیل ناشتے کے بعد بریف کیس اٹھا کر اپنے اپنے کاروبار کے لئے چل دیئے شبانہ نے پورچ سے ان کی گاڑی اسٹارٹ ہوتے اور پھر دور ہوتے جانے کی آواز سنی۔ والدہ نے شبانہ سے کہا کہ آج کالج سے جلدی آ جانا رنگ محل سے تمہاری پھوپھی آ رہی ہیں۔ شبانہ کو پھوپھی خالہ جی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر اپنی والدہ کا دل رکھنے کے لئے وہ ان سے بڑے اخلاق سے پیش آتی اور ان سے گھل مل کر باتیں بھی کر لیا کرتی تھی۔ اگرچہ ان سے باتیں کرتے ہوئے کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا کہ شبانہ الگ ہو کر بالکونی میں کھڑی نیچے لان کے پھولوں کو دیکھ رہی ہے۔ اور یہ کوئی اور لڑکی ہے جو اپنی پھوپھی یا خالہ سے گفتگو کر رہی ہے۔۔ شبانہ نے کہا۔

"اچھا امیّ! میں جلدی آ جاؤں گی۔"

معمول کے مطابق اس نے اپنی امی کا ماتھا چوما اور کتابیں اٹھا کر باہر چلی گئی۔ وہ گاڑی کو دھیمی رفتار سے چلا رہی تھی۔ رات کی بارش میں سبزہ دھل کر نکھر آیا تھا۔ اب بارش نہیں ہو رہی تھی اور بادل چھٹنا شروع ہو گئے تھے۔ شبانہ نے اپنے خواب کا ذکر کسی سے نہیں کیا تھا۔ وہ کرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ کالج میں وہ نجمی کے علاوہ دوسری سہیلیوں سے بھی مل کر ہنسی مذاق میں مصروف رہی مگر اس نے نجمی کو کچھ نہ بتایا۔ وہ اس خواب کی تمام خوشبوؤں تمام رنگوں، تمام سرگوشیوں کو اپنے ذہن، اپنے شعور کے نہاں خانے تک ہی محدود رکھنا چاہتی تھی۔ جیسے کوئی آدمی اگر بتیاں سلگا کر اپنے آپ کو کسی خانقاہ میں بند کر لیتا ہے۔

شبانہ کے قدم آج غیر شعوری طور پر لائبریری کی طرف اٹھ رہے تھے۔ ایک خیال اس کے ذہن میں بار بار سر اٹھا رہا تھا۔ اس خیال کو اپنے دل سے چھپانا چاہتی تھی اور یہ خیال لائبریری کی طرف جانے کا تھا۔ کالج میں دو پیریڈ خالی آئے تو اس نے غیر ارادی طور پر گاڑی نکالی اور مال روڈ پر آ گئی۔ اس کا رخ ٹولنٹن مارکیٹ کی طرف تھا۔ موسم ایسا تھا کہ کسی وقت سنہری دھوپ نکل آتی تھی اور کسی لمحے پھر بادلوں کے سائے چھا جاتے تھے۔ شبانہ نے گاڑی ٹولنٹن مارکیٹ کے باہر کھڑی کی اور لائبریری کی طرف جانے کی بجائے مارکیٹ میں داخل ہو گئی۔ غیر شعوری طور پر وہ اس خیال سے بچنا چاہتی تھی جو اب ایک خواہش کا روپ دھار چکا تھا۔ یہ خواہش اسے لائبریری کی طرف کھینچ رہی تھی۔ مگر شبانہ کی خود آرائی اور شخصی وقار اسے اپنے طور پر لائبریری میں جا کر اس پر اسرار شخص کو دوبارہ دیکھنے سے روک رہا تھا۔ ہاں۔۔۔ وہ اس چوڑے شانوں اور چمکیلی پر اسرار سیاہ آنکھوں والے اجنبی کو ایک بار پھر دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ اس کا دل اسے کشاں کشاں لائبریری کی طرف کھینچ رہا تھا اور ذہن اس کے پاؤں کو جکڑے ہوئے تھا۔ مارکیٹ میں ایک دکان پر کھڑی ہو کر اس نے یونہی نیل پالش کے شیڈ دیکھنے شروع کر دیئے۔ یہاں سے ہٹ کر وہ گروسری کی دکان پر آ گئی اور اس نے بغیر ارادے کے چائے کا ایک اور پیکٹ خرید

لیا اپنے تئیں وہ یہ تصور کر کے مارکیٹ سے باہر نکلی کہ گاڑی میں بیٹھ کر واپس کالج کی طرف چلی جائے گی اس نے پیکٹ پچھلی سیٹ پر رکھا۔ گاڑی اسٹارٹ کی اور جب اسے گھمانے لگی تو گاڑی کا رخ مارکیٹ کے عقب میں واقع لائبریری کی طرف تھا۔ یہ اس کے دل کی فتح تھی۔

شبانہ نے گاڑی لائبریری کے پورچ میں ایک طرف کھڑی کر دی۔ آج اس نے جامنی رنگ کا گرم سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے پل اوور کا رنگ سیاہ تھا۔ پرس کاندھے سے لٹکائے وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی لائبریری کی سیڑھیاں چڑھ کر ہال میں آ گئی۔ ہال کی فضا حسب معمول نیم گرم تھی۔ وہ ایک الماری کے سامنے کھڑی ہو کر یونہی کتابوں کے پشتے پڑھنے لگی۔ وہ ہال کے مغربی کونے والی جافری کی طرف جانا چاہتی تھی اور ادھر جاتے ہوئے جھجک بھی رہی تھی۔ ایک نوجوان بالکل اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا اور کتابیں دیکھنے لگا۔ اب شبانہ کے پاس کوئی اور چارہ کار نہیں تھا کہ وہاں سے ہٹ جائے۔ وہ الماریوں کے درمیان سے گزرتی باہر بڑی راہ داری میں آئی تو اس کی نگاہیں اپنے آپ مغربی کونے والی جافری کی طرف اٹھ گئیں۔ وہاں پڑی ہوئی میز خالی تھی۔ سب سے پہلے شبانہ کو سکون کا احساس ہوا کہ وہ پُراسرار اجنبی وہاں موجود نہیں تھا اور اس کے بعد اسے افسوس ہوا کہ جس کے لئے وہ لائبریری میں اپنے پندار کے صنم کدے کو ویران کر کے آئی تھی وہ اسے وہاں نہیں ملا تھا۔ شبانہ اس شیلف کے پاس آ گئی جو لکڑی کی جافری کے قریب تھا۔ اس نے کنکھیوں سے خالی میز کو دیکھا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران سی رہ گئی کہ خالی میز پر گلاب کا ایک مرجھایا ہوا سُرخ پھول پڑا تھا۔ پھر اسے وہی پائپ کے تمباکو اور کافی کی ملی جلی دھیمی دھیمی خوشبو محسوس ہوئی۔ کیا وہی پراسرار اجنبی یہ پھول رکھ گیا ہے؟ کیا وہ روز یہاں پھول رکھ جاتا ہے؟ وہ یہ پھول کس کے لئے رکھ جاتا ہے؟ شبانہ یہی سوچتی ہوئی کاؤنٹر پر آ کر رک گئی۔ کاؤنٹر کلرک شبانہ کو پہچانتا تھا۔ اس لئے کہ وہ اکثر لائبریری میں آتی جاتی تھی اور اس لائبریری کی باقاعدہ ممبر بھی تھی۔ کاؤنٹر کلرک کتابوں کے رجسٹر میں اندراج کر رہا تھا۔ اس نے شبانہ کی

طرف دیکھ کر سر کو ذرا سا جھکا کر سلام کیا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ شبانہ کاؤنٹر پر کھڑی یونہی کتابوں کے ڈھیر کو ٹٹول رہی تھی۔ ۔ ۔ وہ کاؤنٹر کلرک سے پوچھنا چاہتی تھی کہ جافری میں جو میز ہے اس پر سرخ گلاب کا پھول کون رکھ گیا ہے؟ جو یہ گلاب کا پھول رکھ گیا ہے وہ کون ہے؟ مگر حیا مانع تھی۔ کاؤنٹر کلرک نے رجسٹر بند کرتے ہوئے شبانہ کی طرف دیکھا اور بولا۔

"میڈم پوئٹری کی کچھ نئی کتابیں آئی ہیں۔ فہرست دیکھنا پسند کریں گی۔"

شبانہ کچھ دیر کے لئے رکنا چاہتی تھی تاکہ وہ یہ فیصلہ کر سکے کہ اسے گلاب کے پھول والے پُراسرار اجنبی کے بارے میں اور پراسرار اجنبی کے گلاب کے پھول کے بارے میں اس سے کچھ پوچھنا چاہیئے کہ نہیں۔ ۔ ۔ اس نے کہا۔

"دکھائیں تو۔ ۔ ۔ ماڈرن لائبریری والوں کی چھپی ہوئی ہیں کیا؟"

"جی نہیں۔ ۔ ۔ کولینز لندن نے چھاپی ہیں۔"

اور کاؤنٹر کلرک نے دراز میں سے انگریزی میں ٹائپ شدہ لسٹ شبانہ کے سامنے رکھ دی۔ روایتی کتابیں تھیں۔ شبانہ کی نظریں کاغذ پر ٹائپ کئے ہوئے حروف پر تھیں اور وہ سوچ رہی تھی کہ میز کے گلاب کے بارے میں کیا پوچھے؟ کس طرح پوچھے ۔ ۔ ۔ لسٹ کاؤنٹر کلرک کو واپس کرتے ہوئے بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا۔

"اس جافری میں۔ ۔ ۔"

کاؤنٹر کلرک نے اس کی بات پوری نہ ہونے دی اور کہا۔

"جی ہاں میڈم! ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ وہاں باہر سے سڑک کا شور سنائی دیتا ہے۔ لائبریرین صاحب نے نوٹ لکھ کر محکمے کو بھیج دیا ہے کہ وہاں شیشے کے فریم جڑوا دیئے جائیں۔"

شبانہ نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ اچھا ہوا کہ اس کاؤنٹر کلرک سے وہ بات نہیں پوچھی جو وہ پوچھنا چاہتی تھی۔ لائبریری کی عمارت سے باہر نکلی تو سورج ایک بار پھر موسم سرما کے بادلوں کی اوٹ میں چھپ گیا تھا اور درختوں اور

سڑک پر سے دھوپ غائب ہو گئی تھی، سردی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ سرد ہوا چلنے لگی تھی۔ شبانہ نے گاڑی باہر نکالی اور جب مال روڈ پر آئی تو اس کا جی کافی پینے کو چاہا۔ کافی وہ نجمی کے ساتھ ہمیشہ شیزان میں ہی بیٹھ کر پیتی تھی۔ اس نے ٹائم دیکھا۔ ابھی پیریڈ شروع ہونے میں پون گھنٹہ باقی تھا۔ گاڑی شیزان کے باہر ایک طرف پارک کر کے وہ اندر ریستوران کی نیم گرم فضا میں آ گئی۔ بہت کم لوگ میزوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کونے والی شبانہ اور نجمی کی پسندیدہ نشست آج بھی خالی تھی۔ شبانہ نے بیٹھتے ہی ویٹر کو کافی لانے کا آرڈر دیا اور پرس کھول کر چوکور آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا پھر پرس بند کر دیا اور شیشے میں سے مال روڈ پر سے گزرتے لوگوں اور گاڑیوں کو دیکھنے لگی۔ ریستوران کی فضا میں معمول کے مطابق پیٹیز اور پیسٹریوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی یوکلپٹس کی ان ٹہنیوں کی سوندھی باس بھی آ جاتی تھی جو ریستوران والے روز صبح درخت سے توڑ کر پیتل کے بڑے گلدان میں لگا دیتے تھے۔ شبانہ کو یوکلپٹس کی خوشبو بہت پسند تھی۔ نجمی کے بغیر کافی پیتے ہوئے اسے بہت سکون محسوس ہو رہا تھا۔ کافی کی تلخ ترمہک سانس کی ایک لکیر کی مانند اس کے حلق میں اتر گئی۔ اسے نہر کے کنارے اگی ہوئی گھاس کی ہری ہری پتیوں کی خوشبو یاد آ گئی۔ بچپن میں شبانہ اس نہر پر اپنی سہیلیوں کے ساتھ چھلانگیں لگایا کرتی تھی۔ یہ نہر ان کی کوٹھی "کینال لاج" کے سامنے سے گزرتی تھی۔ جنوری کے اخیر میں نہر کا پانی بند کر دیا جاتا اور وہ یہاں سے گیلی مٹی نکال کر اپنی سہیلیوں کے ساتھ کنارے پر بیٹھ کر گھروندے بناتی، خدا جانے یہ کافی کا اثر تھا کہ شبانہ کو اپنے بچپن کی یاد آنے لگی تھی، ویسے بھی اسے بچپن کی یادیں بہت عزیز تھیں مگر وہ انہیں کم ہی یاد آتی تھیں۔ جن دنوں وہ لندن میں تھی وہاں ایک نہر کی پلیا پر سے گزرتے ہوئے اسے بچپن کی یاد بہت آتی تھی۔ اس کا ذہن ایک بار پھر لائبریری کے میز پر رکھے گلاب کے باسی پھول کی طرف چلا گیا۔ یہ پھول اتنا باسی نہیں تھا۔ بس ٹہنی سے توڑنے کے کچھ دیر بعد جیسے [illegible]رخ گلاب کمھلا جاتا ہے ویسے ہی تھا وہ پھول... آپ نے دیکھا ہو گا کہ دیسی

سرخ گلاب ٹہنی سے توڑنے کے تھوڑی دیر بعد ہی اداس ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے میز پر پڑا پھول اداس تھا... افسردہ تھا... اس دن بھی جب وہ پراسرار آدمی میز پر سے اٹھ کر گیا تھا تو شبانہ کی نظر اتفاق سے خالی میز پر پڑی تو وہاں گلاب کا افسردہ پھول پڑا تھا۔ ہو سکتا ہے اس پراسرار اجنبی کو سرخ گلاب بہت پسند ہیں۔ مگر جاتے ہوئے وہ اسے لائبریری کی میز پر کیوں چھوڑ گیا تھا؟ اور آج تو وہ لائبریری میں موجود بھی نہیں تھا لیکن گلاب کا سرخ پھول میز پر رکھا تھا۔ شبانہ کو عجیب سا لگا وہ ایک اجنبی شخص کے بارے میں اتنی تفصیلات اور مین میخ کے ساتھ سوچ رہی ہے۔

بل اور ٹپ کے پیسے پلیٹ میں رکھ کر وہ اٹھی اور ریستوران سے باہر نکل آئی۔ بادل پھر گہرے ہونے لگے تھے۔ بوندا باندی نہیں شروع ہوئی تھی۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ لوگ گرم کپڑوں میں سمٹے سمٹائے فٹ پاتھ پر سے تیز تیز قدموں سے گزر رہے تھے۔ شبانہ گاڑی لے کر چیرنگ کراس سے آگے نکلی تو اس کو موسم اور ہرا بھرا سبزہ اتنا اچھا لگا کہ اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اس سڑک پر سے ہو کر اپنے کالج جائے جو لارنس باغ کے جنوبی کنارے کی طرف تھی۔ اس سڑک کی دونوں جانب سنبل اور شیشم کے اونچے اونچے گھنے چھتناروں والے درخت تھے۔ وہ ان کے نیچے سے گزری تو گاڑی کے بونٹ، اسکرین اور چھت پر سے ٹپا ٹپ کی آواز آنے لگی۔ بوندا باندی پھر شروع ہو گئی تھی۔ یہ آواز شبانہ کو اتنی اچھی لگی کہ اس نے گاڑی کی رفتار بہت آہستہ کر دی۔ اس کی جانب لارنس باغ کے سرسبز تختے تھے جو بارشوں میں دھل دھلا کر اور زیادہ ہرے بھرے ہو گئے تھے۔ انہیں دیکھ کر آنکھوں کو ٹھنڈک کا احساس ہوتا تھا۔ جو تختہ باغ کے سڑک والے کنارے پر تھا وہاں بانس کے درختوں کے جھنڈ بھی تھے۔

شبانہ کبھی کبھی بانس کے ان جھنڈوں کو دیکھنے خاص طور پر اس سڑک پر سے گزرا کرتی تھی۔ بانس استوائی درخت ہے اور موسلا دھار بارشوں والے خطوں

میں اگتا ہے مگر لارنس باغ میں یہ تنہا پردیسی درخت کئی برسوں سے نشوونما پا رہے
تھے۔ سڑک سردی اور بارش کی وجہ سے خالی خالی تھی۔ اس سڑک پر سے ایک راستہ
باغ کے اندر کو جاتا ہے۔ وہاں لوگ گاڑیاں کھڑی کر کے صبح شام سیر کرنے باغ میں
جاتے ہیں۔ شبانہ کا دل چاہا کہ وہ بانس کے درختوں کو قریب سے دیکھے۔ ان کے
سانس کی مہک محسوس کرے۔ کافی کا تلخ رومانٹک ذائقہ ابھی تک اس کے ہونٹوں
پر تھا۔ وہ گاڑی کھڑی کر کے اتری اور بانس کا جو بڑا جھاڑ سب سے قریب تھا ہلکی
بارش میں بھاگ کر اس کے سائے میں آگئی۔ اب اسے بانس کی گنجان نوکیلی شاخوں
میں بارش کی بوندوں کے گرنے کی آواز سنائی دینے لگی۔۔۔ یہاں بانس کی ہری
ہری تازہ کونپلوں کی لطیف خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ بارش کی موٹی موٹی بوندیں شبانہ
کے بالوں پر گریں تو وہ واپس اپنی گاڑی کی طرف مڑی۔۔۔ اچانک اسے تمباکو اور
کافی کی ملی جلی مہک آئی۔ اس کی نظریں اپنے آپ دائیں جانب اٹھ گئیں۔۔۔ بانس
کا جو درخت پہلے والے درخت سے چند قدم ہٹ کر تھا۔ وہاں سے وہی پراسرار
اجنبی نظر آیا۔۔۔ وہ لمبے سیاہ کوٹ میں ملبوس بنچ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھا پائپ
پی رہا تھا۔ وہ اس رخ پر بیٹھا تھا کہ شبانہ کو اس کے چہرے کا صرف ایک پہلو ہی نظر
آتا تھا۔

اس کے سر کے سیاہ بال جن میں کہیں کہیں سفید بالوں کی جھلک نمایاں تھی گیلے
گیلے تھے اور ایک لٹ آگے ماتھے پر آگئی تھی۔ وہ پائپ منہ سے لگائے ہلکے ہلکے کش
لے رہا تھا اور اس نے ایک ہاتھ میں جو اس کے گھٹنے پر تھا گلاب کا سرخ پھول تھام
رکھا تھا۔ اس نے شبانہ کو نہیں دیکھا تھا۔ شبانہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ
تیز تیز قدموں سے گیلی گھاس پر چلتی اپنی گاڑی میں آکر بیٹھ گئی۔ گاڑی کی اسکرین پر
بارش کی بوندیں بہہ رہی تھیں اس نے وائپرز چلا دیئے۔۔۔ اب وہ پراسرار اجنبی
کو بنچ پر بیٹھے دیکھ رہی تھی۔ تعجب ہے کہ وہ اسے گاڑی سے اترتے وقت نظر نہیں
آیا تھا۔ اب اس کی پشت شبانہ کی طرف تھی۔ پیچھے سے کسی کی گاڑی کے ہارن کی

ہلکی سی آواز آئی۔ شبانہ نے پیچھے دیکھا۔۔۔ ایک ادھیڑ عمر آدمی کار میں بیٹھا اسے مسکراتے
ہوئے اشارے سے کار ذرا دوسری طرف کرنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ شبانہ نے گاڑی
اسٹارٹ کی اور اسے بیک کر کے اس کا رخ سڑک کی طرف پھیر دیا۔ اب وہ سڑک
پر آگئی تھی اور کار کو واپس گھما کر دوبارہ باغ میں جانا مناسب نہیں تھا۔ وہ سڑک پر
آگے چل پڑی۔ چوک ابھی دور تھا کہ شبانہ نے ایک دم کار کو روکا۔۔۔ گیئر بدل کر اسے
واپس موڑا اور پیچھے کی طرف آگئی۔ کار کی رفتار دھیمی تھی۔ اس نے گاڑی لارنس باغ
والی سڑک پر اسی جگہ لا کر ایک دم سے کھڑی کر دی جہاں اس نے ابھی گاڑی نکالی
تھی۔ اس کی نظریں بے اختیار بانس کے درخت کی طرف اٹھ گئیں۔ بنچ خالی تھا۔
وہ اجنبی وہاں نہیں تھا۔ شبانہ نے کھڑکی کا شیشہ اتار دیا۔ ٹھنڈی یخ ہوا کا جھونکا
اندر آگیا۔ اس نے سر باہر نکال کر سامنے والے پلاٹ میں چاروں طرف دیکھا۔۔
وہ پراسرار اجنبی کہیں بھی نہیں تھا۔

ایک لمحے کے لئے اس کے ہونٹ سمٹ گئے۔ پھر اس نے کار کا شیشہ چڑھا لیا
دروازہ کھول کر باہر نکلی دروازے کو لاک کیا اور ہلکی بارش میں گھاس پر سے گزرتی
خالی بنچ کی طرف بڑھی۔ جس بات کا اسے خیال لگا تھا وہی ہوئی خالی بنچ پر سرخ گلاب
کا ایک پھول پڑا بارش کی بوندا باندی میں بھیگ رہا تھا۔ شبانہ نے پھول کو اٹھا لیا
پھول تھوڑا تھوڑا مرجھایا ہوا تھا اس کی مخملیں پنکھڑیاں سمٹی ہوئی تھیں۔ شبانہ لمبے
لمبے ڈگ بھرتی گاڑی میں آکر بیٹھ گئی۔ کار کو اسٹارٹ کیا اور باہر سڑک پر آگئی۔
اس نے گلاب کے پھول کو سونگھا۔ اس میں سے گلاب کی گہری مہک آئی گلاب کا
پھول شبانہ نے ڈیش بورڈ کے اوپر والی خالی جگہ پر رکھ دیا اور اپنے کالج کی
طرف روانہ ہو گئی۔

کالج کے گیراج میں گاڑی کھڑی کرنے کے بعد اس نے گلاب کے پھول کو اپنے
سنہری کڑھائی والے چھوٹے رومال میں لپیٹ کر پرس میں رکھا اور کلاس روم کی
طرف چلنے لگی۔ پیریڈ شروع ہو چکا تھا۔ مس ایلو الیکچر دے رہی تھی۔ شبانہ سر جھکائے

خاموشی سے اپنی ایک کلاس فیلو کے ساتھ جا کر بیٹھ گئی اور کاپی کھول کر لیکچر غور سے سننے لگی۔ مس ایلوا شبانہ کو کلاس روم میں داخل ہوتے دیکھ کر ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گئی تھی۔ جب شبانہ بیٹھ گئی تو اس نے اپنے لیکچر کا سلسلہ پھر سے شروع کر دیا۔ شبانہ مس ایلوا کے ہلتے ہوئے ہونٹ دیکھ رہی تھی۔ اس کی آواز سن رہی تھی مگر وہ کیا کہہ رہی ہے شبانہ کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ گلاب کے سرخ پھول اور پراسرار اجنبی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ کافی دیر تک وہ ان ہی خیالوں میں الجھی رہی۔ پھر اس نے جلدی سے ان تصورات کو جھنجوڑ کر اپنے ذہن کی اسکرین سے الگ کیا اور لیکچر سننے لگی۔

پیریڈ کے بعد نجمی نے اسے گھیر لیا۔ "تم کہاں چلی گئی تھیں اکیلی؟ مجھے ساتھ کیوں نہیں لے کر گئی۔ میں نے تمہیں گاڑی میں گیٹ سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ ضرور تم شیزان کافی پینے گئی ہوں گی۔" اس نے شبانہ کو زچ کر دیا۔ اب وہ اسے مجبور کرنے لگی کہ موسم اچھا ہے چل کر ہم سب کو شیزان میں کافی پلاؤ۔ شبانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہاری کافی مجھ پر ادھار رہی۔ کل کافی کے ساتھ لیمن ٹارٹ اور ریفرز بھی کھلاؤں گی۔"

"کیوں آج کیا بات ہے؟ کیا کسی کو ڈیٹ دے رکھی ہے؟" نجمی نے شوخی سے پوچھا۔ شبانہ نے ہنس کر کہا۔

"بھئی ڈیٹ تو تمہیں ملتی ہے۔ ہم اس نعمت سے محروم ہیں۔ بات یہ ہے کہ امی نے کہا تھا جلدی آ جانا رنگ محل سے پھوپھی آ رہی ہیں۔"

نجمی شرارت سے بولی۔

"ضرور تمہارے رشتے کی بات ہو گی۔ میں جانتی ہوں تمہارا پھوپھی زاد بھی تو کیلیفورنیا سے واپس آیا ہوا ہے۔"

شبانہ مسکرانے لگی۔

"نجمی، تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں نے شادی بیاہ کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔"

نجمی بولی۔ "اری تم نہیں سوچتیں مگر تمہارے ڈیڈی ممی تو سوچتے ہیں۔"

شبانہ نے نجمی کے کان کو ذرا سا کھینچا اور سرزنش کے انداز میں بولی۔

"پہلے تم تو اپنی شادی رچاؤ۔ تم تو دولہا بھی پسند کر چکی ہو۔"

نجمی نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ "شبو! مجھے تو ندیم سے شادی ہوتے نظر نہیں آتی۔ خدا کی قسم اگر وہاں میری شادی نہ ہوئی تو نیند کی گولیاں کھا کر مر جاؤں گی۔"

"کیوں؟ کیا ندیم نے انکار کر دیا ہے؟" شبانہ نے اسے چھیڑتے ہوئے پوچھا

نجمی نے کہا۔

"ارے اس کی اماں نہیں مانتی۔ کہتی ہے تمہارا بیاہ اپنے بھائی کی بیٹی سے کروں گی۔ اس کے بھائی نے اپنی بیٹی کے لئے ایک کینال کا پلاٹ اور کار خرید کر ابھی سے رکھ لی ہوئی ہے۔ بھلا کار کا ماڈل نہیں بدل جائے گا۔ جب تک۔"

شبانہ نے کہا۔ "اری تجھے ماڈل کی فکر لگی ہے اور اگر ندیم کی شادی وہیں ہو گئی تو کیا کرو گی؟" "خودکشی"۔ نجمی نے ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔ "اگر خودکشی نہ کر سکی تو تمہیں کہوں گی کہ مجھے دریائے راوی میں دھکا دے دے۔"

"تاکہ بعد میں پولیس مجھے پکڑ کر جیل میں بند کر دے۔" شبانہ نے نجمی کے بالوں کی لٹ کھینچتے ہوئے کہا۔ نجمی چیخ کر بولی۔

"خدا کے لئے میرے بال نہ کھینچو شبو۔ یہ پہلے ہی بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ کل سے میں آملے کے پانی میں بالوں کو دھویا کروں گی۔"

دوپہر کے کھانے پر شبانہ گھر پہنچ گئی۔ اس کی رنگ محل والی پھوپھی کے ساتھ اس کی بڑی بیٹی۔ اس کے بچے اور پھوپھی زاد ظفر بھی آیا ہوا تھا۔ شبانہ اسے بچپن ہی سے پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ اس سے عمر میں چار ایک سال بڑا تھا اور رنگ محل والے بڑے مکان میں جب وہ بچپن میں کھیلا کرتے تھے تو ظفر خواہ مخواہ اس کے بال کھینچا کرتا اور یونہی سب لڑکیوں اور لڑکوں پر اپنا جھوٹا رعب جمایا کرتا تھا۔ جب وہ بڑا ہو گیا تب بھی اس کی اوچھی عادتوں نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔

بی اے کرنے کے بعد ہی وہ کسی ترکیب سے ویزا لگوا کر امریکہ جا پہنچا تھا۔ جہاں وہ دو تین سال تک غائب رہا پھر جب واپس آیا تو بڑا بنا ٹھنا تھا۔ سب کے لئے تحفے لایا معلوم ہوا کہ کیلیفورنیا میں اس کے اپنے دو پٹرول پمپ ہیں اور بڑی ٹھاٹھ سے زندگی بسر کر رہا ہے۔ پھر اس نے لاہور میں بھی ایک مشہور کمپنی کے دو حصے خرید لئے۔ خالص کاروباری ذہنیت رکھتا تھا۔ ادب شعر اور نازک جذبات سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ گھسے پٹے لطیفے سنا کر منہ پھاڑ کر قہقہے لگاتا اور دوسروں کو بھی قہقہے لگانے پر مجبور کرتا۔

شبانہ کو معلوم تھا کہ وہ کیلیفورنیا سے کراچی پہنچ گیا ہے اور رات کو لاہور پہنچ رہا ہے۔ اس کے کان میں یہ بھنک پڑ گئی ہوئی تھی کہ ابو اور امی اس کی شادی ظفر سے کرنا چاہتے ہیں۔ شبانہ ابھی اس سلسلے میں خاموش تھی۔ اپنی بڑی بہن غزالہ سے بھی اس نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ غزالہ اس سے عمر میں کافی بڑی تھی مگر اسے کوئی ایسا مرض لاحق ہو گیا تھا کہ اس کی شادی نہیں ہو سکتی تھی۔ ہفتے میں ایک دو بار اس پر بے ہوشی کے دورے پڑ جاتے تھے۔ مدّت سے اس کا علاج ہو رہا تھا مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ قدرتی طور پر اس کے امیّ ابوّ اب شبانہ کی بات پکی کرنا چاہتے تھے۔ مگر شبانہ دل میں فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ ظفر سے کبھی شادی نہیں کرے گی خواہ اس کے لئے اسے بغاوت ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ کھانے کی میز پر سبھی موجود تھے۔ پھوپھی نے شبانہ کو ساتھ لگا کر پیار کیا۔

ظفر ایک سال کے وقفے کے بعد کیلیفورنیا سے لاہور آیا تھا۔ اس نے بڑے اوچھے انداز میں منہ پھاڑ کر سب کے سامنے کہا۔ "شبو! تو پہلے سے بہت خوبصورت ہو گئی ہے۔ ونڈرفل!"

شبانہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ اس کے امیّ ڈیڈی کو بھی یہ بات اچھی نہ لگی تھی۔ غزالہ اور عقیل نے بات کا رخ دوسری طرف پھیر دیا اور امریکہ کی باتیں شروع ہو گئیں۔ کھانے کے بعد میوزک شروع ہو گیا۔ شبانہ کا چھوٹا بھائی عامر

ظفر سے امریکہ کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔ پھوپھی شبانہ کی امیّ کے پاس بڑے تخت پر بیٹھ کر راز و نیاز میں مصروف ہو گئیں۔ شبانہ سمجھ گئی کہ وہ ظفر سے اس کے رشتے کی تفصیلات طے کر رہی ہوں گی۔ غزالہ برتن وغیرہ اٹھوانے لگی۔ عقیل اٹھ کر اپنے کمرے میں اور ابو اپنے کمرے میں دوپہر کو ذرا آرام کرنے کے لئے چلے گئے۔ شبانہ بھی اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ وہ پلنگ پر کمبل گھٹنوں تک ڈال کر بیٹھ گئی اور "والڈن" کتاب پڑھنے لگی۔

شبانہ ایک بار پھر وہ حصّہ پڑھنا چاہتی تھی جہاں تھارو نے فلائنگ ڈچ مین کا شتی کا ذکر کیا ہے۔ شبانہ کو اپنے پرس میں رکھے ہوئے پھول کا خیال آ گیا جو اس نے لارنس باغ میں بارش میں بھیگتے بنچ پر سے اٹھایا تھا اور جیسے وہ پراسرار شخص وہاں چھوڑ گیا تھا۔ اس نے اٹھ کر سنگار میز پر سے پرس اٹھا کر کھولا اور سفید رومال میں سے گلاب کا پھول نکال کر سونگھا۔ پھر اسے اپنی نازک انگلیوں میں دبائے پلنگ پر آ کر بیٹھ گئی۔ کتاب کو کھولا پھول کو دوسری بار سونگھا اور تپائی پر رکھ دیا۔ وہ کتاب پڑھنے میں محو تھی کہ پہلے دروازے پر دستک ہوئی پھر آواز آئی میں اندر آ سکتا ہوں اور ساتھ ہی ظفر چمڑے کی بے ڈھنگی امریکی جیکٹ میں اندر آ گیا۔ اندر آتے ہی اس نے لمبا سانس لیا اور بولا۔

"واہ! تمہارا کمرہ تو امریکن پرفیوم سے مہک رہا ہے۔ مگر مجھے یہ خوشبوئیں ذرا پسند نہیں۔ ویسے میں تمہارے لئے ایک تحفہ لایا ہوں شبو۔"

شبانہ نے کتاب بند کر دی۔ ظفر اس کے پلنگ پر آ کر بیٹھ گیا۔ شبانہ سمٹ گئی اسے ظفر کی یہ حرکت بھی غیر شائستہ لگی۔ جیب سے ایک پیکٹ نکال کر کھولا اور اس میں سے سونے کی ایک ننھے سے ہیرے والی انگوٹھی نکال کر کہا۔

"اصلی ہیرے کی انگوٹھی ہے شبو۔ ویسے تم اسے منگنی کی انگوٹھی بھی سمجھ سکتی ہو۔"

اور ساتھ ہی بے ہنگم قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ شبانہ نے اسے تیز نظروں سے

گھور کر دیکھا اور کہا۔ "اگر یہ منگنی کی انگوٹھی سمجھ کر مجھے دے رہے ہو تو اسے اپنے پاس ہی رکھو۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

ظفر نے منہ پھاڑ کر ایک اور قہقہہ لگایا اور بولا۔

"چلو یہ انگوٹھی تمہیں میری امی خود پہنا دیں گی۔ اس وقت تم یہ تحفہ قبول کرو میری طرف سے۔" اس نے جیکٹ کی جیب سے پارکر کا ایک بال پوائنٹ اسے پیش کیا۔ شبانہ نے بے دلی سے کہا۔ "یہاں رکھ دو۔" ظفر نے بال پوائنٹ کی ڈبی تپائی پر رکھ دی۔ وہاں گلاب کے پھول کو اٹھا کر سونگھا اور چھینک مار کر بولا۔

"یہاں آ کر جب بھی کوئی پھول سونگھتا ہوں چھینکیں شروع ہو جاتی ہیں۔ بال پوائنٹ تمہیں پسند ہے نا شبو؟"

شبانہ نے کندھے ذرا سے سکیڑ کر دھیمی آواز میں کہا۔

"ہوں، شکریہ۔"

وہ گلاب کے اس پھول کو دیکھ رہی تھی۔ جسے ظفر باتیں کرتے ہوئے اپنے ہاتھ میں مروڑ رہا تھا۔ شبانہ نے عاجزی سے کہا "پلیز ظفر یہ پھول تپائی پر رکھ دو۔" ظفر نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "کیا یہ کسی کی نشانی ہے؟ آئی ایم سوری۔ بھئی امریکہ میں ہم اس قسم کی باتیں کر لیا کرتے ہیں۔" اور اس نے پھول کو تپائی پر اچھال دیا۔ شبانہ نے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "سوری ظفر۔ میرے سر میں سخت درد ہو رہا ہے۔ میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔" ظفر اٹھ کھڑا ہوا۔

"نو پرابلم، شام کو آؤں گا۔ کسی ریستوران میں چل کر جوس پئیں گے۔" اور منہ پھاڑ کر ہنستا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ شبانہ نے تپائی پر اوندھے پڑے گلاب کے پھول کو جلدی سے اٹھا کر سیدھا کر دیا۔

.. ..

ظفر کے جانے کے بعد شبانہ نے اطمینان کا سانس لیا اس نے تپائی پر پڑے پھول کو دیکھا اسے محسوس ہوا جیسے گلاب کا پھول بھی اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا ظفر امریکہ سے اس کے لئے منگنی کی انگوٹھی لایا تھا اور اس کے گھر والے ظفر سے اس کی منگنی کر دینے کا منصوبہ بنائے ہوئے تھے یہ بات شبانہ کے لئے پریشان کن تھی کیونکہ وہ ظفر سے شادی کر کے خود کو اوندھے کنوئیں میں نہیں گرا سکتی تھی اس شادی کی بات ایک عرصے سے چل رہی تھی مگر ابھی تک شبانہ کی امی ابو یا بڑی بہن غزالہ نے اس کی مرضی دریافت نہیں کی تھی۔

شبانہ کا خاندان اگرچہ جدی پشتی رئیس اور کسی حد تک ماڈرن تھا مگر شادی بیاہ کے معاملوں میں وہ ابھی تک قدیم روایات میں جکڑا ہوا تھا۔ لڑکی خواہ کتنی پڑھی لکھی کیوں نہ ہو ماں باپ شادی کے معاملے میں اس سے مشورہ کرنا ضروری نہیں سمجھتے تھے منگنی کی انگوٹھی نے شبانہ کو خبردار کر دیا تھا اس سے پہلے کہ شبانہ کی امی یا غزالہ اس سے کوئی بات کرتیں شبانہ نے شام کی چائے کے بعد خود ہی غزالہ سے بات چھیڑ دی وہ اپنی بہن غزالہ کو اپنے کمرے میں لے گئی اور اسے صاف لفظوں میں بتا دیا کہ وہ ظفر سے کسی حالت میں بھی شادی کرنے پر تیار نہیں ہے۔

غزالہ ایک دانشمند اور دور اندیش عورت تھی ویسے بھی وہ شبانہ سے ۵ بڑی تھی اور اسے اپنی چھوٹی بہن سے پیار بھی تھا۔ پہلے تو اس نے یہ سُن کر شبانہ

کو راضی کرنے کی کوشش کی کہ شادی کرنے کے بعد سب ٹھیک ہو جاتا ہے اور پسند
کی شادی میں بھی ہمیشہ خوش رہنے کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ لیکن شبانہ نے
جب یہ کہہ دیا کہ وہ کسی سے بھی شادی نہیں کرنا چاہتی تو غزالہ نے اپنی بہن کے سر
پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"شبو! شادی ہر عورت کی منزل ہے ہماری سوسائٹی اس قسم کی ہے کہ یہاں
کوئی عورت شادی کے بغیر پورے تحفظ سے زندہ نہیں رہ سکتی۔"

شبانہ اپنی بڑی بہن کے سامنے پلنگ پر پاؤں لٹکائے خاموش بیٹھی تھی غزالہ
کا وہ بے حد احترام کرتی تھی وہ یہ بھی سمجھتی تھی کہ اس گھر میں غزالہ ہی ایک ایسی ہستی
ہے جو اس کے دکھ درد کو پہچانتی ہے اور وقت پڑنے پر اسے صحیح مشورہ دے سکتی
ہے اس نے غزالہ کی طرف دیکھا اور بولی۔

"آپی! جب مناسب وقت آئے گا تو ہو سکتا ہے۔ میں شادی بھی کر لوں مگر ابھی
میں تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہوں میں انگریزی میں ایم اے کر کے ڈاکٹریٹ کرنا چاہتی
ہوں یہ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے جسے میں ادھورا نہیں چھوڑ سکتی
آپ امی ابو کو سمجھائیں کہ ابھی میری شادی کی بات کہیں نہ کریں۔" غزالہ کے چہرے
پر گہری سنجیدگی تھی۔

"لیکن امی تو تمہاری پھوپھی کو زبان دے چکی ہیں اس جمعہ کو منگنی کی تاریخ بھی
پکی ہو گئی ہے۔"

شبانہ کو غصہ آ گیا۔ "آپی میں کوئی ڈھور ڈنگر نہیں ہوں۔ پڑھی لکھی ذمہ دار
لڑکی ہوں کسی کو مجھ سے مشورہ لئے بغیر میرے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق نہیں
پہنچتا آپ امی کو کہہ دیجئے کہ میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی کہیں بھی شادی نہیں
کرنا چاہتی اگر مجھے مجبور کیا گیا تو میں کچھ کھا کے خودکشی کر لوں گی۔"

غزالہ جلدی سے اٹھ کر شبانہ کے پاس پلنگ پر آ گئی۔ اس نے چھوٹی بہن کو
اپنے ساتھ لگا لیا اور سر پر پیار سے ہاتھ پھیر کر بولی۔

"خبردار جو پھر کبھی ایسا خیال بھی دل میں لائیں۔ تم فکر نہ کرو میں امی ابو کو سمجھا لوں
گی۔ تمہاری مرضی کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھایا جائے گا۔"

شبانہ اپنی بہن غزالہ سے بہت پیار کرتی تھی اس نے جب یہ حوصلہ دیا تو
شبانہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ غزالہ نے شبانہ کو پیار کیا اور بولی۔

"اب تم آرام کرو۔ میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔ تمہیں جتنا پڑھنا ہے بیشک
پڑھو۔"

شبانہ کی امی اور ابو ظفر سے اس کی منگنی کا دن واقعی مقرر کر چکے تھے۔
لیکن جب غزالہ نے انتہائی دانشمندی اور پوری ذمہ داری سے انہیں ساری بات
کھول کر بیان کی تو ماں باپ سوچ میں پڑ گئے غزالہ نے کہا۔

"ابو جان! پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے آپ فی الحال اس بات
کو یہیں رہنے دیں منگنی کا کیا ہے نہ بھی ہو تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ابھی شبو کو
اپنی تعلیم مکمل کر لینے دیں جب وقت آئے گا تو میں ظفر سے شادی کرنے پر راضی
کر لوں گی۔"

دوراندیش ماں باپ چپ ہو گئے۔ غزالہ کی امی نے بڑی عقلمندی سے سمجھا
دیا کہ ابھی منگنی کی ضرورت نہیں ہے ظفر جب سال ڈیڑھ سال بعد امریکہ سے دوسری
بار واپس آئے گا تو شادی ہی کر دی جائے گی۔ ظفر کو جب پتہ چلا کہ اس کی منگنی ملتوی
ہو گئی ہے تو اسے اپنی توہین محسوس ہوئی وہ جانتا تھا کہ شبانہ اس کو پسند نہیں کرتی
اور یہ سب کچھ اسی کے ایما پر ہوا ہے اس نے کھلے لفظوں میں کہہ دیا کہ یہ اب
میرے وقار کا مسئلہ بن گیا ہے۔ شادی کروں گا تو شبانہ ہی سے کروں گا نہیں تو
اسے اغوا کر کے لے جاؤں گا ظفر کی ماں نے اسے ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا۔

"خبردار! جو پھر ایسی بات زبان پر لایا انہوں نے کب انکار کیا ہے یہی کہا
ہے کہ شبانہ کو ایم اے کر لینے دیں۔ تم دوسری بار آؤ گے تو شادی کر کے اسے
اپنے ساتھ لے جانا آخر ہم بھی تو اسی شہر لاہور میں رہ رہے ہیں اور میرے بھائی

ی بیٹی ہے کوئی غیر نہیں ہے۔"
ظفر منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا باہر نکل گیا وہ ایک نارمل قسم کا معمولی پڑھا لکھا نوجوان
تھا جس کو دولت، خوبصورت کپڑوں نئے ماڈل کی گاڑیوں اور دوستوں کی دعوتیں
کرنے اور ان کی دعوتوں میں شرکت کرنے کا شوق تھا زندگی میں اس کے کوئی بلند نظریات
یا تصورات نہیں تھے امریکہ میں اس نے بڑی جدوجہد کے بعد ایک مقام حاصل کیا
تھا اس کے پاس گرین کارڈ بھی تھا اور کیلیفورنیا میں دو پیٹرول پمپ بھی تھے۔ اپنا
ایک گارڈن ہاؤس تھا جہاں وہ عیش و عشرت سے زندگی بسر کر رہا تھا۔
شبانہ سے اسے محبت وغیرہ کچھ نہیں تھی لیکن شبانہ کی بے رخی نے اس کے
مردانہ وقار کو زبردست ٹھیس پہنچائی تھی اس نے شبانہ سے شادی کو اپنے وقار اور
عزت کا مسئلہ بنا لیا تھا اور فیصلہ کر لیا تھا کہ دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے وہ شبانہ کو ایک
بار اپنی بیوی بنا کر ہی دم لے گا چاہے اس کے بعد وہ اس سے طلاق لے کر ہی چلی
جائے شبانہ کی باتوں سے ظفر نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اسے پسند نہیں کرتی ظفر
نے اسے اپنی توہین پر محمول کیا تھا وہ خوش شکل تھا دولت مند تھا امریکی نیشنل تھا
امریکہ میں اس کا اپنا خوبصورت مکان تھا اس کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں تھی اس
کے خیال میں ہر لڑکی اس سے شادی کرنے میں فخر محسوس کرتی لیکن شبانہ اس سے
سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتی تھی وہ سمجھ گیا تھا کہ منگنی محض شبانہ کے انکار کی وجہ
سے ملتوی ہوئی ہے ظفر نے اس بارے میں شبانہ کی بہن یا امی سے بھی کوئی بات
نہ کی۔ دل میں اس نے شبانہ کو حاصل کرنے کا آہنی ارادہ کر لیا اور خاموش رہا۔
پاکستان میں اس کے ویزے کی مدت ختم ہونے والی تھی اسی دوران وہ بہت
کم "کینال لاج" شبانہ کے ہاں گیا جس روز اسے امریکہ کے لئے پرواز کرنا تھا اس
سے ایک دن پہلے شام کو وہ شبانہ کے ہاں اپنی ممانی اور ماموں یعنی شبانہ کی امی
ابو سے ملنے چلا آیا شبانہ کے ابو اور عقیل گھر پر نہیں تھے غزالہ اور شبانہ کی امی نے
ظفر کا خیر مقدم کیا۔ امی نے اسے پاس بٹھا کر پیار کیا اور کہنے لگیں۔

"بیٹا خیر سے جاؤ اور خیر خیریت سے واپس آؤ خط ضرور لکھتے رہنا۔"
غزالہ نے کہا" جاتے ہی فون کر دینا اس سے بڑی تسلی ہو جاتی ہے۔"
ظفر کی آنکھیں شبانہ کو تلاش کر رہی تھیں وہ شاید دوسری منزل میں اپنے کمرے
میں تھی۔ عامر اپنی امریکی جیکٹ کی زپ کھولتا ہوا کمرے میں داخل ہوا ظفر کو دیکھا تو
ہیلو بھائی جان کہہ کر اس سے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا امی نے کہا تمہارے بھائی
جان کل واپس امریکہ جا رہے ہیں۔"
"اوہ تو۔" عامر نے ظفر کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔
ظفر قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔"میں تو کہتا ہوں تم بھی امریکہ آجاؤ میرے پاس
وہیں انجینئرنگ کا کورس کر لو۔"
غزالہ کہنے لگی" یہ اب لندن جانے کی سوچ رہا ہے۔"
ظفر بولا" ارے لندن میں کیا رکھا ہے۔ امریکہ ٹیکنالوجی میں بہت آگے ہے
آجاؤ۔ اپنا گھر ہے میں کیلیفورنیا یونیورسٹی میں تمہیں داخلہ بھی دلوا دوں گا۔"
ظفر نے اب شبانہ کے گرد محاصرہ تنگ کرنا شروع کر دیا تھا امی نے کہا۔
"بیٹا تم وہاں جا کر پتہ کرنا۔ پھر ہم عامر کو تمہارے پاس بھیج دیں گے اس سے
اچھی بات اور کیا ہو گی۔"
ظفر بولا" ممانی جان آپ فکر نہ کریں میں جاتے ہی اس کے داخلے کا بندوبست
کر دوں گا، کیوں بھئی تم تیار ہو؟"
عامر نے خوش ہو کر کہا۔" کیوں نہیں بھائی جان کیلیفورنیا یونیورسٹی میں داخلہ مل
جائے تو اس سے اچھی بات اور کیا ہو گی۔"
ظفر نے ممانی سے پوچھا" عقیل بھائی جان اور ماموں ابھی تک نہیں آئے کیا؟"
غزالہ بولی" ابو کا فون آیا تھا کہ وہ شام کو ذرا لیٹ پہنچیں گے۔"
ممانی نے کہا" جاؤ شبانہ سے مل آؤ۔ وہ اوپر اپنے کمرے میں ہو گی۔"
غزالہ نہیں چاہتی تھی کہ ظفر اوپر شبانہ سے ملنے جائے کیونکہ شبانہ اسے پسند

نہیں کرتی تھی لیکن امی سیدھی اور پرانے زمانے کی خاتون تھیں اور پھر ظفر کے ساتھ شبانہ کی شادی کا خیال ان کے دل میں اپنی جگہ پر بدستور قائم تھا ظفر بھی چاہتا تھا کہ جاتی دفعہ وہ شبانہ کو ہیلو ہیلو کرلے چنانچہ وہ اٹھا اور سیڑھیاں چڑھ کر شبانہ کے کمرے کی طرف چل دیا۔ شبانہ کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ ظفر نے آہستہ سے دستک دی اور حسبِ عادت اونچی آواز میں بولا۔ "ہیلو شبو! میں ہوں ظفر۔"

وہ اب سوچی سمجھی حکمت عمل پر چل رہا تھا شبانہ نے بے دلی سے دروازہ کھولا اور میز کے سامنے کرسی پر جاکر بیٹھ گئی۔ وہ ٹیبل لیمپ روشن کئے کوئی کتاب پڑھ رہی تھی آتش دان میں آگ جل رہی تھی کمرے کی فضا گرم تھی چائے کی خالی پیالی شبانہ کے پاس ہی پڑی تھی۔ گلاب کا مرجھایا ہوا سرخ پھول اس نے چھوٹی نیلی پھولدار بوتل میں پانی ڈال کر سجا رکھا تھا مگر پھول مرجھا چکا تھا اور سرنگوں تھا۔ شبانہ جو کتاب پڑھ رہی تھی اس میں نشانی کا زرد کاغذ رکھ کر اس نے کتاب بند کر کے میز پر ڈال دی۔ ظفر کے آنے سے کمرے کی فضا جو چند لمحے پہلے ہلکی پھلکی اور رومانٹک تھی اب بوجھل ناقابل برداشت ہوگئی تھی۔ فضا میں شبانہ کو ایک کھچاوٹ اور تناؤ سا محسوس ہونے لگا تھا۔

ظفر کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھ گیا اور اپنے تھری پیس سوٹ کی واسکٹ میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا۔ "میں کل واپس جارہا ہوں سوچا تمہیں ملتا جاؤں کل شاید وقت نہ ملے۔"

شبانہ گہرا سانس کھینچ کر خاموش رہی وہ مرجھاتے ہوئے گلاب کے پھول کو تک رہی تھی اور سوچ رہی تھی ظفر کب کمرے سے جائے اور وہ پھر اپنی کتاب کے مطالعے میں محو ہوجائے ظفر کے جانے کا سن کر اسے بہت خوشی ہوئی تھی مگر وہ اس کا اظہار نہیں کرسکتی تھی اسے جواب میں کچھ کہنا بھی ضروری تھا اپنے کاندھے کی شال درست کرتے ہوئے ظفر کی طرف دیکھا اور بولی . . . "ویزا ختم ہوگیا کیا؟"

ظفر نے گردن ایک طرف ٹیڑھی کر کے شبانہ کو غور سے دیکھا اور بولا "ویزے

کی مدت بڑھ بھی سکتی تھی ایسی کوئی بات نہیں لیکن جب کوئی اسے پسند نہ کرے تو فائدہ کیا۔"

شبانہ نے فوراً بات کا موضوع بدل دیا۔ "ابّو اور عقیل بھائی ابھی نہیں آئے شاید ان سے بھی مل لینا تھا۔"

ظفر اب بھی شبانہ کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھا یہ نظریں شبانہ کو بری لگ رہی تھیں کہنے لگا۔ "انہیں کل مل لوں گا اس وقت تو میں صرف تم سے ملنے آیا تھا کل دوپہر کی فلائٹ ہے سوچا اس وقت تم کالج گئی ہوگی۔"

شبانہ نے کوئی جواب نہ دیا ظفر نے اپنی واسکٹ کے بٹن کھول دیئے۔

"تم نے کمرے میں زیادہ ہیٹنگ کر رکھی ہے تھرموسٹیٹ نہیں لگوایا کیا؟"

"نہیں۔" شبانہ نے بے دلی سے کہا اور کتاب کھول کر پڑھنے لگی۔ وہ پڑھ نہیں رہی تھی کتاب پر چھپی انگریزی تحریر کو صرف دیکھ رہی تھی۔

"میری وجہ سے تم بور تو نہیں ہو رہی ہو؟"

شبانہ کے منہ تک آتے آتے یہ بات رہ گئی کہ ہاں میں سخت بور ہو رہی ہوں خدا کے لئے تم میرے کمرے سے چلے جاؤ۔ مجھے تم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے مگر وہ ایسا نہ کہہ سکی بس اتنا ہی کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

ظفر واقعی شبانہ کے مزاج سے بے خبر تھا اس نے شبانہ کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی اور اگر وہ کوشش بھی کرتا تو اسے بالکل نہیں سمجھ سکتا تھا کیونکہ ظفر کے نزدیک عورت کوئی سمجھنے والی شئے نہیں تھی۔ وہ اکھڑ پنے کا مظاہرہ کر رہا تھا بولا۔

"تم جھوٹ بول رہی ہو تمہاری شکل بتا رہی ہے کہ تم کو میرا آنا اچھا نہیں لگا۔"

شبانہ کے کانوں کی لوئیں سرخ ہوگئیں وہ ظفر کو بہت کچھ کہہ دینا چاہتی تھی مگر ضبط کر گئی طویل سانس لے کر بولی۔ "تم نے کب سے چہرے پڑھنے شروع کر دیئے؟"

ظفر نے ایک بے ہنگم سا قہقہہ لگایا اور بولا "جب سے تم مجھ سے نفرت کرنے لگی ہو۔" اس کے ساتھ ہی ظفر نے مرجھائے ہوئے پھول کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ پھول تم نے بڑا اسنبھال کر رکھا ہوا ہے ضرور کسی کی نشانی ہوگی۔"

"شٹ اپ۔" شبانہ کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

ظفر کا چہرہ ایک دم سرخ ہوگیا اس کی آنکھوں سے چنگاریاں سی نکلنے لگیں۔ پھر فوراً ہی اس کا چہرہ بدل گیا اور بلند قہقہہ لگا کر بولا۔ "یہ تمہاری بچپن سے ہی عادت ہے بڑی جلدی ٹمپر لوز کر دیتی ہو۔" پھر کرسی کے بازوؤں پر زور سے ہاتھ مار کر بولا۔

"اچھا بھئی خدا حافظ! جاتی دفعہ تو مجھ سے ناراض نہ ہو۔ میں فون کروں گا۔ کیلی فورنیا سے تمہیں اوکے . . . بائی" اور ظفر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کمرے سے نکل گیا سیڑھیاں اترتے وقت اس کا چہرہ بے حد سنجیدہ تھا اور وہ واسکٹ میں دیئے ہوئے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑ رہا تھا۔

دوسرے دن ایئر پورٹ پر ظفر کو چھوڑنے شبانہ کے گھر سے شبانہ کا بڑا بھائی عقیل اور چھوٹا بھائی عامر گئے ظفر کے جانے کے بعد شبانہ نے بے حد سکون محسوس کیا۔ اس روز کالج میں بڑی چہل پہل تھی۔ دوسرے کالج کی کچھ لڑکیاں آئی ہوئی تھیں موسم بے حد خوبصورت تھا آسمان گہرا نیلا تھا سنہری نیم گرم دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ کالج کے لان کے درخت دھوپ میں چمک رہے تھے شبانہ کلاس روم سے نکل رہی تھی کہ سامنے نجمی آتی ہوئی دکھائی دی شبانہ نے کہا۔ "تمہارا کوئی پیریڈ تو نہیں نجمی؟"

نجمی نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا "پیارے! اگر کوئی پیریڈ ہوتا بھی تو تم پر قربان کر دیتی آج تم نے بڑا خوبصورت پنک کلر کا پل اوور پہن رکھا ہے۔"

شبانہ نے مسکراتے ہوئے کہا "آج بڑی موڈ میں ہو۔ لگتا ہے صبح صبح ندیم سے ملاقات ہوئی ہے۔"

نجمی نے ایک آہ بھر کر کہا کہ "اس کا نام نہ لو دل کے داغ روشن ہو جاتے ہیں تم میرے خالی پیریڈ کا پوچھ رہی تھیں مجھے کچھ کھلانے پلانے کا پروگرام ہے کیا۔"

شبانہ اس کے ساتھ برآمدے میں چلنے لگی۔ "نجمی موسم اتنا خوبصورت ہے کہ جی چاہتا ہے۔ اس وقت لارنس باغ کے اوپن ایئر کیفے میں لیموں کے درخت کے

نیچے بیٹھ کر چائے پی جائے۔"

نجمی نے شبانہ کو بازو سے پکڑ کر سیڑھیوں کی طرف کھینچتے ہوئے کہا "اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے میرا کوئی پیریڈ نہیں ہے۔"

اور وہ کھینچتی ہوئی شبانہ کو کالج کے پارکنگ گیراج کی طرف لے گئی جہاں شبانہ کی گاڑی پارک تھی دس منٹ بعد دونوں سہیلیاں لارنس باغ کے اوپن ایئر کیفے کے لان میں لیموں کے پیڑ کے نیچے نواری کرسیوں پر بیٹھی تھیں نجمی کو شبانہ نے بتا دیا تھا کہ ظفر کی طرف سے منگنی کی پیشکش رفت ہوئی تھی جسے اس نے اپنی بہن غزالہ کی مدد سے ملتوی کروا دیا ہے اب اس نے نجمی کو بتایا کہ ظفر واپس امریکہ چلا گیا ہے نجمی نے چائے بناتے ہوئے کہا۔

"شبو! ویسے تمہیں اس پروپوزل پر غور ضرور کرنا چاہیئے آخر ایک نہ ایک دن تمہاری شادی کسی نہ کسی ظفر یا عبدالقدوس سے ہو ہی جائے گی۔ اور اگر شادی ہوتی ہی ہے تو پھر ظفر سے بہتر چانس کوئی نہیں شادی کے فوراً بعد تمہیں بھی گرین کارڈ مل جائے گا۔"

شبانہ نے نجمی کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"تم کیوں نہیں کر لیتیں ظفر سے شادی؟ تمہاری بات چلاؤں؟"

نجمی نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا "میں تو ندیم کو دل دے بیٹھی ہوں مگر تمہارے ساتھ ایسی کوئی پرو پوزیشن نہیں ہے ڈیئر تمہارا دل صحیح و سالم ابھی تک تمہارے اپنے پاس ہے۔" پھر شبانہ کو گھورتے ہوئے بولی۔

"کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے اگر کسی کو دل دے بیٹھی ہو تو کم از کم مجھے ضرور بتا دو شبو!"

شبانہ نے پیالی میں چمچ ہلاتے ہوئے کہا۔

"ابھی تک میرا دل میرے اپنے ہی پاس ہے کم از کم میں نے ظفر کو نہیں دیا۔ چھوڑو ان باتوں کو دیکھو لیموں کے پتوں سے کیسی ہلکی ہلکی مہک آرہی۔" نجمی نے

زور سے سانس کھینچ کر کہا۔

"مجھے تو بالکل نہیں آ رہی ہے۔ یہ لیموں کے درخت سردیوں کی بارش اور گلاب کے پھول تمہیں لے کر بیٹھ گئے ہیں۔ زندگی ان کے ساتھ بسر نہیں کی جا سکتی۔"

شبانہ نے چائے کا ہلکا سا گھونٹ لیا اور ٹشو پیپر ہونٹوں پر لگاتے ہوئے بولی۔ "یہی میں ثابت کرنا چاہتی ہوں کہ زندگی سوائے لیموں کے درختوں، سردیوں کی بارش اور گلاب کے پھولوں کے اور کچھ نہیں ہے۔

نجمی نے قہقہہ لگایا" مائی ڈیئر تم ایسا افورڈ کر سکتی ہو تم سونے کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہوئی ہو۔"

شبانہ کو نجمی کی یہ بات بُری لگی۔ تنک کر بولی۔ "خدا نے اگر مجھے امیر ماں باپ کے گھر پیدا کیا ہے تو میں اس کا شکر کیوں نہ ادا کروں؟ اور اس کا شکر ادا کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ میں اس کے درختوں، پھولوں، دریاؤں، پہاڑوں اور خوشبوؤں سے پیار کروں اور ان کے ساتھ ہی رہتے ہوئے زندگی بسر کروں۔"

نجمی ہنستے ہوئے بولی۔ "یار تم تو ناراض ہو گئی ہو بابا جو چاہے کرو مگر میرے لئے فروٹ کیک اور منگواؤ۔"

شبانہ بھی مسکرانے لگی اس نے ویٹر کو اشارے سے بلا کر مزید فروٹ کیک لانے کا آرڈر دے دیا ان کے اوپر لیموں کے چھوٹے سے پیڑ کا سایہ تھا اس خوشبودار سائے نے آدھی میز کو ڈھانپ رکھا تھا باقی آدھی میز پر سورج کی سنہری دھوپ تھی۔ نجمی دھوپ میں بیٹھی ہوئی تھی لیموں کے پیڑ پر ابھی پھول بھی نہیں آئے تھے یہ پھول مارچ اپریل میں آتے تھے جو ابھی درخت کی ٹہنیوں اور پتوں کے اندر کہیں گردش کر رہے تھے۔ شبانہ لیموں کی چھوٹی چھوٹی سبز پتیوں سے ان پھولوں کی اٹھتی ہوئی دھیمی خوشبو محسوس کر رہی تھی یہ خوشبو اس سانس کی مانند تھی جس کی آواز سنائی نہ دیتی ہو۔ اسے یا لیموں کی ٹہنیاں محسوس کر سکتی تھیں اور یا شبانہ محسوس کر سکتی تھی۔ نجمی سے یہ لطیف ترین خوشبو کا سانس بہت دور تھا چائے پینے کے بعد دونوں سہیلیاں لارنس باغ کی خوبصورت روشوں پر چمکیلی دھوپ میں ٹہلنے لگیں قطعوں میں ڈیلیا، گلاب اور بینز بر کے پھول کھل رہے تھے باتیں کرتے ٹہلتے ٹہلتے وہ سنبل کے گنجان درختوں والی پرانی اور خاموش سڑک پر سے ہوتی ہوئی اس پلاٹ کے قریب آ گئیں جہاں بانس کے جھنڈ سے تھے اچانک شبانہ کی نگاہ بانس کے جھنڈ کے پاس اس بنچ کی طرف اٹھ گئی جہاں کچھ روز پہلے اس نے پراسرار اجنبی کو ہلکی بارش میں بیٹھے دیکھا تھا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد وہاں گلاب کا سرخ پھول رکھا ہوا اسے ملا تھا شبانہ کا چہرہ اداس ہو گیا وہ کرکٹ گراؤنڈ کے کنارے بنے ہوئے کاٹیج کو دیکھنے لگی اس کے دل میں ایک خواہش کروٹیں لینے لگی اس نے نجمی سے کہا۔

مجھے لائبریری سے ایک کتاب نکلوانی ہے تم میرے ساتھ چلو گی یا پہلے تمہیں کالج چھوڑ دوں؟"

نجمی نے شرارت سے کہا" اگر تم لائبریری میں اکیلی جانا چاہتی ہو تو مجھے بے شک کالج بھی نہ چھوڑو میں بس میں بیٹھ کر چلی جاؤں گی۔"

شبانہ مسکرا دی" تم بس یہی باتیں سوچتی رہتی ہو۔"

لیکن دل میں شبانہ نے نجمی کے قیافے کی داد دی اس نے شبانہ کے دل کی کیفیت کو پہچان لیا تھا شبانہ واقعی اس وقت پراسرار اجنبی کا خیال دل میں لے کر لائبریری جا رہی تھی۔ نجمی اس کے ساتھ ہی گئی شبانہ نے اپنے کارڈ پر یونہی دستکووسکی کی ایک کتاب نکلوا لی۔ لائبریری کے ہال میں داخل ہوتے ہی اس کی نگاہیں بے اختیار کونے والی جافری کی طرف اٹھ گئیں تھیں جہاں میز خالی تھی کتاب دیکھنے کے بہانے وہ جافری کے قریب آ گئی میز پر گلاب کا سرخ پھول نہیں تھا تمباکو اور کافی کی خوشبو بھی لائبریری کی فضا میں موجود نہیں تھی۔ شبانہ کا دل جانے کیوں اداس اور بوجھل سا ہو گیا کہیں وہ اجنبی اس شہر سے چلا تو نہیں گیا؟ لیکن مجھے اس سے

گیا۔ شبانہ نے خود ہی اپنے دل کی جیسے سرزنش کی اور نجمی کے ساتھ لائبریری سے نکل کر گاڑی میں بیٹھی اور اسے اسٹارٹ کر کے کالج کی طرف چل دی۔

تیسرے روز صبح ہی صبح سان فرانسسکو سے ظفر کا فون آ گیا فون غزالہ نے سنا ظفر نے امی ابو عقیل اور عامر سے بھی باتیں کیں۔ اس نے شبانہ کا بھی پوچھا شبانہ اس وقت اپنے کمرے میں جاگ رہی تھی جب عامر نے آ کر بتایا کہ ظفر بھائی جان کا امریکہ سے فون آیا ہے اور وہ تمہیں ہیلو کہہ رہے ہیں۔

شبانہ نے بالوں میں برش کرتے ہوئے کہا۔

انہیں میری طرف سے بھی ہیلو کہہ دو۔"

"او کے۔"

اور عامر تیزی سے سیڑھیاں اُترنے لگا شبانہ ناشتے کی میز پر آئی تو اس کی امی نے کہا۔ "ظفر تمہارا بار بار پوچھ رہا تھا تم بھی اس سے بات کر لیتیں۔"

شبانہ نے کوئی جواب نہ دیا غزالہ جلدی سے بولی "شبانہ شاید غسل خانے میں تھی پھر بات کر لے گی۔"

شبانہ کے والد دلیے پر دودھ ڈال رہے تھے وہ خاموش رہے امی سبز چائے پی رہی تھیں عقیل کے ایک ہاتھ میں چائے کا کپ تھا اور نظریں گھٹنوں پر رکھے اخبار پر جمی تھیں کہنے لگا۔

"سٹینڈرڈ کا اشتہار ابھی نہیں آیا۔"

والد نے چمچ سے دلیہ کھاتے ہوئے کہا۔

"اشتہار دے بھی دیں تو کوئی فائدہ نہیں۔ دس لاکھ کے ٹینڈر میں ہمیں زیادہ سے زیادہ ایک لاکھ ہی بچ سکے گا۔ پھر کمیشن کی رقم الگ جائے گی تم برج والے ٹھیکے کا جا کر پتہ کرو آج۔"

امی نے بالائی کی پیالی کی طرف اشارہ کیا اور شبانہ سے کہا۔

"بیٹی تم نے بالائی کھانی کیوں چھوڑ دی ہے یہ لپٹن چائے خشکی کرتی ہے۔"

غزالہ نے مسکرا کر کہا۔

"امی جان! آج کل بالائی کھانے کا فیشن نہیں ہے۔ آج کل تو۔۔۔" اچانک غزالہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ رگیں پھول گئیں اور وہ کرسی سے نیچے گر پڑی اسے دورہ پڑ گیا تھا۔ شبانہ کو یاد تھا۔ آج سے آٹھ نو برس پہلے جب پہلی بار غزالہ کو یہ دورہ پڑا تھا تو گھر میں کہرام مچ گیا تھا لیکن اس کے بعد ہفتے پندرہ دن کے بعد غزالہ کو یہ دورہ ضرور پڑنے لگا۔ اس کے لئے ایک خاص پرائیویٹ کلینک میں کمرہ بُک کرا دیا جاتا۔ وہاں اس کو آکسیجن اور ڈرپ لگ جاتے۔ دو خاص ڈاکٹر اس کی دیکھ بھال کرتے اور دو دن کے بعد غزالہ ٹھیک ٹھاک ہو کر "کینال" ج" میں واپس آ جاتی۔ چنانچہ اس روز بھی جب اسے دورہ پڑا تو سوائے شبانہ کی امی کے کسی اور کو زیادہ پریشانی نہ ہوئی۔ غزالہ کو اسی وقت گاڑی میں لٹا کر اپر مال روڈ والے کلینک پہنچا دیا گیا۔ شبانہ، اس کی امی عقیل اور ابو ساتھ تھے۔ غزالہ بے ہوش تھی۔ ڈاکٹروں نے فوراً آکسیجن ماسک چڑھا کر ڈرپ لگا دیئے انجکشن لگائے اور ایک گھنٹے کے اندر اندر غزالہ ہوش میں آ گئی۔ رات شبانہ غزالہ کے پاس کلینک میں ہی رہی۔ دوسرے روز نجمی خبر سنتے ہی کلینک پہنچ گئی۔ عامر شبانہ کا ناشتہ لے کر آ گیا۔ دوسرے روز شام کو غزالہ گھر آ گئی۔ اس بار ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ غزالہ کو شہر کے ہنگاموں سے دور کسی صحت افزا مقام پر بھیج دیا جائے۔ شبانہ کے ابو نے فوراً عقیل کو کوہ مری بھیج کر دو مہینوں کے لئے چشموں کی جانب ایک پوری کوٹھی کرائے پر لے لی۔ کوہ مری برف میں ڈوبا ہوا تھا۔ سیزن ختم ہو چکا تھا۔ مال پر صرف سمیز ریستوران اور رنسٹاٹ ہی کھلے تھے۔ ان میں فوجیوں کے لئے سیروز سینما میں فلم کا ایک شو ہوتا تھا۔ غزالہ کے ساتھ عامر، شبانہ، ایک نوکرانی اور ایک خانساماں بھی گئے۔ شبانہ نے خود ہی مری جانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ وہ پہاڑوں پر برف گرتی دیکھنا اور سمیز ریستوران کی کافی پینا چاہتی تھی۔ ایک گاڑی میں یہ سب لوگ بیٹھے دوسری ویگن میں روزمرہ ضروریات کا سامان اور بستر

وغیرہ ساتھ لے گئے۔ بڑا بھائی عقیل پہلے ہی سے کوہ مری میں تھا۔ برف کے سفید ٹکڑے
سفید موٹر کراس کرتے ہی شروع ہو گئے۔ برف آلودہ کوہ مری سردی میں ٹھٹھر
رہا تھا درختوں کی بے برگ و بار ٹہنیاں سفید ہو رہی تھیں۔ مکانوں کی ڈھلانی چھتوں
پر بھی برف جمی ہوئی تھی۔ سنی بینک سے لے کر مال روڈ، ڈاک خانے اور اوپر
چشموں تک برف ہٹا کر سڑک درمیان سے صاف کر دی گئی تھی۔ دونوں جانب برف
کی چار فٹ اونچی دیوار کھڑی تھی۔ چشموں والی کوٹھی میں فرنیچر اور قالین پہلے ہی
سے بچھے ہوئے تھے۔

عقیل نے دونوں بیڈ روم اور نشست گاہ کے آتش دانوں میں آگ روشن
کروا رکھی تھی۔ نشست گاہ، دونوں بیڈ روم اور ڈائننگ روم، کچن کی فضا گرم تھی۔
لاہور سے یہ لوگ منہ اندھیرے چلے تھے اور گیارہ بج رہے تھے۔ دن کے وقت
یہ کوہ مری پہنچ گئے۔ غزالہ نے ہر شئے قرینے سے سجا دی۔ غزالہ کے بیڈ روم میں
ٹیبل لیمپ، گلدان اور مخمل کا صوفہ لگوایا۔ دوپہر کا کھانا سب نے مل کر ڈائننگ
روم میں کھایا۔ غزالہ پر اب حسب سابق دورے کا اثر باقی نہ تھا۔

ڈاکٹروں نے پہلی بار اس کو صحت افزا مقام پر بھیجنے کی ہدایت کی تھی۔ غزالہ
بھی اس ہوا بدلی پر خوش تھی۔ دوپہر کو انہوں نے آرام کیا۔ شام ہونے سے پہلے
سب نے گرم کپڑے گرم مفلر اور اوور پہنے، سروں پر اونی ٹوپیاں جمائیں۔ ہاتھوں میں
چھڑیاں لیں اور چشمے والی کوٹھی کے پورچ سے نکل کر پیدل ہی مال روڈ کی طرف
چل پڑے۔

عقیل اور عامر آگے آگے تھے۔ شبانہ اور غزالہ ان کے پیچھے چل رہی تھیں۔
آسمان صاف تھا برف گرنے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ سانس کے ساتھ بھاپ سی
نکل رہی تھی۔ سردی بے پناہ تھی۔ مگر جوانی کے گرم خون نے ٹھٹھرتی برف آلود
سردی میں ان کے چہرے لال کر دیئے تھے۔ ڈاک خانے کے آگے سے ڈھلان
اترنے کے بعد یہ لوگ سمیرز ریستوران میں آکر بیٹھ گئے۔ شبانہ اس سے پہلے کئی

بار برف کے موسم میں کوہ مری آ چکی تھی۔ وہ برفباری کے زمانے میں برف گرتی دیکھنے
عقیل یا عامر کے ساتھ ایک ہفتے کے لئے مری ضرور آتی تھی سمیرز ریستوران میں آکر
وہ مال روڈ والی میز پر بیٹھ جاتی۔ شیشے والی کھڑکیاں بند ہوتیں اور وہ برف باری میں
بازار اور سامنے والے خاموش گرجا گھر کو دیکھا کرتی۔

اس روز بھی سمیرز ریستوران کی شیشے کی ساری کھڑکیاں بند تھیں۔ گاہک نہ
ہونے کے برابر تھے۔ درمیان میں بخاری سلگ رہی تھی جس کی وجہ سے ریستوران
کی فضا میں ہلکی ہلکی گرمائش رچی ہوئی تھی۔ انہوں نے مال روڈ والی کھڑکیوں کے
ساتھ والی میزوں پر نشستیں جمالیں اور ویٹر کو کافی اور لیمن ٹارٹ اور فروٹ کیک
لانے کا آرڈر دیا۔ برفباری میں شبانہ یہاں ہمیشہ کریم والی کافی پیا کرتی۔ اس روز
بھی اس نے کریم والی کافی کو ہی ترجیح دی۔ سامنے والے گرجا گھر کا چھوٹا سا صحن
خالی اور سنسان تھا۔ گرجا گھر کے صحن اور ڈھلانی چھت پر برف جمی ہوئی تھی۔
اس سے اوپر والے بنگلے کی چھت اور لان بھی برف آلود تھا۔ عامر بہت خوش
تھا اس نے اپنے لطیفوں سے غزالہ کو خوب ہنسایا۔ دو روز وہاں رہ کر عقیل بھائی
واپس لاہور چلے گئے۔

اب عامر ان کے ساتھ تھا۔ دونوں خانساماں اور ملازمہ بھی تھی۔ دن بھر
یہ لوگ بنگلے کی گرم فضا میں ٹیپ ریکارڈ اور انگریزی اور پاکستانی میوزک سنتے
دوپہر کے کھانے کے بعد آرام کرتے۔

شبانہ اپنی بڑی بہن غزالہ کے پاس بیٹھتی اس سے باتیں کرتی۔ پھر اپنے
بیڈ روم میں آتش دان کے قریب بیٹھ کر "والڈن" یا قدیم انگریزی شاعری کا مطالعہ
کرنے لگتی۔ تیسرے پہر سب لوگ سمیرز ریستوران میں کافی پینے چل دیتے۔ ایک روز
دوپہر کو ہی بادل چھا گئے اور تیسرے پہر ہلکی ہلکی برف کے سنبل ایسے گالے گرنا
شروع ہو گئے۔ شبانہ اسی رومانٹک لمحے کا انتظار کر رہی تھی۔ سرمئی رنگ کے
بادلوں کی دھند میں اس نے سفید برف کی پنکھڑیاں گرتی دیکھیں تو اس کا چہرہ سرخ

ہوگیا۔ غزالہ نے اس موسم میں سمیز ریستوران جانے سے معذوری ظاہر کی۔ عامر سو رہا تھا۔ شبانہ خود بھی برف باری میں اکیلی سیر کرنا چاہتی تھی۔ گرم پتلون کے اوپر سوئس سویٹر پہن کر پنک کلر والا گرم لمبا کوٹ پہنا۔ گلے میں انگلش مفلر اور سر پر اونی ٹوپی اوڑھی اور چھتری لے کر شبانہ اکیلی ہی گرتی برف میں سمیز ریستوران کی طرف چل پڑی۔ برف کی بے آواز، نرم اور ریشم ایسی چھوٹی چھوٹی پنکھڑیاں ہلکی ہوا میں اس کے آگے پیچھے رقص کرتی گر رہی تھیں۔ دوپہر کے تین بجے کا وقت تھا مگر سرمئی دھند اور برفباری نے منظر کو دھندلا دیا تھا۔ مال پر دونوں جانب کے بنگلے دھند اور برف میں گم ہوتے جا رہے تھے۔ سڑک سنسان تھی۔ شبانہ دل میں دعائیں مانگنے لگی کہ سمیز ریستوران کھلا ہوا ہو۔ پوسٹ آفس کا موڑ گھومتے ہی اسے دور سے سمیز ریستوران میں جلتی روشنی دکھائی دی۔ اس کا دل باغ باغ ہوگیا۔ سمیز ریستوران کھلا تھا۔ مگر وہاں سوائے دو بیروں کے کوئی گاہک نہیں تھا۔ دونوں بیرے بخاریچی کے پاس گرم ہو کر بیٹھے تھے۔ شبانہ اپنی خاص میز پر جا کر بیٹھ گئی۔ اور کریم والی کافی کا آرڈر دے دیا۔

مال روڈ کی جانب کھلنے والی کھڑکیاں بند تھیں۔ شبانہ نے شیشے میں سے نیچے دیکھا۔ مال پر برف کی ہلکی تہہ جم رہی تھی۔ سرد ہوا میں سامنے والے گرجا گھر کے صحن اور اوپر والے بنگلے کے برآمدوں اور ویران باغ میں برف کی پنکھڑیاں اڑ رہی تھیں۔ شبانہ نے دستانے اتار کر کوٹ کی جیب میں ٹھونسے اور زور زور سے ہتھیلیاں رگڑنے لگی۔

اس کی سرخ سپید نازک ہتھیلیوں کا رنگ سرخ ہوگیا۔ اس کا چہرہ سامنے پنڈی پوائنٹ کی طرف اور سمیز ریستوران کی سیڑھیاں اس کی پشت کی جانب تھیں۔ برف باری میں مال روڈ دور تک سنسان اور دھندلی دھندلی تھی۔ شبانہ نے بڑی محبت اور اہتمام سے کافی بنائی اور اس کے پہلے ہی خوشبودار گھونٹ کے ساتھ اس کے جسم میں گرم استوائی جنگلوں کی گرم مہک سرایت کر گئی۔ شبانہ نے آنکھیں بند کر لیں اب اس کی آنکھوں کے سامنے ایک بے لہر بیکراں سمندر تھا جس کی

سطح پر ایک بادبانی جہاز آہستہ آہستہ ڈول رہا تھا۔ اس کے بادبان مستولوں کے ساتھ لپٹے ہوئے تھے۔ پھر اس کے کانوں میں بربط کے نغمے کی دھیمی دھیمی آواز شہد بن کر ٹپکنے لگی۔ پھر جیسے سارا منظر ساری آوازیں ساکت ہوگئیں۔

شبانہ کو کافی کی تلخ خوشبو محسوس ہوئی۔ یہ اس کے سامنے رکھے بلوریں کافی پاٹ کی خوشبو نہیں تھی۔ اب اسے پائپ کے تمباکو کی مہک بھی محسوس ہوئی۔ شبانہ نے آنکھیں کھول دیں۔ ایک دراز قد آدمی لمبے اوورکوٹ میں ملبوس پیچھے سے آ کر اس کے قریب سے آگے گزر گیا۔ شبانہ کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے اس چوڑے شانوں والے دراز قد آدمی کو پہچان لیا تھا۔ اس کے کاندھوں پر کہیں کہیں برف کے گالے اب بھی موجود تھے۔ وہ کونے والی میز پر کھڑکی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ کوٹ کی جیبوں سے ہاتھ نکال کر اس نے سلگتا ہوا پائپ منہ سے ہٹا کر میز پر رکھ دیا۔ اس کی پشت شبانہ کی طرف تھی مگر شبانہ اسے پہچاننے میں کبھی دھوکہ نہیں کھا سکتی تھی۔ اس نے سر پر سیاہ رنگ کی اطالوی بیرٹ کیپ پہن رکھی تھی جس میں سے کنپٹیوں پر اس کے ہلکے ہلکے سفید بال صاف نظر آ رہے تھے باہر برف گر رہی تھی۔ شبانہ نے سوچا کہ اسے اٹھ کر واپس چلا جانا چاہیئے۔ پھر خیال آیا کہ اس کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اسے بیٹھ کر اطمینان سے کافی کا لطف اٹھانا چاہیئے۔ لیکن اب اس کا سارا دھیان ادھر کونے والی میز پر بیٹھے پراسرار اجنبی کی طرف تھا۔ یہ یہاں کیسے آ گیا؟ کیا اسے معلوم ہوگیا تھا کہ میں کوہ مری میں ہوں؟ مگر اسے میرا تعاقب کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا میرا خیال ہے یہ محض اتفاق ہے۔

شبانہ اپنے ہی خیالات میں الجھی اپنے لئے کافی کا دوسرا کپ بنانے لگی۔ اچانک پراسرار آدمی اپنی کرسی سے اٹھا کھڑا ہوا۔ وہ شاید واپس جا رہا تھا۔ شبانہ کا دل ایک بار پھر زور سے دھڑکا۔ اب ان دونوں کا آمنا سامنا ہونا تھا۔ شبانہ نے جان بوجھ کر اپنا چہرہ کھڑکی کے شیشے کے ساتھ لگا دیا اور یوں

ظاہر کیا جیسے وہ سڑک پر برف گرنے کے منظر سے لطف اندوز ہو رہی ہے دراز قد اجنبی اس کے قریب سے گزر گیا۔ شبانہ کو ایک بار پھر کافی اور پائپ کے تمباکو کی ملی جلی خوشبو آئی۔ شبانہ اسے دیکھنا چاہتی تھی۔ مگر کوشش کے باوجود بلکہ خواہش کے باوجود اپنا چہرہ کھڑکی سے پیچھے نہ ہٹا سکی۔ اب وہ اس لئے اپنا چہرہ پیچھے نہیں کر رہی تھی کہ اسے یقین تھا کہ وہ اجنبی ریستوران کی سیڑھی اتر کر مال پر سے ضرور گزرے گا۔

شبانہ اسے گرتی برف سے جاتا دیکھنا چاہتی تھی۔ تین چار منٹ گزر گئے مگر وہ آدمی نہ آیا۔ شاید وہ پنڈی پوائنٹ کی طرف جانے کی بجائے پوسٹ آفس کی طرف چلا گیا تھا۔ شبانہ نے گہرا سانس لیا اور پیالے میں آہستہ آہستہ چمچ ہلانے لگی۔ وہ پیچھے مڑ کر پوسٹ آفس کی طرف نگاہ ڈالنا چاہتی تھی مگر اس خیال سے ایسا نہ کر سکی کہ کسی بیرے کو شک نہ ہو جائے کہ میں ادھر اسی آدمی کو تک رہی ہوں۔ اسے کسی کے قدموں کی چاپ دوبارہ سنائی دی۔ اس نے پیچھے دیکھا۔ بیرا پلیٹ میں زرد رنگ کا ایک لفافہ رکھے اس کے پاس آ کر رک گیا اور بولا۔

"بیگم صاحب یہ آپ کے لئے ہے جی"

"کس..... کس نے دیا ہے۔" شبانہ نے کسی قدر ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

"جی۔ وہ صاحب جو ادھر بیٹھے تھے دے گئے ہیں۔"

بیرا لفافہ شبانہ کی میز پر رکھ کر واپس چلا گیا۔ شبانہ نے کپکپاتی انگلیوں سے لفافہ کھولا۔ اس کے اندر سرخ گلاب کا پھول تھا مگر یہ پھول باسی تھا۔

○
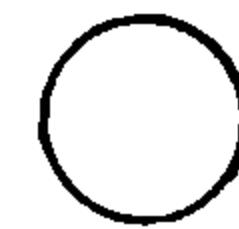
لفافے میں سوائے باسی پھول کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔

شبانہ کو یہ بڑی رومانٹک اور دلفریب بات لگی کہ کوئی اسے لفافے میں

باسی پھول ڈال کر بھیجے۔ باسی پھول اس اعتبار سے بھی اسے بہت پسند تھے کہ وہ ایک بار مرجھا کر پھر کبھی نہیں مرجھاتے۔ ان کی اداس مہک اسے ان سرسبز شگفتہ باغوں کی یاد دلاتی تھی جو سینکڑوں برس پہلے دریاؤں کے کنارے اپنی سایہ دار روشوں پر نازک اندام لڑکیوں کو ہنستے کھیلتے چلتے دیکھا کرتے تھے لیکن پھر دریا صحراؤں کے سینے میں اتر کر روپوش ہو گئے۔ روشیں ویران ہو گئیں۔ باغ ریت کی چادر میں چھپ کر معدوم ہو گئے اور ان کی دلگداز خوشبوئیں تاریخ کے بوسیدہ اوراق میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سمٹ گئیں۔ شبانہ نے لفافے میں سے باسی پھول نکالا اسے اپنے ہونٹ کے قریب لے گئی اس میں سے دھیمی معموم مہک آ رہی تھی۔ یہ ان قدیم خانقاہوں کی مہک تھی جہاں پاکباز راہبائیں خدا کی یاد میں زندگی بسر کرتی تھیں۔

شبانہ نے پھول لفافے میں ڈالا۔ اسے اپنے پرس میں رکھا اور گرتی برف میں سمبز ریستوران کی سیڑھیاں اتر کر مال روڈ پر آ گئی۔ اس اجنبی نے پہلی بار شبانہ کو گلاب کا باسی پھول بھیجا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ شبانہ کو پہلے ہی دیکھ چکا ہے جب وہ لائبریری آیا کرتی تھی اور جب اس نے بانس کے جھنڈ کے پاس اسے دیکھا تھا شبانہ انہی خیالات میں گم برف باری میں ویران سڑک کی چڑھائی چڑھ رہی تھی۔

برف زیادہ گرنے لگی تھی۔ برف کی پنکھڑیاں برف کے گالوں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ ڈاک خانے کے اوپر چڑھ کر چیڑھ کے درختوں والا موڑ گھوم کر شبانہ اپنی کوٹھی کی طرف چلی تو دوسری جانب کھلی وادی میں سے تیز یخ بستہ ہوا کا جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ برف اس کی آنکھوں میں الجھنے لگی۔ شبانہ نے اونی دستانے والا ہاتھ چہرے کے آگے کر لیا اور تازہ برف پہ پاؤں جماتی آگے بڑھتی گئی۔

غزالہ اس کے بارے میں فکر مند تھی۔ وہ عامر کو سمبز ریستوران میں بھیجنے والی تھی۔ "تمہیں برف میں باہر نہیں جانا چاہئے تھا شبو۔" غزالہ نے شبانہ کو کمرے میں آ کر کاندھوں سے برف جھاڑتے دیکھ کر کہا۔ کچن میں سے عامر نکل آیا۔

"باجی! تم واقعی ایڈونچرس لڑکی ہو میں بھی برف باری میں سیر کرنے جا رہا ہوں۔" غزالہ نے اسے منع کیا۔ شبانہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "آپی! یہی تو موسم انجوائے کرنے کا ہے۔"

شام کی چائے عامر اور شبانہ نے غزالہ کے بیڈ روم میں ہی پی۔ شبانہ اپنی خاص چائے یعنی سیلون ٹی ساتھ لے گئی تھی۔ وہ چائے پر غزالہ اور عامر سے کوہ مری کی برف پوش خوبصورتی اور فکر انگیز سکون کے بارے باتیں کرتی رہی۔ لیکن اس کے دل میں دراز قد رومانٹک اجنبی کا خیال گردش کر رہا تھا وہ کوہ مری میں کیسے آگیا؟ ضرور اسے علم ہوگا کہ شبانہ کوہ مری جا رہی ہے۔ کیا وہ صرف اس کی خاطر برف پوش کہساروں میں آیا تھا؟

رات سونے سے پہلے بھی شبانہ ایسے ہی رومانٹک خیالات میں گم رہی شیلے کی نظموں کی کتاب اس کے سامنے کھلی تھی لیکن تصور میں وہ سمیز ریستوران میں بیٹھی اس اجنبی کو دیکھ رہی تھی جو جاتی دفعہ اسے گلاب کا باسی پھول دے گیا تھا اسے وہ شام یاد آگئی جب اس نے پہلی بار اس پراسرار اجنبی کو لاہور کی لائبریری میں جافری میں بیٹھے کتاب کے مطالعے میں محو دیکھا تھا پھر جب نجمی ذرا اونچی آواز میں بولی تھی تو اجنبی نے چہرہ گھما کر انہیں دیکھا اس کی آنکھوں میں ایک عجیب کلاسیکی گہرائی اور کشش تھی۔ ایک اتھاہ خاموشی تھی۔ جو عام طور پر ایسے ٹیلوں کے آس پاس ہوتی ہے جن کے اندر ہزاروں برس کی تہذیب کے کھنڈر دفن ہوں۔ شبانہ نے کتاب بند کر کے تپائی پر رکھ دی اور مخملیں لحاف اوپر کر لیا پھر آنکھیں بند کر لیں باہر برف آلود فضا چپ چاپ تھی۔ کبھی اندھیری رات میں کوئی یخ بستہ جھونکا چیڑھ کے برف پوش درختوں کو چھو کر گزرتا تو برف کے گالوں کے گرنے کی آواز آتی اور پھر گہرا سکوت چھا جاتا اس نے سوچا کہ شیلے اور کیٹس نے شاید ایسی ہی لازوال خاموشی اور سکوت میں اپنی نظمیں تخلیق کی ہوں گی۔ اس نے لحاف سے ہاتھ نکال کر جلدی سے ٹیبل لیمپ بجھا دیا اور گرم ریشمی نیند کی آغوش میں اتر گئی۔

دوسرے دن بھی موسم ابر آلود تھا۔ وادی میں دھند چھائی تھی۔۔۔ مگر برف باری نہیں ہو رہی تھی۔ کل کی گری ہوئی برف ٹھنڈی یخ ہوا میں جمنے لگی تھی۔ عامر نے بیڈ روم پر دستک دیتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ "باجی! امی ابو کا لاہور سے فون آیا ہے۔"

شبانہ بستر سے نکل کر گاؤن جسم پر سنبھالتی غزالہ کے کمرے کی طرف بھاگی۔۔۔ فون غزالہ کے کمرے میں تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے امی سے باتیں کر رہی تھی۔

"امی! شبانہ بھی آگئی ہے اس سے بات کریں۔"

فون پر لاہور کے سب لوگوں نے باتیں کیں امی ابو اور عقیل نے بار بار تاکید کی کہ غزالہ کا بہت خیال رکھا جائے۔

عقیل نے کہا "میں نے ٹھیکیدار رحمان صاحب کو بھی فون کر دیا ہے۔ وہ اپر ٹوپا میں رہتے ہیں دن میں ایک بار آکر تم لوگوں کی خیر خیریت پوچھ جایا کریں گے" ابو نے شبانہ سے کہا کہ وہ باسمتی اور دوسری ضروری چیزیں نوکر کے ہاتھ ویگن میں بھجوا رہے ہیں۔ پھر وہ غزالہ سے باتیں کرنے لگے۔ غزالہ کی صحت کوہ مری میں آکر پہلے سے بہت اچھی ہو گئی تھی۔ اس کا زیادہ وقت بستر میں لیٹے کتابیں ناول پڑھتے گزرتا۔ شام کو تھوڑی دیر سیر کے لئے شبانہ یا عامر کے ساتھ ڈاکخانے تک جاتی مگر شبانہ صبح شام سمیز ریستوران میں جا کر کافی پیتی تھی۔ اس باسی پھول والے رومانٹک واقعے کے بعد دو دن گزر گئے تھے۔

شبانہ کو پھر وہ اجنبی دکھائی نہیں دیا تھا۔ تیسرے روز آسمان پر صبح ہی سے سیاہ گھنے بادل چھائے ہوئے تھے۔ عامر ناشتے کے بعد سیر کرنے مال روڈ کی طرف نکل گیا۔ غزالہ اپنے بستر میں لیٹی تھی۔ شبانہ بھی اس کے پاس چلی آئی۔ گزشتہ روز دوپہر کے بعد عقیل بھائی کے دوست ٹھیکیدار رحمان صاحب آکر خیر خیریت پوچھ گئے تھے۔ انہوں نے اپنی طرف سے دو چوکیدار بھی کوٹھی کے باہر بٹھا دیئے تھے۔ شبانہ نے غزالہ کے بیڈ روم کی کھڑکی کا پردہ ہٹا کر شیشے میں سے باہر دیکھا۔

سرمئی بادل دھند کی طرح بچھے ہوئے تھے۔ غزالہ نے کہا۔ "آج برف گرے گی.... خانساماں سے کہنا بازار جاکر مرغیاں وغیرہ لے آئے۔"

شبانہ باہر سرمئی دھند میں لپٹے ہوئے چیڑھ کے درختوں کو دیکھ رہی تھی جن کی ٹہنیاں ہوا میں جھولنے لگی تھیں۔ غزالہ کا کمرہ گرم تھا۔ آتشدان میں صبح کو تازہ آگ روشن کر دی گئی تھی۔ شبانہ کچھ دیر اپنی بہن غزالہ کے پاس بیٹھی لاہور کی باتیں کرتی رہی۔ اس نے گھر امی کو فون بھی کیا پھر خانساماں کو مرغیاں وغیرہ لانے بازار بھیج دیا۔ دوپہر کا کھانا شبانہ نے خانساماں کے ساتھ مل کر بنایا۔ دونوں ادھیڑ عمر خانساماں بڑے اچھے کھانے پکا لیتے تھے مگر آج شبانہ بھی ان کے ساتھ لگ گئی۔ دوپہر کے کھانے پر عامر بھی آگیا سب نے کھانا غزالہ کے بیڈ روم میں ہی کھایا۔ موسم ویسے ہی ابر آلود تھا۔ ابھی تک برف باری شروع نہیں ہوئی تھی۔ کھانے کے بعد شبانہ اپنے کمرے میں آگئی۔ تھوڑی دیر آرام کیا پھر اس کا دل باہر جانے کو بے تاب ہوگیا۔ اس نے فوراً گرم لباس پہنا، سر پر اونی ٹوپی جمائی، گلے میں گرم مفلر لپیٹا، ہاتھوں پر اونی دستانے چڑھائے، چھڑی لی اور غزالہ سے کہا کہ میں تھوڑی دیر سیر کے لئے جا رہی ہوں ابھی واپس آجاؤں گی۔ غزالہ نے اسے ہدایت کی کہ موسم ٹھیک نہیں ہے اس لئے زیادہ دور نہ جائے

شبانہ کوٹھی کے احاطے سے باہر نکلی تو سرد ہواؤں نے اس کا خیر مقدم کیا آج اس کا دل اوپر جے سینٹ اینڈ میری کانونٹ اسکول کی طرف جانے کو چاہ رہا تھا چنانچہ مال کی طرف جانے کے بجائے وہ اسی چھوٹی سی برف پوش سڑک پر ہوگئی جو اوپر چشموں کی طرف چلی گئی تھی۔ سارا علاقہ سنسان تھا، کوٹھیاں بنگلے خالی تھے۔ اونچے اونچے چیڑھ کے درختوں کے نیچے جے سینٹ اینڈ میری کانونٹ، اسکول کا چھوٹا سا لکڑی کا جنگلہ بند تھا۔ جنگلے کے اوپر ہلکی برف کی تہہ جمی تھی۔ کانونٹ اسکول موسم سرما کی چھٹیوں کی وجہ سے بند تھا۔ شبانہ سیر کرتے کرتے وہاں سے بھی آگے نکل گئی آگے ایک راستہ گورنمنٹ ہاؤس کو اور ایک راستہ

پہاڑی کے پہلو سے ہوتا ہوا اوپر چلا گیا تھا۔ شبانہ نے اس راستے پر چلنا شروع کر دیا۔ یہاں پہلی بار اس نے محسوس کیا کہ بادل گہرے ہو گئے ہیں اور ہوا میں تیزی آگئی ہے لیکن وہ چلتی گئی۔ ایسے موسم میں سیر کرنا اسے بہت پسند تھا۔ لاہور میں اسے یہ موسم نصیب نہیں تھا۔ لندن میں اپنے مختصر قیام کے دوران وہ برف باری میں ضرور سنسان سڑکوں پر لمبی لمبی سیریں کیا کرتی تھی مگر لندن کی سڑکوں کو کوہ مری کے چیڑھ کے درختوں کی سبز الائچی ایسی مہک میسر نہیں تھی۔ چیڑھ کے درخت اگرچہ برف پوش تھے مگر ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے شبانہ کو بڑی رومانٹک اور لطیف خوشبو آ رہی تھی۔ یہ خوشبو بے حد پاکیزہ اور شفاف تھی جو شبانہ کے خیالات پر جمے ہوئے شہر کے مادی زنگ کو اتار رہی تھی۔ وہ سوچنے لگی درخت انسان کے پرانے ساتھی ہیں۔

انسان نے انہی درختوں میں کبھی اپنے ارتقاء کا سفر شروع کیا تھا تب وہ درختوں کی زبان اور درخت اس کی زبان جانتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے دوست تھے، دونوں ایک دوسرے کے احساسات سے واقف تھے۔ پھر انسان درختوں سے بچھڑ گیا۔ اس نے شہر آباد کر لئے مگر وہ درختوں کو نہیں بھولا۔ اس نے اپنے پتھروں کے مکانوں کے آگے بھی درخت لگا لئے لیکن اب وہ درختوں کی زبان نہیں جانتا تھا۔ درخت بھی اسے نہیں پہچانتے تھے کیونکہ وہ بہت بدل گیا تھا۔ کبھی وہ درختوں سے ہاتھ ملا کر آگے بڑھتا تھا لیکن اب وہ ان کی طرف دیکھے بغیر اپنے پریشان خیالات کے بھنور میں الجھا آگے گزر جاتا ہے۔

شبانہ نے دستانہ اتار کر چیڑھ کے ایک درخت کے تنے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اسے تنے میں درخت کے دل کی دھڑکن محسوس ہوئی۔ چیڑھ کی بلند و بالا شاخوں نے ایک جھکولا سا کھایا۔ شاخوں پر سے برف پھسل کر شبانہ کے اوپر گری۔ ہوا تیز ہوگئی تھی۔ شبانہ نے دستانہ پہنتے ہوئے نیچے وادی کی طرف دیکھا۔ وادی بادلوں میں ڈوب گئی تھی۔ اوپر کی جانب تیز ہواؤں کے تھپیڑے آنے لگے پھر

بادلوں میں گرج کی آواز سنائی دی۔ شبانہ نے سوچا کہ شاید طوفان آرہا ہے اسے واپس چلنا چاہیئے وہ واپس مڑی ہی تھی کہ اسے سرمئی بادلوں کی تاریک سرد دھند نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ شبانہ کو کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے وہ اپنا ہاتھ چہرے پر رکھ کر وہیں کھڑی ہوگئی۔ وادی کی جانب سے تیز ہواؤں کی چیخیں سنائی دینے لگیں جو شبانہ کے جسم سے ٹکرا کر اوپر چشموں کی طرف نکل جاتیں۔ شبانہ کو اپنے چہرے پر برف کے گالوں کی نمی محسوس ہوئی۔ برف گرنے لگی تھی۔ یہ شاید برف کا طوفان تھا۔ شبانہ پہاڑی کی دیوار کے ساتھ ساتھ پیچھے کی طرف چلنے لگی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی دوسری جانب وادی کی خطرناک ڈھلان ہے۔

اس نے چہرے پر سے ہاتھ ہٹا لیا۔ سرمئی دھند میں برف کے گالے چکراتے ہوئے اڑ رہے تھے۔ ہوائیں چیخ چیخ کر چیڑھ کے درختوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ درختوں کی شاخیں جھکتی تو ان پر رکی ہوئی برف آبشار کی طرح نیچے گرنے لگتی۔ دن کی روشنی اندھیرے میں بدل گئی تھی۔ شبانہ کو لگ رہا تھا کہ وہ بادلوں میں سفر کر رہی ہے اسے ایک قدم آگے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ اندازے سے چل رہی تھی۔ تیز مرطوب ہواؤں کے جھکڑوں میں اس کے قدم اکھڑنا شروع ہوگئے۔

شبانہ کا دل خوف سے ڈوبنے لگا۔ کہیں تیز ہوائیں اسے اٹھا کر وادی کی جانب نہ پھینک دیں۔ اس نے ایک درخت کو پکڑ لیا۔ طوفانی ہوائیں اس کی آنکھوں کو کھلنے کا موقع نہیں دے رہی تھیں۔ اب شبانہ پچھتانے لگی کہ وہ ایسے موسم میں گھر سے کیوں نکل آئی اسے غزالہ کا بھی خیال آیا وہ اس طوفان کو دیکھ کر ضرور پریشان ہو رہی ہوگی۔

شبانہ ایک درخت سے دوسرے اور دوسرے درخت سے تیسرے درخت کو پکڑ پکڑ کر آگے بڑھنے لگی۔ آگے کوئی درخت نہیں تھا۔ یہاں پتھروں کے درمیان' ایک تنگ سا راستہ اندر کی طرف چلا گیا تھا۔ شبانہ کو یہ جگہ محفوظ لگی اور وہ ٹیلے کی دیوار کے باہر نکلے ہوئے پتھروں کا سہارا لیتی قدم قدم چلنے لگی۔ برفباری اور

تیز ہواؤں کا طوفان زیادہ شدت اختیار کر گیا تھا۔ تنگ پتھریلے راستے پر دو ایک قدم کے بعد کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا پھر بھی وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتی بڑھ رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اسے کوئی ایسی کھوہ یا چٹانی غار مل جائے جہاں وہ پناہ لے سکے۔ تنگ راستہ آگے جا کر بائیں طرف گھوم گیا۔ یہاں اپنے اوپر شبانہ کو جھومتے شور مچاتے چیختے درختوں کے وجود کا احساس ہوا۔ وہ ایک درخت کو پکڑ کر ہانپنے لگی۔ اس کا سانس پھول گیا تھا۔ وہ سرمئی بادلوں اور گرتی برف کی دھند میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگی۔

ہوا کے برق رفتار تھپیڑوں نے ایک پل کے لئے اس کی آنکھوں کے آگے سے دھند کو ہٹا دیا۔ شبانہ کو سامنے ایک کوٹھی کا گیٹ دکھائی دیا۔ اسے اور تو کچھ نہ سوجھا اس لمحے کو غنیمت جان کر شبانہ گیٹ کی طرف دوڑی۔ گیٹ لکڑی کا [illegible] فٹ اونچا تھا جو کھلا تھا۔ سامنے کوٹھی کی پتھر کی بوجھل سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں جس کی دونوں جانب بڑے بڑے سنگین گملے رکھے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک بار پھر یہ سارا منظر بادلوں کی سرمئی دھند میں ڈوب گیا۔

شبانہ کو پتھر کی سیڑھیاں نظر آچکی تھیں اس نے اندازے سے قدم آگے بڑھایا اور پتھر کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ بنگلہ بالکل خالی ہوگا اور وہ اس کے برآمدے میں یا اگر کوئی کمرہ کھلا ہوا تو اس کے اندر طوفان کے گزر جانے تک پناہ لے سکے گی۔ کوہ مری میں ہی خریدی ہوئی مضبوط چھڑی اس کے بہت کام آرہی تھی۔ سیڑھیاں زیادہ نہیں تھیں۔ وہ اوپر آئی تو اسے گرتی برف اور سرمئی دھند میں سامنے ایک بیضوی بنگلے کا خاکہ ابھرتا نظر آیا۔ اس کی ڈھلوانی چھت پر برف جمی تھی۔ ایک پتلا سا راستہ پتھر کے گملوں کے درمیان سے ہوتا سامنے برآمدے تک جاتا تھا۔

شبانہ دوڑ کر برآمدے میں آگئی [illegible] شدید تھی۔ شبانہ [illegible] اندر کسی خالی [illegible] وہ جانتی تھی [illegible]

کو آہستہ سے دھکا دیا اسے تعجب ہوا دروازہ اندر سے بند تھا۔ ممکن ہے چوکیدار نے دروازے اندر سے بند کر دیئے ہوں اور خود کسی کھڑکی یا باتھ روم کے دروازے سے نکل کر تالا لگا کر چلا گیا ہو۔

شبانہ دروازے کے ساتھ لگ کر اپنے آپ کو گرم اوورکوٹ میں سمیٹے کھڑی تھی۔ برف کے گالے ہوا کے تھپیڑوں کے ساتھ برآمدے تک آ رہے تھے۔ کھڑے کھڑے سردی کے ماری اس کے دانت بجنے لگے۔ وہاں اسے کوئی نوکروں کا کوارٹر بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ شاید کوٹھی کے پیچھے کوئی گیراج وغیرہ موجود ہو۔ وہ دروازے سے ہٹ کر چلنے لگی تو اسے اندر سے دروازے کی چٹخنی کھلنے کی آواز سنائی دی۔

شبانہ پر پہلا تاثر یہ ہوا کہ وہ ڈر گئی کہ خدا جانے اندر کون ہوگا۔ وہ وہاں رکنے کی بجائے بنگلے کی سیڑھیوں کی طرف لپکی اتنے میں پیچھے سے کسی نے بھاری سنجیدہ آواز میں کہا۔

"طوفان زیادہ ہے۔ ۔ ۔ اندر آ جاؤ۔"

شبانہ ابھی برآمدے کے فرش کے کنارے پر ہی تھی اس نے پلٹ کر دیکھا ایک لمحے کے لئے اس کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔ کمرے کا دروازہ آدھا کھلا تھا۔ ادھ کھلے دروازے میں ایک دراز قد چوڑے شانوں والا آدمی کھڑا پائپ منہ میں لگائے دونوں ہاتھ گرم سواتی چغے کی جیبوں میں ڈالے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شبانہ اسے پہچاننے میں کبھی غلطی نہیں کر سکتی تھی۔ یہ وہی پراسرار اجنبی تھا۔ گلاب کے پھولوں، پائپ اور کافی کی ملی جلی خوشبو اور بانس کے جھنڈوں والا کمرے کے بیچ میں آبنوسی گول تپائی رکھی تھی جس پر کافی کا ٹن، پیالہ اور دو کتابیں پڑی تھیں۔ ایک شیشے کا چھوٹا سا گلدان بھی تھا جس میں گلاب کا باسی پھول سجا تھا۔ کمرے میں پائپ کے تمباکو اور کافی کی ملی جلی خوشبو پھیلی تھی۔ اجنبی پائپ ہاتھ میں لئے آتشدان کے قریب کارنس پر کہنی رکھے کھڑا شبانہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے

ہونٹوں پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔ "بیٹھو۔ ۔ ۔ میں تمہارے لئے کافی بناتا ہوں۔"

شبانہ خاموشی سے چلتی آتشدان کی طرف بڑھی۔ اس نے اونی ٹوپی اور دستانے اتار دیئے۔ کمرے کی فضاء ایسی پرسکون اور نیم گرم تھی کہ شبانہ نے اوور کوٹ بھی اتار کر صوفے کی پشت پر رکھ دیا۔ صوفے پر بیٹھتے ہوئے وہ اب بھی کچھ ہچکچا رہی تھی۔ اجنبی نے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "کیا تم کافی نہیں بناؤ گی؟ میں جانتا ہوں تم کافی بہت اچھی بناتی ہو۔"

شبانہ کچھ جھجک بھی رہی تھی لیکن اسے اس فضاء میں ایک اپنائیت کا احساس بھی ہو رہا تھا جیسے وہ وہاں پہلے بھی کئی بار آ چکی ہو۔ ۔ ۔ پھر اسے یہ سب کچھ ایک خواب کی طرح لگنے لگا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ اجنبی ابھی تک، آتشدان کے سامنے آگ کی طرف رُخ کئے کھڑا تھا۔ شبانہ نے دیکھا کہ وہ ایک باوقار وجیہہ اور پرانے وینس شہر کے مہم جو سرداروں ایسی شخصیت کا مالک تھا۔ اس کا سر بڑا تھا، ماتھا چوڑا اور گھنے سیاہ بال اوپر جا کر گھنگھریالے ہو گئے تھے۔ کنپٹیوں پر بالوں نے ہلکی سفید رنگت اختیار کرنی شروع کر دی تھی۔ رنگ کھلتا ہوا تھا مگر اس میں شمالی کارنیج کے جنگجو بہادروں ایسی پختہ سرخی تھی جو جنوبی علاقوں میں دشمن سے ایک مدت تک جنگ کرنے کے بعد لوٹے ہوں۔ شبانہ نے صوفے پر بیٹھنے کے بعد ایک گہرا سانس لیا اور بولی۔ "آپ کو میرا نام کس نے بتایا؟"

نیم گرم، پرسکون، بند کمرے کے باہر برف کا طوفان ابھی تک چیخ رہا تھا مگر اندر اس کی آواز بند کواڑوں اور بھاری پردوں کی وجہ سے بہت کم آ رہی تھی۔ اجنبی آتشدان سے ہٹ کر شبانہ کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کا پائپ بجھ گیا تھا۔ اس نے لائٹر روشن کر کے پائپ روشن کیا اور گہری آواز میں کہنے لگا۔

"تمہارا نام مجھے اس وقت بھی معلوم تھا جب تم پیدا بھی نہیں

ہوئی تھیں۔"

شبانہ کو فضا اور زیادہ پراسرار اور افسانوی ہوتی محسوس ہوئی۔ کہیں وہ سچ مچ خواب تو نہیں دیکھ رہی؟ اس اجنبی نے ایسا جواب دیا تھا جو خوابوں میں ہی دیئے جاتے ہیں۔ اس جواب کا تعلق حقیقت کی دنیا سے بالکل نہیں تھا۔ شبانہ کو اپنے گرد روشنی کا ہالا سا منڈلاتا نظر آنے لگا۔ اس کی رگ و پے میں ایک سکون کی کیفیت تھی جیسے کوئی مسافر طوفانی سفر کے بعد اپنے مکان کے گرم کمرے میں آگیا ہو۔ شبانہ ایک لمحے کے لئے بھی کوئی گھبراہٹ یا اجنبیت محسوس نہیں کر رہی تھی۔ وہ کافی بنانے لگی۔ اس کی نگاہ کارنس کے اوپر دیوار پر لگی سنہری فریم والی آئل پینٹنگ کی طرف اٹھ گئی۔

وہ انگریزی ادب کی طالب علم تھی اور موسیقی اور مصوری کی تاریخ سے واقف تھی۔ اس نے تصویر کو پہچان لیا یہ ریفائیل کی تصویر تھی جس میں بیضوی چہرہ اور نازک گردن والی ایک ایسی عورت کو دکھایا گیا تھا جس کی آنکھیں انکسار سے لبریز تھیں۔ چہرے کے نقوش بے حد نازک اور حساس تھے۔ اس کے حسن میں ایک ایسی پاکیزگی اور وجدان تھا جو طویل مذہبی زندگی بسر کرنے کے بعد ہی میسر آتا ہے۔ شبانہ کے سامنے بیٹھے ہوئے پراسرار اجنبی نے شبانہ کو تصویر کا جائزہ لیتے دیکھا تو پائپ کا ہلکا سا کش لگانے کے بعد بولا۔

"تم جو سوچ رہی ہو وہ ٹھیک ہے۔۔۔ یہ ریفائیل کی ایک مشہور تصویر کا پرنٹ ہے۔ میں نے ویانا سے منگوایا تھا۔ تم اس تصویر والی عورت کو پہچانتی ہو؟"

شبانہ نے کافی بناتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

"میں اسے کیسے پہچان سکتی ہوں؟"

اجنبی نے اپنی پیالی اٹھالی۔۔۔ پائپ تپائی پر گلدان والے مرجھاتے ہوئے گلاب کے پھول کے پاس رکھ دیا اور بولا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو اس عالم میں تمہارا کسی کو بھی پہچاننا ناممکن ہے۔"

ماحول مزید پراسرار ہو گیا۔ اس اجنبی کی باتیں اس کی شخصیت کی طرح سمجھ میں نہ آنے والی اور افسانوی تھیں۔ وہ دیو مالائی انداز میں باتیں کر رہا تھا۔ شبانہ کو اپنے خواب میں دیکھے ہوئے فلائنگ ڈچ مین بوکاشی کی دیکھی ہوئی شکل یاد آگئی جب وہ خاموش سمندر میں کھڑے اس کے ویران بادبانی جہاز پر اس سے ملنے گئی تھی تو وہ بالکل ایسا ہی تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس نے بادبانی جہاز میں قدیم زمانے کا لباس پہن رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں بربط تھا جبکہ یہاں وہ سواتی چغے میں تھا اور پائپ پی رہا تھا۔ شبانہ اگرچہ خوابوں کی دنیا میں رہنا پسند کرتی تھی لیکن وہ ان خوابوں کے کردار حقیقت کی دنیا میں دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے خیال میں ایسا ممکن بھی نہیں تھا۔ باہر طوفان برف و باراں اسی طرح جاری تھا۔ اس نے پراسرار اجنبی سے براہ راست سوال کر دیا۔

"میں آپ سے صرف یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ کا نام کیا ہے؟ آپ اصل میں کون ہیں اور آپ نے تھیمز ریستوران میں مجھے گلاب کا مرجھایا ہوا پھول کیوں بھیجا تھا۔"

ایک لمحے کے لئے اس آدمی نے شبانہ کے خوبصورت آنکھوں والے چہرے کو غور سے دیکھا پھر ذرا سا آگے جھک کر بولا۔

"میں ان میں سے تمہارے کسی ایک سوال کا جواب بھی نہیں دے سکتا۔ وقت آنے پر تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔"

پھر وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا۔ بھاری پردہ ایک طرف ہٹا کر شیشے میں سے باہر دیکھا۔ ایک لمحے کے لئے وہیں خاموش کھڑا رہا پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا آتشدان کے پاس آیا اور تپائی پر سے ایک کتاب اٹھا کر اس کے ورق الٹنے لگا۔ ورق الٹتے ہوئے ایک سوکھا ہوا پھول نیچے گر پڑا۔ اس نے پھول اٹھایا۔ شبانہ نے دیکھا کہ کتاب میں دبا کر رکھنے سے سرخ پھول خشک ہو چکا تھا۔ اجنبی نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے شبانہ کی طرف نگاہیں اٹھا کر کہا۔

"تم مجھے راحیل کہہ کر بلا سکتی ہو۔ ۔ ۔ یہ میرا نام نہیں ہے۔ ۔ ۔ تمہارا نام بھی وہ نہیں ہے جس نام سے تمہیں سب پکارتے ہیں۔ اس سرخ گلاب کی خشک پنکھڑیوں کو بھی تم نہیں پہچان سکو گی جو کبھی شبنم کی نمی سے تر و تازہ تھیں اور اندلس کے ایک دور افتادہ اناروں کے باغ کی ایک بارہ دری میں تم نے مجھے دیا تھا۔"

شبانہ نے چونک کر اجنبی کو دیکھا اس کے چہرے پر آتشدان میں جلنے والی آگ کی دھیمی دھیمی چمک ایسے لگ رہی تھی جیسے مغربی افق پر سورج غروب ہو رہا ہو۔ شبانہ نے پیالی میز پر رکھ دی۔

"آپ جو باتیں کر رہے ہیں وہ میری سمجھ سے باہر ہیں۔" پراسرار اجنبی کو اب سے ہم راحیل کے نام سے ہی یاد کیا کریں گے۔ راحیل نے سرگوشی ایسی آواز میں کہا۔

"دنیا میں صرف تم ہی ایک ایسی ہستی ہو جس کو میری باتیں سمجھنا چاہئیں۔ مجھے اور کسی ذی روح سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میرا کسی ذی روح سے سوائے تمہارے کوئی ناطہ بھی نہیں ہے۔"

شبانہ نے پوچھا۔ ۔ "لیکن میرا آپ سے کیا ناطہ ہے میں نے زندگی میں بمشکل سے دو تین بار ہی دیکھا ہوگا اور آج پہلی بار آپ سے بات کرنے کا موقع ملا ہے۔"

راحیل نے کہا۔ ۔ ۔ "لیکن میں نے تم سے کئی بار باتیں کی ہیں۔ آج نہ وہ باغ باقی رہے ہیں نہ وہ درخت جن کی شاخوں میں صبح کی نرم و پاکیزہ ہوا رحمدلی سے سرگوشیاں کرتی گزرا کرتی تھی اور جن کی ٹھنڈی چھاؤں میں ہم میٹھے چشمے کے کنارے بیٹھے باتیں کیا کرتے تھے۔ ریت ان زمرد ایسے باغوں کو اڑا کر لے گئی ہے۔ آوازیں خلاء کے ارتعاش میں کھو گئی ہیں مگر مجھے معلوم تھا کہ تم آؤ گی۔ ۔ ۔ ضرور آؤ گی۔ ۔ ۔ میں تمہارے ہی انتظار میں اس روز لائبریری کی جافری میں میز پر کتاب کھولے بیٹھا تھا۔ ۔ ۔ کیا تمہیں کچھ یاد آ رہا ہے؟ کیا تم غرناطہ شہر کے اس پائیں باغ کو دیکھ رہی ہو جس کے محرابی دروازے پر سرخ گلاب کی بیل چڑھی ہوئی تھی۔

پھر راحیل نے جذباتی انداز میں سوکھے پھول کی پنکھڑیوں کو شبانہ کے چہرے کے قریب لاتے ہوئے کہا۔

"یہ اسی محرابی دروازے کی بیل کا سرخ گلاب ہے کیا اس کی اداس مہک تمہیں اپنی دلگداز آواز میں خاموشی کا کوئی گمشدہ گیت سناتی محسوس نہیں ہوتی۔"

شبانہ اٹھ کھڑی ہوئی اس کو اچانک کچھ بے چینی سی محسوس ہونے لگی تھی خواب کے کسی چہرے کو اس نے آج تک دن کی روشنی میں نہیں دیکھا تھا۔ ان پراسرار دھند میں ڈوبی ہوئی آوازوں کو کبھی حقیقت کی دنیا میں دوبارہ نہیں سنا تھا۔ اس نے دستانے پہنے، سر پر اونی ٹوپی اوڑھی اور کوٹ پہنا اور چھتری اٹھا کر بولی۔

"میں جا رہی ہوں۔ ۔ ۔ آپ کی میزبانی کا شکریہ۔"

راحیل صوفے پر ہی بیٹھا رہا۔ پائپ اس کے ہاتھ میں تھا۔ آنکھیں شبانہ کے مضطرب چہرے پر جمی تھیں اس نے آہستہ سے کہا۔

"طوفان تھم گیا ہے۔ ۔ ۔ تم واپس اپنے گھر پہنچ جاؤ گی۔ ۔ ۔ خدا حافظ!"

اس کے بعد شبانہ نے کوئی بات کی اور نہ اس پراسرار اجنبی راحیل نے کوئی لفظ بولا۔ شبانہ تیز تیز قدم اٹھاتی کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ سرد یخ آلود ہوا اس کے چہرے سے ٹکرائی۔ طوفان تھم گیا تھا مگر ہلکی ہلکی برف اب بھی گر رہی تھی۔ چاروں طرف نرم سفید برف کی چادر بچھی تھی۔ درخت برف میں ڈوبے ہوئے تھے۔ شبانہ لان کے گملوں میں سے گزرتی، پتھر کی سیڑھیاں اتر کر برف پوش پگ ڈنڈی پر آ گئی۔ ابھی شام نہیں ہوئی تھی۔ دن کی روشنی سرمئی بادلوں سے بھی جھلک رہی تھی۔ شبانہ گرتی برف میں واپس کوٹھی پر آئی تو عامر اس کی طرف لپکا۔

"باجی! مائی گاڈ! خدا کا شکر ہے آپ کی شکل دیکھی۔ باجی غزالہ کا تو غم کے مارے برا حال ہو گیا ہے۔ آپ طوفان میں کہاں تھیں۔"

شبانہ کپڑوں پر سے برف جھاڑتی سیدھی غزالہ کے بیڈروم میں گئی۔ غزالہ

نے شبانہ کو دیکھا تو اس کی جان میں جان آئی۔ ناراض ہو کر ذرا سی ڈانٹ کے ساتھ کہنے لگی۔

"اگر تم نے ایسے ہی مجھے پریشان کرنا ہے تو میں کل ہی لاہور واپس چلی جاؤں گی۔ تم کہاں تھیں؟ میں نے کہا نہیں تھا طوفان آنے والا ہے مت جاؤ۔"

شبانہ نے کوٹ اتار کر پلنگ پر پھینکا اور اپنی بڑی بہن کو پیار کرتے ہوئے بولی۔ "آپی! مجھے کیا خبر تھی کہ اتنا زبردست طوفان آ جائے گا۔ وہ تو خدا کا شکر ہوا کہ اوپر چیمبوں تک ہی گئی تھی۔ طوفان نے تو اچانک گھیر لیا۔ خوش قسمتی سے ایک خالی کوٹھی کا گیراج نظر آ گیا بس وہیں گھس کر بیٹھ گئی۔ اب طوفان تھما تو وہاں سے نکلی ہوں۔ آئی ایم سوری آپی! اب تم سے اجازت لئے بغیر کبھی بھی باہر نہیں جاؤں گی۔ اب خوش ہو جاؤ پلیز!"

غزالہ تو شبانہ کو دیکھتے ہی خوش ہو گئی تھی۔ جب شبانہ نے اسے یقین دلایا کہ وہ آئندہ اس کی مرضی کے بغیر کہیں باہر نہیں جائے گی تو اسے اور زیادہ اطمینان ہو گیا۔ شبانہ نے اپنے ہاتھ سے سیلون کی چائے بنا کر غزالہ کو دی۔ دونوں بہنیں بیٹھ کر چائے پینے اور باتیں کرنے لگیں۔ شبانہ کی آنکھوں کے آگے پراسرار راحیل کا [illegible] اور وہ نیم گرم کمرہ گھوم رہا تھا جہاں آتشدان میں آگ روشن تھی اور فضا میں پائپ کے تمباکو اور کافی کی خوشبو میں باسی گلاب کے پھولوں کی مہک گھل مل رہی تھی اور جہاں تھوڑی دیر پہلے بیٹھی وہ اس وجیہہ اور پراسرار آدمی سے باتیں کر رہی تھی بلکہ اس کی دیومالائی باتیں سن رہی تھی۔ وہ سوچنے لگی کیا یہ سچ مچ کوئی خواب کی دنیا کا آدمی ہے؟ کیا یہ تاریخ کے اوراق سے نکل کر ہماری جیتی جاگتی تلخ ترش اور شیریں دنیا میں آ گیا ہے یا یہ سب کچھ محض میرا وہم ہے۔ ممکن ہے میں نے کچھ بھی نہ دیکھا ہو۔ کسی اجنبی سے بات نہ کی ہو۔ کسی نے مجھے گلاب کا پھول پیش نہ کیا ہو؟

رافائیل کی خوبصورت تصویر والا کوئی بھی بنگلہ پہاڑی کے اوپر موجود نہ ہو۔

فرائیڈ نے اپنی کتاب میں خوابوں کے باب میں لکھا ہے کہ کبھی کبھی ہم دوہری زندگی بسر کرنے لگتے ہیں۔ یہ دوسری زندگی خواب کی دنیا سے نکل کر ہمارے اوپر طاری ہو جاتی ہے۔ ہم جو کچھ کر رہے ہوتے ہیں وہ حقیقت نہیں ہوتی لیکن وہ خواب بھی محسوس نہیں ہوتا۔ شبانہ نے اپنے ان خیالات کو جھٹک دیا۔ وہ ایسا سوچنا نہیں چاہتی تھی وہ صرف اس قسم کے خواب دیکھنا چاہتی تھی۔ ان کی روشنی میں وہ ان خوابوں کی خوشبوؤں اور رنگوں کے ساتھ حقیقت کی زندگی بسر کرنا چاہتی تھی لیکن اسے یوں لگ رہا تھا کہ خوابوں نے اس کے لاشعور کی دنیا سے نکل کر دن کی روشنی میں اس کے ساتھ سفر کرنا شروع کر دیا ہے۔ خواب کے کردار اس کی اصل زندگی میں داخل ہونے لگے ہیں۔

شبانہ نے اسی وقت خیال کر لیا کہ وہ کل کسی وقت پہاڑی کے اوپر والی اس کوٹھی کو ضرور جا کر دیکھے گی کہ وہاں اصل میں کون رہتا ہے۔ کیا یہ محض اس کا وہم تھا۔ دن کے وقت جاگتے میں دیکھا ہوا خواب تھا یا واقعی یہاں وہ اجنبی شخص رہتا ہے۔

رات کو وہ دیر تک اپنے بیڈ روم میں جاگتی رہی۔ اسے بار بار فلائنگ ڈچ مین کی دیومالائی کہانی کا خیال آ رہا تھا۔ مگر وہ تو ایک افسانوی کردار تھا۔ شبانہ تھارو کی "والڈن" کھول کر ورق گردانی کرنے لگی۔ اس کتاب نے دوبارہ شبانہ کو پرسکون سمندر میں فلائنگ ڈچ مین کے بادبانی جہاز کی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ وہ جیسے ہوا کی لہروں پر اپنے آپ فضا میں اڑی جا رہی تھی۔ اس نے خالی سمندر میں جہاز کو دیکھا جس کے بادبان مستول سے لپٹے ہوئے تھے اور جو بے معلوم انداز میں جھول رہا تھا۔ باورچی خانے سے عامر کی بلند آواز نے اس کے خواب انگیز خیالات کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

عامر نے خانساماں کو آواز دی تھی۔ شبانہ نے کتاب بند کر کے ریکارڈ پلیئر کا بٹن اون کر دیا۔ بیڈ روم کی نیم گرم خوشبودار فضا میں عظیم موسیقار بیتھوون کی آخری سمفنی کے درد بھرے سر ابھرتے چلے گئے۔ یہ گویا ان [illegible]

دھیمی سسکیوں کی آوازیں تھیں جو نظر نہ آنے والی خزاں کی ہواؤں کی طرح سوکھے پتوں کو اپنے دامن میں سمیٹتی شبانہ کی طرف بڑھی چلی آ رہی تھیں۔ خزاں کی ان غم انگیز ہواؤں کے ساتھ ہی شبانہ نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

دوسرے روز ناشتے کے بعد اس نے غزالہ سے کہا کہ وہ ڈاک خانے تک جا رہی ہے۔ کوٹھی سے نکلتے ہی اس کے قدم اپنے آپ پہاڑی والے بنگلے کی طرف اٹھنے لگے۔ برف باری رات میں کسی وقت ہی رک گئی تھی۔ نیلے آسمان پر دھوپ چمک رہی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی جس کی وجہ سے سردی میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ ٹیرس پر بنے ہوئے گول بنگلے کی ڈھلانی چھت، پتھروں کی دیوار اور لکڑی کے گیٹ پر برف کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ گیٹ بند تھا۔ اس نے اسے کھولا اور تنگ راستے سے گزرتی بڑے بڑے سنگین گملوں کے قریب سے ہو کر وہ برآمدے میں آ گئی۔ آتش دان والے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اس نے دروازہ کو دھکیلا دروازہ کھل گیا۔ کمرہ خالی تھا۔ آتش دان بجھا ہوا تھا۔ آتشدان کے پاس وکٹورین عہد کے پرانے صوفے اور آبنوسی تپائی ویسے ہی پڑی تھی۔

شبانہ کمرے میں داخل ہو گئی کارنس کی دیوار پر ریفائیل کی بنائی ہوئی پینٹنگ موجود نہیں تھی۔ کمرے کی فضا ٹھنڈی تھی۔ تپائی پر صرف چھوٹا بلوریں گلدان پڑا تھا جس میں گلاب کا باسی پھول سر جھکائے ہوئے تھا۔ شبانہ کو برآمدے میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر کھلے دروازے کی طرف دیکھا۔ ایک ادھیڑ عمر چوکیدار کمبل کی بکل مارے اندر آ گیا۔

”بی بی جی کس سے ملنا ہے آپ کو؟“

شبانہ نے پوچھا۔ ”وہ صاحب جو یہاں رہتے تھے کہاں ملیں گے“، تو چوکیدار نے کہا۔ ”وہ تو چلے گئے بی بی جی“

”کیوں؟“ شبانہ کے منہ سے اپنے آپ یہ سوال گیا۔

چوکیدار نے گردن ایک طرف جھکاتے ہوئے کہا۔

”یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں جی۔“

شبانہ نے مزید استفسار کیا تو چوکیدار نے کہا ”میں چھ برس سے یہاں چوکیداری کر رہا ہوں جی۔ مجھے اپنے مالک کا نام بھی معلوم نہیں۔ وہ برف کے موسم میں دو تین دن کے لئے آتے ہیں اور پھر چلے جاتے ہیں۔ انہیں ملنے بھی یہاں آپ سے پہلے کبھی کوئی نہیں آیا۔“

”کیا یہ۔۔۔۔ یہ بنگلہ ان کا اپنا ہے بابا؟“ شبانہ نے پوچھا۔

” مجھے یہ بھی معلوم نہیں بی بی جی! انہوں نے مجھ سے کبھی کوئی بات نہیں کی میرا کام اس بنگلے کی خبر گیری کرنا ہے۔ مجھے ہر ماہ میری تنخواہ کا منی آرڈر مل جاتا ہے۔“

شبانہ نے دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہاں ایک تصویر لگی تھی۔۔۔ وہ۔۔۔ کہاں چلی گئی؟“

چوکیدار نے کہا۔ ”جی یہ تصویر مالک برف کے سیزن میں اپنے ساتھ لاتے ہیں اور ساتھ ہی لے جاتے ہیں۔ آپ کہاں سے آئی ہیں بی بی جی؟“ شبانہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ گلدان میں لگے باسی پھول کو ایک نظر دیکھا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔۔۔۔

- - - - -

شبانہ بوجھل قدموں سے ویران پہاڑی کوٹھی کے ٹیرس سے گزر کر لکڑی کے چھوٹے سے جنگلے کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ کوہ مری کا نیلا آسمان چمکیلی دھوپ میں شیشے کی طرح شفاف تھا۔ ڈھلانوں پر برف کی تہہ جمی تھی۔ چیڑھ کے درختوں کی ٹہنیاں ہلکی سرد ہوا میں ہلتیں تو ان پر رکی ہوئی برف نیچے گرنے لگتی۔ شبانہ نے ایک اداس نگاہ ویران کوٹھی پر ڈالی۔ جانے کیوں اسے لگا جیسے وہ اپنی سنہری خوشبودار انمول یادوں کا ایک قیمتی حصّہ اس خالی کوٹھی میں آتشدان کے پاس چھوڑ آئی ہے۔

جہاں کل برف باری کے طوفان میں دھیمی دھیمی آگ جل رہی تھی۔ نیم گرم فضاء میں پائپ کے تمباکو، سرخ گلاب اور شبانہ کی بیش قیمت خواب انگیز پرفیوم کی ملی جلی مہک رچی ہوئی تھی اور پراسرار اجنبی آتشدان کے کارنس پر کہنی رکھے اس سے خواب کی دنیا کی باتیں کر رہا تھا۔ شبانہ کو وہ باتیں حقیقت کے بہت قریب محسوس ہو رہی تھیں اس لئے کہ وہ خود خوابوں کی دنیا کی رہنے والی تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ خواب کی دنیا ہی اصل دنیا ہے جو ہماری ہے جس سے ہمارا ازلی اور ابدی رشتہ ہے۔ ہم پیدا ہونے سے پہلے اسی دنیا میں تھے اور مرنے کے بعد واپس اسی دنیا میں چلے جاتے ہیں۔ ایک ناپید اکراں ازل اور ایک لامحیط ابد کے درمیان ساٹھ ستر سال کی حقیقی زندگی کا وقفہ کیا حیثیت رکھتا ہے اور کسے معلوم ہے کہ یہ

زندگی حقیقت ہے بھی کہ نہیں؟ ممکن ہے جسے ہم حقیقت سمجھ رہے ہیں مرنے کے بعد ہمیں معلوم ہو کہ وہ تو خواب تھا اصل زندگی تو اب شروع ہوئی ہے۔ شبانہ کو پراسرار راحیل کی باتیں یاد آنے لگیں اس کا اصل نام بھی شبانہ کو معلوم نہیں تھا اس نے کہا تھا "میرا کوئی نام نہیں... تم مجھے راحیل کہہ کر بلا سکتی ہو۔"

شبانہ کو وہاں کھڑے کھڑے سردی محسوس ہونے لگی۔ وہ کوٹھی کے تنگ راستے سے نکل کر اپنے کاٹیج کی طرف آہستہ آہستہ چلنے لگی جہاں اس کی بیمار بڑی بہن غزالہ یقیناً اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ چیڑھ کے نیم برف پوش درختوں کے نیچے ٹھنڈک اور عجیب سی دار چینی کی دھیمی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ شبانہ نے اونی مفلر سے اپنے سرخ کان ڈھانپ رکھے تھے۔ اس کے کانوں میں جیسے کوئی کیٹس اور ورڈز ورتھ کی نظموں کی سطریں سرگوشیوں میں پڑھ رہا تھا۔

اس کی بیمار بڑی بہن غزالہ اپنے بیڈ روم میں بستر پر نیم دراز کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ شبانہ کو دیکھا تو کتاب پرے رکھ دی اور بولی "باہر تو بڑی سردی ہوگی شبو؟" شبانہ نے مفلر اتار کر کرسی کے اوپر ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہاں باجی! برف باری کے بعد جب دھوپ نکلتی ہے اور سردی زیادہ ہو جاتی ہے اور اب تو ہوا بھی چلنے لگی ہے۔" غزالہ نے ریشمی کمبل کو ذرا سا اوپر کھینچتے ہوئے کہا "میرا جی چاہتا ہے آج سمبر ریستوران میں کافی پیئوں۔۔ تم میرے ساتھ چلو گی نا؟"

"کیوں نہیں آپی۔" شبانہ نے اپنی روگی بڑی بہن کے پاس پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں تو خود چاہتی ہوں کہ تم کھلی ہوا میں تھوڑا باہر نکلو۔۔ اور پھر اب تو تمہاری صحت پہلے سے بہت اچھی ہو گئی ہے۔"

غزالہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور شبانہ کی طرف شفقت اور محبت بھری نظروں سے دیکھا۔ اسے شبانہ سے بہت پیار تھا۔ اس کی ایک ہی تو بہن تھی۔ اسے یاد تھا جب شبانہ چھوٹی سی تھی اور وہ اسے ساتھ لے کر کینال بینک والی نہر پر سیر کے لئے اپنے ساتھ لے جایا کرتی تھی۔ اس نے کہا "شبو! مجھے لگتا ہے

کہ میں اندر سے خالی خالی ہو گئی ہوں... اگر مجھے کچھ ہو گیا تو...."

شبانہ نے بے اختیار غزالہ کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا "آپی! پھر کبھی ایسی بات منہ سے نہ نکالنا... تم ہزار سال تک زندہ رہو گی... تم بالکل ٹھیک ہو... بس اپنے دل کو خوش رکھو... دیکھو... میں تمہارے ساتھ ہوں پھر تم ایسے خیال دل میں کیوں لاتی ہو؟ ٹھہرو میں تمہارے بالوں میں کنگھی کرتی ہوں۔" شبانہ کو کنگھی نہ ملی تو وہ سنگھار میز سے برش اٹھا کر غزالہ کے بالوں پر پھیرنے لگی۔ وہ بھی اپنی بڑی بہن سے بہت پیار کرتی تھی، بہن کے پیار کو شاید دنیا کا کوئی بھائی اور دنیا کی کوئی بہن پوری طرح سے نہیں سمجھ سکتی۔ شبانہ اپنی بڑی بہن کے بالوں پر برش پھیرتے ہوئے دل میں اس کی طویل زندگی کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ سہ پہر کو اس نے غزالہ کو خوب اچھی طرح سے گرم کپڑے پہنائے، سر پر اونی ٹوپی اور گلے میں گرم مفلر لپیٹا اور اسے ساتھ لے کر مال روڈ پر سمیز کی طرف چل پڑی۔

موسم بالکل صاف تھا، دھوپ ماند پڑ رہی تھی، ہلکی ہلکی سرد ہوا صبح سے یکساں رفتار کے ساتھ چل رہی تھی۔ دونوں بہنیں برف پوش رستوں پر سنبھل سنبھل کر آہستہ آہستہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے مال روڈ پر آگئیں۔ مال روڈ کو درمیان سے برف صاف کر کے خشک راستہ بنا دیا گیا تھا۔ شبانہ نے سمیز ریستوران کی جہازی کھڑکیوں کو دیکھا۔ اس کے دل میں ایک موہوم سی خواہش ضرور تھی کہ شاید سمیز میں پر اسرار اجنبی راحیل سے ملاقات ہو جائے۔ برف آلود سردی کی وجہ سے سمیز میں اکا دکا گاہک ہی بیٹھے کافی وغیرہ پی رہے تھے۔ دونوں بہنیں کونے والی کھڑکی کے پاس بیٹھ گئیں۔ سامنے گرجا گھر کا صحن خالی تھا۔ شبانہ نے کریم کافی اور کچھ سینڈوچز منگوائے۔ غزالہ لمبے گرم کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کرسی سے ٹیک لگائے بیٹھی اپنی چھوٹی بہن کو کافی بناتے دیکھ رہی تھی پھر ایک نظر ویران سڑک پر ڈالی اور کہنے لگی۔

"شبو! امی تمہاری شادی کے بارے میں بڑی پریشان رہتی ہیں۔"

شبانہ کا ہاتھ پیالی میں چمچ ہلاتے، ایک لمحے کے لئے رک گیا... پھر اس نے گرم خوشبودار کافی کی پیالی اپنی بہن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آپی! جب تک میں بی اے نہیں کر لیتی کیسے شادی کر سکتی ہوں۔"

غزالہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے کافی پینے لگی۔ نیچے سڑک پر ایک آدمی سرخ پھولوں کا بڑا سا گلدستہ تھامے گزر گیا۔ شبانہ کو گلاب کے سرخ پھول یاد آگئے۔ مگر اسے پائپ کے تمباکو کی خاص خوشبو محسوس نہ ہوئی۔ غزالہ کہہ رہی تھی۔ "اس برس تم بی اے کر لو گی... میری شادی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا... امی اور ابو تمہاری ذمہ داری ادا کر دینا چاہتے ہیں۔ ظفر برا لڑکا نہیں ہے اپنا خون ہے اور پھر امریکہ ہیں..." شبانہ نے کافی کی پیالی میز پر رکھ دی اور کہا۔

"آپی! پلیز! کوئی اور بات کرو... وہ دیکھو گرجا گھر کے پیچھے ٹیرس پر جو کوٹھی ہے اس میں میری ایک سہیلی ایک بار آکر رہی تھی... وہ کہتی تھی کہ یہاں بھوت رہتے ہیں۔"

غزالہ نے جلدی سے کہا۔ "خدا کے لئے بھوتوں کی بات نہ کرو... مجھے بھوتوں سے بڑا ڈر لگتا ہے۔"

شبانہ شرارت سے مسکرانے لگی۔ غزالہ نے شبانہ کو مسکراتے دیکھا تو بولی۔

"شبو! میں چاہتی ہوں تم ہمیشہ مسکراتی رہو... ہمیشہ خوش رہو تمہیں کبھی کسی کی نظر نہ لگے۔" "اگر تم یہ چاہتی ہو آپی تو خدا کے لئے امی ابو کو کسی طرح سمجھاؤ کہ میری شادی ظفر سے کرنے کا خیال دل سے نکال دیں۔ میں اس کے ساتھ کبھی خوش نہیں رہ سکوں گی۔"

غزالہ نے شبانہ کا ہاتھ تھام لیا اور بولی۔ "آخر تمہیں اس سے نفرت کیوں ہے؟ وہ اتنا برا لڑکا نہیں ہے اس میں کوئی عیب بھی نہیں ہے... بس کاروباری قسم کا ہے اور تمہاری طرح شاعرانہ مزاج کا نہیں ہے... اور یہ کوئی ایسی بات نہیں ہوتی، شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

شبانہ نے کسی قدر جھنجلا کر کہا۔ "شادی کے بعد کبھی سب ٹھیک نہیں ہوتا آپ...

شادی کے بعد ہی ساری خرابیاں شروع ہوتی ہیں۔ ظفر کی اور میری طبیعت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ کوئی نقطہ ایسا نہیں جہاں ہم کبھی متفق ہوں۔ وہ شمال کا رہنے والا ہے تو میں جنوب میں رہتی ہوں۔ پھر شادی کے بعد سب کیسے ٹھیک ہو جائے گا؟" غزالہ نے پیار سے شبانہ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے جیسا تم کہو ویسے ہی ہوگا... میں امی ابو کو سمجھانے کی کوشش کروں گی۔"

شبانہ کا دل چاہا کہ وہ اپنی بہن کو بے اختیار گلے لگا لے... مگر ریستوران میں وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی... اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی بہن کا ہاتھ تھام لیا اور مسرت بھرے لہجے میں کہا۔

"آپی گھر میں ایک تم ہی ہو جو مجھے سمجھتی ہو... خدا کرے تمہیں میری عمر بھی لگ جائے۔" غزالہ نے شبانہ کو پیار سے جھڑک دیا۔ "ایسی فضول باتیں نہیں کیا کرتے"

شبانہ اطمینان سے کافی پینے لگی اس نے کئی بار ریستوران کی فضاء کا جائزہ لیا تھا۔ راحیل اسے کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مال روڈ پر سے دو تین لمبے گرم اوور کوٹ والے آدمی گزرے تھے مگر ان میں راحیل کوئی نہیں تھا۔ شبانہ کا دل بوجھل سا ہو گیا۔ یہ شخص کس دنیا سے آتا ہے اور کس دنیا کو نکل جاتا ہے۔ حقیقت کی دنیا سے اس کا تعلق کس نسبت سے ہے؟

شبانہ کے ذہن میں ایسے ہی خیالات گردش کر رہے تھے کہ غزالہ نے ہاتھوں پر سیاہ دستانے چڑھاتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے اب گھر چلنا چاہیئے مجھے سردی لگنے لگی ہے۔"

کاٹیج میں آکر غزالہ اپنے بستر پر گرم ہو کر نیم دراز ہو گئی۔ شام کو لاہور سے امی کا فون آگیا۔ اس وقت شبانہ کا چھوٹا بھائی عامر بھی وہاں موجود تھا اور کیسٹ پلیئر پر ایک نئی کیسٹ چڑھا رہا تھا۔ غزالہ نے امی سے بات کی دوسرے کمرے سے شبانہ بھی آگئی باری باری سب نے امی سے بات کی۔ امی ان سے بغیر اداس

ہو رہی تھیں۔ انہوں نے شبانہ سے بھی کہا کہ تم لوگوں نے کوہ مری میں کافی رہ لیا ہے برفوں کے موسم میں زیادہ رہنا ٹھیک نہیں لاہور میں بھی کافی سردی پڑ رہی ہے اس لئے اب واپس لاہور آجاؤ۔ امی کے ٹیلی فون کے بعد غزالہ اداس ہو گئی۔ اس نے شبانہ سے کہا کہ واپس لاہور چلتے ہیں اب میرا یہاں بالکل دل نہیں لگتا۔

شبانہ اس امید پر وہاں مزید کچھ روز ٹھہرنا چاہتی تھی کہ شاید کبھی اور کسی وقت اچانک پراسرار اجنبی راحیل سے اس کی ملاقات ہو جائے.... لیکن غزالہ کی طبیعت کے پیش نظر اس نے بھی واپس لاہور جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اگلے روز انہوں نے لاہور جانے کا پروگرام بنا لیا۔ انہیں صبح سویرے کوہ مری سے روانہ ہونا تھا۔ نوکروں نے بڑا سامان رات کو ہی ویگن میں باندھ کر رکھا دیا تھا۔ شبانہ سورج نکلنے سے پہلے اٹھ بیٹھی۔ وہ لاہور جانے سے پہلے ایک نظر اس کاٹیج کو دیکھنا چاہتی تھی جہاں پراسرار راحیل نے اس کے ساتھ برف کے طوفان میں یادگار لمحات گزارے تھے۔

اس نے لمبا کوٹ پہن کر سر پر اونی ٹوپی اوڑھی اور چھڑی ہاتھ میں لے کر چشموں کی طرف نکل گئی۔ سورج ابھی نہیں نکلا تھا مگر دن کا نورانی اجالا نیلے غبار کی شکل میں چاروں طرف پھیل رہا تھا۔ کئی جگہ ڈھلانوں پر سے برف پگھل چکی تھی۔ فضاء میں چیڑھ کے درختوں کی مرطوب مہک رچی ہوئی تھی۔ وہ چشموں کے قریب سے ہوتی ہوئی ان اونچے اونچے چیڑھ کے درختوں میں آگئی جہاں سے ایک تنگ راستہ اوپر چبوترے پر بنے ہوئے پرانے اور ویران کاٹیج کو جاتا تھا۔ لکڑی کا جنگلا بند تھا۔ پتھر کے بڑے بڑے گملوں میں ٹراپیکل پودے شبنم میں بھیگ رہے تھے۔ شبانہ جنگلے کے پاس جا کر رک گئی۔ سامنے برآمدہ سنسان تھا پیچھے کاٹیج کا دروازہ اسی طرح بند پڑا تھا۔ چوکیدار بھی وہاں نہیں تھا۔ شبانہ پتھر کی سیڑھیاں چڑھ کر شبنمی گھاس پر قدم رکھتی برآمدے میں آگئی۔ اس نے بند

دروازے کو ذرا سا دھکیلا دروازہ اندر سے بند تھا۔ شبانہ نے شیشے کو ہاتھ سے صاف کر کے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ کمرے کے اندر کارنس کے پاس وکٹورین صوفہ خالی پڑا تھا۔ آتش دان میں آگ نہیں جل رہی تھی۔ دیوار پر ریفائیل کی پینٹنگ موجود نہیں تھی۔ کمرہ خالی، سرد اور ویران تھا۔ شبانہ نے ایک گہرا سانس بھرا اور سست قدم اٹھاتی واپس چل پڑی۔ چیڑھ کے درخت کی بلند شاخ پر سے کوئی پرندہ پھڑپھڑا کر اڑ گیا۔ شبانہ نے چہرہ اٹھا کر دیکھا۔ پرندہ غوطہ لگا کر نیچے وادی میں اتر گیا تھا۔

شبانہ کا دل اداس ہو گیا۔ وہ بلند درختوں میں سے گزرتی واپس اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ سورج راستے میں ہی نکل آیا۔ ڈھلانوں اور چھتوں پر برف کے ٹکڑے طلوع ہوتے سورج کی سنہری روشنی میں سونے کی طرح چمکنے لگے۔ ایک گھنٹے کے بعد وہ گاڑی میں غزالہ کے ساتھ بیٹھی سنی بینک سے نیچے اتر کر لاہور کی طرف جا رہی تھی۔

لاہور پہنچ کر شبانہ کی زندگی پھر اسی ڈگر پر چل نکلی۔۔۔ مگر وہ راحیل کے خیال کو ایک پل کے لئے بھی اپنے دل و دماغ سے نہ نکال سکی تھی۔ وہ گھر پر ہو، کالج میں نجمی کے ساتھ ہو یا پبلک لائبریری میں اس کے دل میں پراسرار راحیل کی سرگوشیاں لہراتی رہتی تھیں۔ اس کی عجیب بے نام سی یاد شبانہ کے ساتھ چلتی تھی۔ تقریباً ہر روز شبانہ پبلک لائبریری جاتی اس خیال سے کہ شاید لائبریری کے [illegible] کرنے کی جیفری کے پاس اسے راحیل کی وجیہ شکل نظر آ جائے مگر جیفری میں رکھی میز پر نہ اسے راحیل دکھائی دیتا، نہ گلاب کا سرخ پھول نظر آتا اور نہ ہی اسے پائپ کے تمباکو کی خیال انگیز خوشبو محسوس ہوتی۔

مارچ کے آخر میں لاہور میں بہار کا موسم شروع ہو گیا۔ شبانہ کے کالج میں آڑو اور انار کے جو پیڑ گراؤنڈ کے کنارے کنارے لگے تھے ان کی اوپر کو اٹھی ہوئی گرے براؤن سوکھی ٹہنیوں پر ننھی ننھی کونپلوں کی سبز آنکھیں طلوع ہونے لگیں۔۔۔ پھر دیکھتے دیکھتے ان درختوں پر گلابی اور سرخ شگوفے نکل آئے۔ شبانہ کے

اپنے پرانے بنگلے کینال لاج کے لان میں کوٹھی کی دیوار کے ساتھ جو کھٹے کے پودے لگے تھے ان پر سفید کلیاں کھل گئیں اور ساری فضاء ان کی میٹھی مہک سے لبریز ہو گئی اب کھٹے کے پودے لوگ کوٹھیوں یا مکانوں کے باہر بہت کم لگاتے ہیں۔ پہلے یہ پودے بہت دیکھنے میں آتے تھے۔ کھٹا لیموں کی نسل کا پھل ہے اس کا چھلکا سخت اور سبز ہوتا ہے۔ ہم اسکول کے زمانے میں امرود کے کچالو پر اسے نچوڑ کر کھایا کرتے تھے۔ اب نہ وہ امرود رہے نہ کچالوا اور نہ کھٹے اب تو لیموں کا رنگ بھی اتنا زرد ہو گیا ہے کہ دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ قریب المرگ ہے اور چہرے پر موت کی زردی چھا رہی ہے۔

لیموں اور کھٹے کو ملا کر ایک ایسی تیسری جنس تیار کی گئی ہے کہ جو نہ کھٹا ہے اور نہ لیموں۔ یہ تیسری جنس کا زمانہ ہے شاید۔ ۔ لیکن میں واپس کھٹے کے پیڑوں کی طرف جاتا ہوں۔ جب ان پیڑوں پر بہار میں کلیاں کھلتی ہیں تو جہاں یہ پیڑ لگے ہوتے ہیں وہاں ارد گرد کا سارا علاقہ ان کی خوشبو سے بھر جاتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ درخت گہرے خوشبودار سانس لے رہے ہیں۔ شبانہ کی کوٹھی "کینال لاج" میں کھٹے کے علاوہ انار، ناشپاتی اور جنگلی گلاب کی بیل بھی دیوار پر چڑھی ہوئی تھی۔ کینال بینک کی نہر کے کنارے کنارے یوکلپٹس اور سفیدے کے درختوں پر بھی نئی نوبلی پتیاں نکل رہی تھیں۔

ایک جگہ دھریک کے درختوں میں کاسنی رنگ کے پھولوں کے گچھے لٹکنے لگے تھے۔ ان کی اپنی گہری گہری میٹھی میٹھی خوشبو تھی۔ شبانہ اپنی گاڑی میں روزانہ کالج جاتی تو نہر کنارے جاتے ہوئے اسے طرح طرح کے پھولوں پودوں اور کلیوں کی خوشبوئیں آتیں۔ وہ کسی وقت گہرا سانس بھر کر سانس روک لیتی جیسے بہار کی خوشبوؤں کو اپنے بدن میں حل کر لینا چاہتی ہو۔ شبانہ کے کالج میں پارکنگ لاٹ کے پاس ہی سنبل کا ایک بہت تناور درخت تھا۔ اس درخت کی شاخوں میں سنبل کے سرخ پھول لالٹینوں کی طرح لٹکنے لگے تھے۔ شبانہ انہیں دیکھتی تو بے اختیار

اس کا جی ان درختوں سے پوچھنا چاہتا کہ سنبل کے گھنے درختو! تم اپنے سرخ پھولوں
کے فانوس لٹکائے کس کا انتظار کر رہے ہو؟ وہ کون شہزادی ہے جس کو ہر موسم
بہار میں تم اپنے سرخ پھولوں کی روشنی دکھاتے ہو؟ کیا اس کے بال سنہری ہیں؟
کیا اس کی آنکھیں نیلی ہیں؟ وہ جنوب سے آئے گی یا شمال سے؟ وہ ماضی کے کن
ان دیکھے سمندروں کی دھند پار کر کے تمہارے پاس آئے گی؟ بہار گزر جاتی ہے
سنبل کے سرخ پھول بجھ کر گر پڑتے ہیں۔ کاروں کے پہیے انہیں روند کر گزر جاتے
ہیں اور سنبل کے درخت آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور اگلے موسم بہار کے انتظار میں
چپ ہو جاتے ہیں۔ ایک روز لاہور کے آسمان پر موسم بہار کے بادل چھا رہے تھے
ٹھنڈی خوشبودار ہوا چل رہی تھی۔ چار بجے کی چائے اس نے اپنی امی اور بہن
غزالہ کے ساتھ پی اور پھر گاڑی نکال کر نہر کے کنارے کنارے شمال کی طرف چل
دی۔ کینال بینک والی نہر کی یہ خاموش پرسکون اور خیال انگیز چھوٹی سی سڑک
شبانہ کی کمزوری تھی۔

اس زمانے میں ابھی یہ سڑک پکی نہیں ہوئی تھی اور اس پر ٹریفک بھی نہ
ہونے کے برابر تھا۔ آگے جا کر نہر پر ٹاہلی یعنی شیشم کے درختوں کا سلسلہ شروع
ہو جاتا تھا۔ شیشم کا درخت پنجاب کی پہچان ہے۔ مارچ اپریل میں جب شیشم
کی شاخوں میں زرد رنگ کا بور آتا ہے تو ایک عجیب سی دل پر گہرا اثر کر دینے
والی مہک اڑنے لگتی ہے۔ کبھی جہلم چھاؤنی کی ٹاہلیوں کی مہک وزیر آباد تک
جاتی تھی اب ڈیزل کا دھواں اسے جہلم میں ہی نگل لیتا ہے مگر ہم اس زمانے کا
ذکر کر رہے ہیں جب کینال بینک والی نہر کی شمالی ٹاہلیوں کی خوشبو میں مست
بھونرے اپنا راستہ بھول جاتے تھے۔

شبانہ کی گاڑی جب ان ٹاہلیوں کے نیچے سے گزری تو اسے گہری شگفتہ
اداس خوشبو نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اس نے گاڑی کی رفتار دھیمی کر دی
اب اس خوشبو میں اس گھاس کی مرطوب مہک بھی شامل ہو گئی تھی جو نہر

کنارے آدھی پانی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ابھی اس علاقے میں آبادی کا سیلاب نہیں
آیا تھا۔ دونوں جانب ہرے بھرے کھیت ہی کھیت تھے۔ شبانہ دھیمی رفتار
سے گاڑی لئے جا رہی تھی کہ اسے ایک جگہ بڑی نہر میں سے ایک چھوٹی نہر نکل
کر بائیں جانب کھیتوں میں جاتی نظر آئی۔ اس نہر کے ساتھ ایک بڑا ہی رومانٹک
کچا راستہ بھی جا رہا تھا جس پر ٹاہلیوں کا سایہ تھا۔ یہ راستہ شبانہ کو اتنا اچھا لگا
کہ اس نے بے اختیار گاڑی اس طرف موڑ دی۔ یہ چھوٹی سی پرسکون کچی سڑک نہر کے
ساتھ ساتھ جاتی تھی۔ نہر کا رنیلا پانی بہتا ہوا آئینہ لگ رہا تھا۔ بادل جھک آئے
تھے اور دن کی روشنی بادلوں کے ٹھنڈے سایوں میں سمٹ سی گئی تھی۔

جب شبانہ گاڑی چلاتی کافی آگے نکل آئی تو اچانک اس کی نظر ایک پرانی
کوٹھی پر پڑی جس کے آدھے ٹوٹے ہوئے لکڑی کے گیٹ پر جا کر یہ سڑک ختم ہو
جاتی تھی اور نہر کوٹھی کے پہلو سے ہو کر آگے نکل گئی تھی۔ شبانہ نے پہلے یہ کوٹھی
کبھی نہیں دیکھی تھی۔ یہ پرانی وضع کی ایک منزلہ بوسیدہ سی کوٹھی تھی جس کے گرد
گول دیوار بنی ہوئی تھی۔ اس دیوار کو جنگلی بیلوں نے چھپا رکھا تھا۔

کوٹھی کے وسیع لان میں بھی شیشم کے اونچے اونچے درخت کھڑے تھے
لان کچا اور ہموار تھا۔ شبانہ نے گیٹ کے پاس گاڑی لے جا کر اسے موڑا تو
اچانک اسے ایک عجیب سی خوشبو محسوس ہوئی اس کا دل ایک پل کے لئے
زور سے دھڑک اٹھا۔ اس نے گاڑی ٹاہلی کے درختوں میں ایک طرف کھڑی کر
کے انجن بند کر دیا۔ اس نے غور سے پرانی کوٹھی کے برآمدے کی طرف دیکھا
برآمدے کے محرابی ستونوں پر عشق پیچاں کی کاسنی پھولوں والی بیلیں بے ترتیبی
سے چڑھی ہوئی تھیں۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ کوٹھی عرصے سے ویران پڑی ہے
شبانہ گاڑی میں سے نکل کر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی برآمدے کی محرابوں کے
پاس آ گئی۔ برآمدے کے فرش پر گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ محرابی دیواروں پر
بھی جگہ جگہ زرد گھاس اگ رہی تھی جس پراسرار خوشبو نے شبانہ کو وہاں گاڑی

روک کر انہوں نے پر مجبور کر دیا تھا وہ برآمدے میں پھیلی ہوئی تھی۔ برآمدے کے سامنے ایک چھپر کے نیچے قدیم زمانے کی دو نشستوں والی گرد آلود پرانی بگھی کھڑی تھی جس کے پہیے مٹی میں دھنس رہے تھے۔ پراسرار خوشبو برآمدے کے مشرقی کونے کی جانب سے آ رہی تھی۔

شبانہ نے برآمدے کے فرش کو غور سے دیکھا۔ اس پر کسی انسانی قدموں کے نشان نہیں تھے۔ شبانہ کونے کی طرف بڑھی۔ فرش کی گرد پر اس کے قدموں کے نشان پڑتے جا رہے تھے۔ وہ پراسرار خوشبو کے تعاقب میں آگے بڑھ رہی تھی۔ ایک جگہ خوشبو گہری ہو گئی۔ شبانہ نے دائیں جانب دیکھا یہاں رنگ برنگے شیشوں والا ایک دروازہ تھا جو ذرا سا کھلا تھا۔ خوشبو اس دروازے سے اندر سے آ رہی تھی۔

شبانہ نے غور سے اپنے دائیں بائیں دیکھا۔۔۔ آسمان پر بادل گھرے ہو رہے تھے۔ اس کی موٹر شیشم کے درختوں میں کھڑی تھی۔ ایک درخت پر فاختہ بول رہی تھی۔ نہیں یہ خواب نہیں ہے۔ شبانہ نے اپنے آپ سے کہا اور ادھ کھلے کیواڑ میں سے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اندر جھانک کر دیکھا پہلے تو اسے کمرے میں کچھ نظر نہ آیا شاید ایسا ہی مہر بہ لب اندھیرا بابل و نینوا کے اجاڑ کھنڈروں میں چھپا رہتا ہوگا۔

کمرے کی چھت کے قریب ایک چھوٹا سا روشندان تھا جس کے نیلے شیشے کے ٹکڑے میں سے باہر کی روشنی کی کرنیں نیلے غبار کی طرح کمرے میں اتر رہی تھیں۔ شبانہ کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ ہزاروں برس پہلے ماضی کے زمانے میں آ گئی ہے۔ پراسرار خوشبو جو اسے یہاں تک کھینچ لائی تھی اس کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔

وہ کمرے میں داخل ہو گئی۔ فرش پر نہ معلوم کس رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا۔ پراسرار خوشبو۔۔۔ یعنی وہی پائپ کے تمباکو کی خوشبو نیم روشن فضا میں رچی

ہوئی تھی۔ اب اسے اندھیرے میں چیزوں کے خاکے ابھرتے نظر آئے۔ ایک گول میز ٹھنڈے بڑے آتشدان کے پاس رکھی تھی۔ میز پر کوئی گلدان قسم کی شے پڑی تھی۔ شبانہ میز کے قریب گئی تو اس نے روشندان سے آتی ہلکی نیلی روشنی میں دیکھا چھوٹی گول میز پر گرد کی ہلکی تہہ جمی ہوئی ہے۔ درمیان پر سیاہ رنگ کا چھوٹا گلدان پڑا ہے جس میں گلاب کا سرخ پھول سجا ہے۔ شبانہ نے اپنی نازک انگلیوں سے گلاب کے پھول کی ریشمی پنکھڑیوں کو چھوا تو اسے پائپ کے تمباکو کی خوشبو اپنے بالکل قریب محسوس ہوئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا ادھ کھلے دروازے میں اسے راحیل دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں پائپ تھا اور کمرے کی نیم روشنی میں اس کا چہرہ پوری طرح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کا دل جیسے کسی نے اپنی گرم مٹھی میں لے لیا۔ پراسرار راحیل اس کی طرف بڑھا وہ مسکرا رہا تھا اور اس کے سفید ہموار دانت موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔

اب شبانہ کو اس کا یونانی ناک اور کنپٹیوں کے ہلکے ہلکے سفید بال صاف نظر آ رہے تھے۔ اس نے شبانہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور سامنے والی دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گہری آواز میں بولا۔

”اس طرف ایک دروازہ ہے جو نیلے انگوروں کے باغ میں کھلتا ہے ۔۔۔۔ میرے ساتھ آؤ۔“

شبانہ پر جیسے اس کی شخصیت نے ایک طلسم طاری کر دیا تھا۔ وہ کمرے کی دھندلی فضا میں اس کے ساتھ سامنے والی دیوار کی طرف بڑھی۔ وہ حیران تھی کہ اس کمرے میں کوئی اور دروازہ بھی ہے۔ راحیل نے دیوار میں بنا ہوا چھوٹا سا دروازہ کھول دیا۔

کمرے میں باہر کی روشنی آئی تو شبانہ نے دیکھا کہ اس کے سامنے یوکلپٹس کے درختوں کا ایک باغ ہے جس کے وسط میں لکڑی کے کھمبوں پر نیلے انگور کی بیل نے اوپر ایک چھت سی ڈال دی ہے۔ چوڑے پتوں کے درمیان میں نیلے

انگوروں کے کتنے ہی گچھے عقیق و جواہر کی طرح لٹک رہے تھے۔ اس چھت کے نیچے لکڑی کی ایک پرانی میز پڑی تھی جس پر نیلے پھولوں والا چینی کا ایک پرانا گلدان رکھا تھا۔ میز کے پاس بانس کی دو کرسیاں بچھی تھیں۔ آسمان پر بہار کے بادل اسی طرح چھائے ہوئے تھے۔ قریب ہی چھوٹی سی نہر بہہ رہی تھی۔ شبانہ نے کنکھیوں سے پراسرار راحیل کو دیکھا۔۔۔ اس نے گہرے رنگ کی پتلون کے اوپر قرمزی رنگ کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ کلائی پر چوکور ڈائل والی سنہری گھڑی بندھی تھی اس کے یونانی ناک اور گہری آنکھوں والے چہرے پر ساحل کا رتھ جیسے پر جلا وطن کیے گئے شہزادوں ایسی وجاہت تھی۔ اس نے شبانہ کا نازک ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ وہ انگور کی بیل کی چھت کے نیچے آ کر رک گیا۔ پھر قریب ہی بہتی نہر کی طرف دیکھ کر بولا۔

"اس نہر کا پانی ہزاروں برس سے بہہ رہا ہے۔ کبھی اس کے کنارے سنگِ مرمر کا ایک چھوٹا سا محل ہوا کرتا تھا جس کی پتھر کی جالیوں میں سے چاند کی روشنی محل کی خواب گاہ میں آیا کرتی تھی آج نہ وہ محل باقی ہے اور نہ وہ دیو داسیاں جو نشاط گاہوں میں آخرِ شب مونگرہ غنچوں اور سرخ گلابوں کے ہار گوندھتے ہوئے سو جاتی تھیں اور جن کی سانسوں سے موتیہ کی مہک آتی تھی۔ اس ندی پر انار کے درختوں کی شاخیں اپنے سرخ و سبز اناروں کو جھک کر آئینہ دکھاتی تھیں۔ وہ انار کے درخت وقت کی سیاہ آندھیوں میں گم ہو گئے۔"

راحیل جیسے وقت کے ان دیکھے چہرے سے مخاطب تھا۔ شبانہ کی نگاہیں ندی کے بہتے آئینے پر جمی تھیں جس میں اسے ان گنت چہرے، شہر، مکان، باغ، محل، اور قبرستان بنتے بگڑتے، بستے اجڑتے نظر آ رہے تھے۔ راحیل نے پلٹ کر شبانہ کی طرف دیکھا اور بانس کی سبز کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ادب سے تھوڑا سا جھک

کر بولا۔

"انگور کی بیل کے نیچے میں بہار کی ہلکی بارش میں چائے پیتا ہوں، میں جانتا تھا تم آؤ گی۔۔۔ میں تیری راہ دیکھ رہا تھا۔۔۔ بیٹھو! انگور کے نیلے گچھے نسیم کے جھرمٹ ہیں۔ سائرس شہنشاہ کے ایران میں شہزادیاں اپنے بال سیاہ انگور کے گچھوں کی طرح گوندھا کرتی تھیں۔ ایران نے یونانیوں کو مشرق کا تقدس اور شکوہ دیا تھا۔ سکندر کو ایران ہی نے غیر فانی افسانوی کردار عطا کیا۔ یہ نیلے انگور اسی عظیم اور قدیم ترین ملک ایران کے عطیات میں سے ہیں۔ میں نے تمہارے لئے گلدان میں سرخ گلاب لگا دیا تھا میں جانتا ہوں تمہیں سرخ گلاب بہت پسند ہیں۔"

شبانہ بانس کی سبز کرسی پر بیٹھی راحیل کو باتیں کرتا دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کی زبان پوری طرح سمجھ رہی تھی مگر اس کی باتیں شبانہ کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں مگر یہ باتیں اس کے جذبات کو تسکین ضرور پہنچا رہی تھیں۔ گرمیوں کی صبح کو چلنے والی شبنمی ہوا ہماری سمجھ میں نہیں آتی لیکن وہ ہماری روح کو مزید لطافت عطا کرتی ہے۔ شبانہ نے آنکھیں اٹھا کر اوپر دیکھا۔ نیلے انگور کے دو گچھے عین اس کے سر کے اوپر لٹک رہے تھے۔ راحیل مسکرایا۔

"یہ انگوروں کا نظام شمسی ہے ان انگوروں میں تمہیں سورج، عطارد مریخ، زہرہ۔۔۔ سبھی سیارگان ملیں گے۔"

شبانہ نے گوشۂ چشم سے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کو دیکھا تو راحیل نے اس کی کلائی پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔

"یہاں وقت نہیں ہے۔ تم جب میری ویران کوٹھی میں داخل ہوئی تھیں تو وقت اسی وقت ٹھہر گیا تھا۔"

راحیل نے شبانہ کی گھڑی پر سے اپنا ہاتھ اٹھا لیا شبانہ نے گھڑی پر نگاہ ڈالی تو پتہ چلا کہ گھڑی کی سیکنڈوں کی سوئی اپنی جگہ پر ساکت ہے۔ وہ خوش

ہوئی وہ نہیں چاہتی تھی کہ اتنا خوبصورت وقت گزر جائے اس نے راحیل کی طرف دیکھا اور ذرا سا مسکرا کر بولی "یہاں تمہارے لئے چائے کون بناتا ہے؟" راحیل نے کونے کی جانب ایک پرانے گول کمرے کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔

"اس کمرے میں چائے کے باغ ہیں۔ ہری بھری ڈھلانیں ہیں جن پر چائے کے سرسبز پودے جنوب مشرقی ایشیا کی مرطوب بارشوں میں مسکراتے ہیں۔"

راحیل پائپ کا نیلا دھواں اڑاتے ہوئے کونے والے گول کمرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک بوڑھا ملازم ہاتھوں میں چائے کا طشت لئے آتا دکھائی دیا۔ چائے کی چینک پیالے اور نقرئی چمچے کے ساتھ طشت میں کچھ گلاب کے سرخ پھول بھی پڑے تھے۔ راحیل نے شبانہ کے لئے خود چائے بنائی اور اس کی پلیٹ میں پیالی کے ساتھ گلاب کا ایک پھول بھی رکھ دیا۔ چائے کا ہلکا سا گھونٹ لینے کے بعد راحیل نے بیل میں لٹکتے نیلے انگوروں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میں دریائے ایراوتی کے دیش میں جا رہا ہوں تم مجھ سے ملنے آؤ گی شبانہ؟"

شبانہ نے راحیل کے یونانی پراثر حساس اور وجیہ چہرے کی طرف دیکھا اس نے محسوس کیا کہ وہ قدیم مصر و یونان کے کسی جلاوطن شہزادے کو دیکھ رہی ہے آہستہ سے بولی۔

"میں کیسے آ سکتی ہوں مجھے کوئی نہیں آنے دے گا۔"

راحیل کا پائپ بجھ گیا تھا اس نے پیالی میز پر رکھ دی ماچس جلا کر پائپ سلگایا اور بولا۔

"ایک دریا پہاڑوں سے نکل کر اپنے سمندر سے ملنے چل پڑا سمندر تک راستے میں جس نے بھی اس کا راستہ روکا وہ یا تو دریا کی تہہ میں ڈوب گیا یا اس کی لہروں میں اس کے ساتھ ہی بہہ گیا۔"

شبانہ مسکرائی۔ "میں دریا نہیں ہوں۔ میرا واسطہ حقیقت کی دنیا سے ہے۔ جہاں میری امی، ابو، بھائی، بہن رہتے ہیں اور مجھے کسی دوسرے ملک میں جانے کے لئے ان سے اجازت لینی ہوتی ہے۔"

راحیل نے پائپ کا ہلکا سا کش لگا کر کہا۔

"تم اپنی حقیقت کی دنیا میں ضرور رہو۔ تمہاری حقیقت کی دنیا تمہیں جو پہناتی ہے پہنو۔ جدھر لے جاتی ہے ادھر جاؤ اپنی امی، ابو کے پیچھے چلو۔ اور جب وہ تمہارے آگے آگے چلتے موت کی وادی میں اتر جائیں اور تم اکیلی رہ جاؤ اور اپنے پیچھے اپنے بچوں کی رہنمائی کرتے ہوئے تم بھی حقیقت کی دنیا سے پردہ پوش ہو جاؤ تو دریائے ایراوتی کے شہر میں ضرور آنا۔ میں وہاں تاڑ اور ناریل کے مرگ باغ میں تمہیں ملوں گا۔ تمہاری چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ حقیقت کی دنیا تمہاری چائے کی گرمی اور مہک اڑا رہی ہے۔"

شبانہ نے ٹھنڈی چائے کا گھونٹ پیا تو اسے کچھ ایسا احساس ہوا جیسے کوئی شبنم سی بھیگی ہوئی گھاس پر باریک ململ کا دوپٹہ ڈال دے اور شبنم اس دوپٹے کو اپنے اندر جذب کر لے۔

راحیل سے الگ ہو کر اس کے دل میں بہت سے سوال بیدار ہو جاتے۔ وہ اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی لیکن اس کے قریب بیٹھتے ہی وہ سب کچھ بھول جاتی۔ ان گنت سوال اس کے ذہن کے افق سے بادلوں کی طرح لپٹ جاتے اچانک شبانہ کو انگور کے پتوں پر بارش کے قطروں کے گرنے کی آواز سنائی دی اس نے سر اوپر اٹھا کر دیکھا۔ اس کے اوپر انگور کی بیل کی چھت پڑی تھی جس پر بارش کے قطرے گرنے لگے تھے۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ بارش کا ایک شفاف موتی انگور کے پتے سے پھسل کر شبانہ کی چائے کی پیالی میں گرا تو جل ترنگ ایسی آواز پیدا ہوئی۔ راحیل نے میز پر اپنی کہنیاں ٹکا دیں اور چائے کی پیالی پر نظریں جما کر بولا۔

"بارش کی کئی زبانیں ہیں۔ بارش کئی زبانوں میں بات کرتی ہے۔ ٹین کی ڈھلانی چھت پر اس کی زبان اور ہوتی ہے خزاں کے خشک پتوں پر وہ سسکیوں کی زبان میں بات کرتی ہے۔ چائے کی پیالی میں وہ موسیقی کی زبان میں بولتی ہے کھلے سمندروں میں سوائے سمندروں کے اس کی زبان کوئی دوسرا نہیں سمجھتا اور گیندے کے پھول سے وہ زرد زبان میں بولتی ہے۔ جانتی ہو زرد زبان کیا ہوتی ہے؟ یہ خزاں کی زبان ہے۔ درخت اسی زبان میں اپنے جھڑتے ہوئے زرد پتوں کو الوداع کہتے ہیں۔

شبانہ آہستہ سے اٹھ کھڑی ہوئی "اب میں جاؤں گی" راحیل نے اٹھ کر تعظیماً اس کی کرسی تھوڑی سی پیچھے کھینچ لی تاکہ شبانہ کو گزرنے میں آسانی ہو۔ وہ اس کے ساتھ چلنے لگا بارش . . . . بہار کی بارش کے موتی ان کے اوپر گر رہے تھے۔ "کیا تم ایراوتی کے شہر میں آؤ گی۔"

ایراوتی ایک دریا کا نام ہے جو مقدس عبادت گاہوں کے سرخ پھول اپنے ساتھ لے کر تاریک سمندر میں گرتا ہے۔ اس کے کنارے ایک شہر آباد ہے۔ اس شہر کا نام رنگون ہے۔ رنگون میں برسات کی راتیں کالی ہوتی ہیں اور جب بارش ہوتی ہے تو فضاء میں صندل، گل مہر اور کیلے کے سبز تنوں اور رجنی گندھا کے سفید پھولوں کی خوشبوئیں سانس لیتی ہیں۔ رجنی گندھا کا پھول صرف بارش کی زبان سمجھتا ہے۔ جنگل کی بارش، پاکیزہ اور بے لوث بارش!

شبانہ کمرے سے نکل کر برآمدے میں سے گزرتی ہوئی پرانی کوٹھی کے کچے لان میں آ گئی جہاں ٹاہلی کے تناور درختوں میں ہلکی بوندا باندی سرگوشیاں کر رہی تھی۔ وہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اس نے پلٹ کر کوٹھی کی طرف دیکھا۔ برآمدہ سنسان تھا۔ بارش کی آواز تیز ہونے لگی تھی۔

شبانہ نے گاڑی نکالی اور کچے راستے سے گزرتی واپس بڑی نہر پر آ گئی بارش ہو رہی تھی۔ گاڑی کی چھت پر گرتی بارش کی زبان سے شبانہ ناواقف تھی۔

اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ وہ سامنے دیکھ رہی تھی مگر اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اپنے خیالوں کو مختلف لباس میں چلتے پھرتے دیکھ رہی تھی۔ "کینال لاج" کے گیراج میں گاڑی کھڑی کرنے کے بعد وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے سنگھار میز کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے چہرے پر نظر ڈالی۔ اس کے بالوں میں بائیں جانب گلاب کا سرخ پھول لگا تھا۔ اسے کچھ یاد نہیں تھا کہ یہ پھول اس کے بالوں میں کس نے لگایا۔ گلاب کے پھول کو بالوں سے اتار کر اس نے سنگھار میز پر رکھا اور بالوں پر برش پھیرنے کے بعد نیچے سٹنگ روم میں آ گئی۔ اس کی امی بڑے تخت پر بیٹھی تھی اس نے شبانہ کی طرف دیکھا اور بولی۔

"تمہارے ابو کا فون آیا تھا۔ آج موچی دروازے والے پرانے مکان کے شیش محل میں چراغ جلاتے چلنا ہے۔ تم بھی تیار ہو جانا۔"

شبانہ "بہت اچھا امی" کہتی غزالہ کے کمرے میں چلی گئی۔ غزالہ کی طبیعت پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔ یہ پہلا دورہ تھا جس کے اثرات ابھی تک باقی تھے۔ وہ پلنگ پر لیٹی تھی اور صاف لگ رہا تھا کہ اسے سانس لینے میں کچھ دقت محسوس ہو رہی ہے۔ شبانہ نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"آپی! طبیعت ٹھیک ہے نا؟"

غزالہ مسکرا دی۔ "میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے تم تو خواہ مخواہ پریشان ہوتی ہو۔"

شبانہ نے کہا۔ "آج شام شیش محل میں چراغ جلانے جانا ہے میں تمہارے لئے خاص منت مانگوں گی۔"

غزالہ نے شبانہ کا ہاتھ تھام لیا۔ شبانہ نے محسوس کیا کہ غزالہ کا ہاتھ روئی کے گالے کی طرح نرم اور ہلکا پھلکا ہو گیا ہے۔ "شاہ پری سے کہنا غزالہ اس حالت میں حاضری نہیں دے سکتی۔ مجھے معاف کر دینا۔" شبانہ نے اپنی بیمار

بڑی بہن کا ماتھا چوم لیا۔ شام ابھی ہوئی نہیں تھی کہ شبانہ کے ابو اور عقیل آ گئے موچی دروازے والے پرانے مکان کے شیش محل میں جانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ابو گلاب کے ہاروں کی ٹوکری، سفید مکھانے اور مالٹوں کی دو بھری ہوئی ٹوکریاں اپنے ساتھ لائے تھے۔

بڑا بھائی عامر اپنے کالج کے دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے گیا ہوا تھا۔ عقیل اس قسم کی باتوں کو نہیں مانتا ہے اس لئے وہ موچی دروازے والے شیش محل میں شاذ و نادر ہی جاتا تھا۔ شبانہ کی امی اور ابو تو ہر جمعرات کو چراغ جلانے پرانے گھر کے شیش محل میں جا کر چراغ جلا آتے تھے۔ مہینے کی آخری جمعرات کو وہ پھل اور مکھانے لے کر جاتے اور بچوں میں بانٹتے۔ آج بھی مہینے کی آخری جمعرات تھی۔ موچی دروازے والے پرانے حویلی نما مکان میں یہ شیش محل شبانہ کی دادی نے اپنی شادی کے بعد بنوایا تھا۔ یہ شیش محل ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی جس کی دیواروں پر چھوٹے چھوٹے چوکور شیشے لگا دیئے گئے تھے۔ درمیان میں میز پر گلدان میں موسم کے پھول ہر جمعرات کو سجا دیئے جاتے تھے۔

کارنس پر مٹی کے چھوٹے چھوٹے پیالے رکھے ہوئے تھے جن میں جمعرات کو موم بتیاں روشن کی جاتی تھیں۔ دو رکابیوں میں گندھا ہوا آٹا بھر کر اس میں اگربتیاں سلگا کر لگا دی جاتی تھیں۔ پھر امی اور ابو وہاں بیٹھ کر قرآنی آیات کا ورد کرتے اور کوٹھڑی کا دروازہ بند کر کے واپس چل دیتے۔ اس کوٹھڑی پر کبھی تالا نہیں ڈالا گیا تھا۔ موچی دروازے والے اس پرانے جہازی مکان میں صرف ایک نوکر ہی رہتا تھا جو مکان کی چوکیداری بھی کرتا تھا۔ اس شیش محل میں کوئی ہوائی مخلوق رہتی تھی جن کی باقاعدہ وہاں شادیاں ہوتی تھیں۔ بڑی سیڑھی چڑھ کر ڈیوڑھی آتی تھی۔ اس اندھیری ڈیوڑھی میں بائیں جانب شیش محل کی کوٹھڑی کا دروازہ تھا۔ شبانہ اس ہوائی مخلوق کی قائل تھی۔ اس نے خود اپنے کانوں سے اس اندھیری سیڑھیوں پر پائل کی چھن چھن سنی تھی جیسے کوئی عورت تیزی سے سیڑھیاں اترتی

ہو اس نے اس نظر نہ آنے والی مخلوق کے قہقہوں اور باتیں کرنے کی آوازیں بھی کئی بار سنی تھیں۔ ایک بار جب وہ اسکول میں پڑھتی تھی اور اپنی دادی سے ملنے پرانے مکان میں آئی ہوئی تھی تو وہ سیڑھیاں اتر رہی تھی کہ اچانک اس کے سامنے ایک انتہائی خوبصورت نورانی چہرے والی لڑکی آ گئی جس کے شاندار لباس میں سے ملکوتی خوشبو اٹھ رہی تھی۔

شبانہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ لڑکی نے مسکرا کر شبانہ کی طرف دیکھا اور تیزی سے اس کے قریب سے ہو کر سیڑھیاں چڑھ گئی۔ اس شیش محل میں اس ہوائی مخلوق کی شادیاں بھی ہوتی تھیں۔ دادی اماں کہا کرتی تھیں کہ ایک بار وہ اگربتیاں سلگانے شیش محل میں داخل ہوئی تو کیا دیکھتی ہے کہ فرش پر قالین بچھا ہے۔ کچھ عورتیں ایک سجی سجائی دلہن کو لئے بیٹھی مسکرا رہی تھیں دادی اماں نے انہیں سلام کیا۔ اگربتیاں رکابی میں سلگائیں اور الٹے قدموں واپس چلی گئی۔ اس ہوائی مخلوق نے گھر والوں کے کسی معاملے میں کبھی دخل نہیں دیا تھا۔ کبھی کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ سال دو سال میں کبھی کبھار ہی وہ خاندان کے کسی فرد کے سامنے ظاہر ہوتے تھے۔

ویسے ان کے سیڑھیاں اترنے، چلنے پھرنے اور کبھی کبھی عورتوں کے ہلکے ہلکے قہقہوں کی آوازیں ضرور سنائی دے جاتی تھیں۔ دادی اماں ایک بھائی کی وفات کے بعد شبانہ کی فیملی کینال بینک والی کوٹھی میں اٹھ آئی۔ اس کوٹھی میں شبانہ کی پیدائش ہوئی۔ دادی اماں موچی دروازے والے پرانے مکان میں ہی رہیں۔ ان کی خدمت گزاری کے لئے دو عورتیں رکھ دی گئی تھیں۔ دن میں ایک بار شبانہ اپنی والدہ کے ساتھ دادی اماں سے ملنے موچی دروازے والے مکان میں ضرور جاتی۔ پھر دادی اماں بھی انتقال کر گئی اور موچی دروازے والا پرانا حویلی نما مکان ویران ہو گیا اور اس کی دیکھ بھال کے لئے ایک چوکیدار رکھ دیا گیا۔

اب صرف جمعرات کی جمعرات شیش محل میں چراغ جلانے کے لئے یہ لوگ وہاں جاتے تھے۔ آج بھی اس مقصد کے لئے یہ کنبہ موچی دروازے جا رہا تھا۔ شبانہ نے سادہ لباس پہن کر دوپٹے سے سر ڈھانپ لیا تھا۔ اس نے اپنے طور پر جلانے کے لئے کچھ موم بتیاں بھی ساتھ رکھ لی تھیں۔ ابھی سورج غروب ہوا ہی تھا کہ یہ لوگ گاڑی میں بیٹھ کر موچی دروازے کی طرف روانہ ہو گئے۔

شبانہ کا کچھ بچپن موچی دروازے کی گلیوں میں بھی گزرا تھا۔ اگرچہ وہ کینال بینک والی کوٹھی کینال لاج میں پیدا ہوئی تھی۔ مگر اس کے بیشتر رشتے دار موچی دروازے کے اندر ہی رہتے تھے اور وہ اکثر وہاں جاتے رہتے تھے۔

شبانہ کو لاہور شہر کی پراسرار نیم روشن، نیم چھتی ہوئی گلیاں بڑی اچھی لگتی تھیں ان کے اپنے مکان میں ایک سہ دری گلی کی طرف نکلی ہوئی تھی۔ جس کے روشندانوں میں رنگ برنگے شیشے لگے تھے اس سہ دری پر پرانی چک پڑی رہتی۔ شبانہ یہاں بیٹھ کر ان کبوتروں کو دانہ دنکا چنتے دیکھا کرتی جنہوں نے سامنے والی مکان کی دیوار کے اندر گھونسلہ بنا رکھا تھا۔

شبانہ اپنی امی جان اور ابو کے ساتھ موچی دروازے کے بازار میں داخل ہوئی تو شفاف آنکھوں اور سفید مونچھوں والے پوکیرے چچا گامی نے انہیں سلام کیا۔ شبانہ کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر دعا دی اور ابو سے کہا۔

"خواجہ صاحب موتیے کے ہار میں نے الگ نکال کر رکھ لئے تھے۔" پھر چچا گامی نے موتیے کے ہاروں سے بھری ہوئی ٹوکری نکال کر دی جس پر ململ کا رومال گیلا کر کے ڈالا ہوا تھا۔ موچی دروازے والے مکان میں چوکیدار نے صفائی کروا رکھی تھی۔ بڑے کمرے کے پرانے صوفوں کی گرد بھی جھاڑ دی گئی تھی۔ امی ابو نے منہ ہاتھ دھو کر وہیں ٹھنڈے پانی سے وضو کیا اور پھولوں کے ہار لے کر شیش محل والی کوٹھڑی کی طرف بڑھے۔

شبانہ بھی موتیے کے ہار ہاتھوں میں تھامے ان کے پیچھے پیچھے تھی شیش محل

میں موم بتیاں روشن ہوئیں تو دیواروں پر لگے آئینوں کی وجہ سے کوٹھڑی جگ مگ کرنے لگی۔ رکابیوں میں اگربتیاں سلگا دی گئیں۔ گلدان میں گلاب کے تازہ پھول سجائے گئے۔ شبانہ کارنس پر روشن اگربتیوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے ایسے لگا جیسے کوئی گوٹہ لگے کیسری لباس اور نورانی چہرے والی لڑکی اس کے سامنے سے مسکراتی ہوئی گزر گئی۔

○

شبانہ نے شیش محل میں آیات قرآنی پڑھنے کے بعد اپنی بڑی بہن غزالہ کے لئے دعا مانگی۔ یہ دعا شبانہ نے خدا سے مانگی تھی۔ اگرچہ بچپن ہی سے شبانہ کے ذہن میں گھر کے ماحول نے یہ خیال جاگزیں کر دیا تھا کہ شیش محل کی ہوائی مخلوق زندہ ہے اور زندہ انسانوں کی طرح ان کے ہاں بھی شادی بیاہ ہوتے ہیں مگر شبانہ نے کبھی ان سے کچھ نہیں مانگا تھا۔ وہ جب بھی شیش محل میں جا کر دعا مانگتی تو اس کے ذہن میں سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے اور کسی کا خیال نہیں ہوتا تھا وہ جانتی تھی کہ جن و انس بھی اللہ تعالیٰ ہی کی ایک مخلوق ہے جو اللہ ہی کے زیر فرمان ہے اور دعا صرف اللہ ہی سے مانگنی چاہیئے کیونکہ اللہ ہی دعا سننے اور اسے شرف قبولیت بخشنے والا ہے۔

شبانہ کو شیش محل کا گلاب موتیے اور اگربتیوں کی خوشبوؤں سے مہکا ہوا ماحول بہت پسند تھا اور اس ماحول میں وہ اپنے آپ کو خدا کے زیادہ قریب محسوس کرتی تھی۔

شیش محل سے باہر نکل کر شبانہ کی امی اور ابو نے محلے میں پھل اور مٹھائی تقسیم کئے چوکیدار کو روپے دیئے رات ہو چکی تھی جب یہ لوگ گاڑی میں بیٹھ کر کینال بینک والی کوٹھی میں واپس آئے۔ شبانہ نے غزالہ کے گلے میں بھی موتیے کا ہار ڈالا اور اسے کہا۔

"آپی! میں نے خدا سے تمہارے لئے بڑی دعا مانگی ہے۔ اب تم بالکل اچھی ہو جاؤ گی"، غزالہ کے چہرے پر ایک اداس مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور منہ ہی منہ میں اللہ کے پاک ناموں کا ورد کرنے لگی۔

غزالہ ہمیشہ آنکھیں بند کر کے اللہ کے مقدس اسماء کا ورد کیا کرتی تھی۔ لیکن اللہ کے نظام میں کون دخل دے سکتا ہے جو بیماری غزالہ کو لگی تھی اس نے اندر ہی اندر اسے کھوکھلا کر دیا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس پر پڑنے والے دورے شدید ہو گئے اور کوہ مری سے واپس آنے کے چار ماہ بعد غزالہ کو آخری دورا پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا۔

غزالہ کی موت نے کینال لاج میں کہرام بپا کر دیا۔ شبانہ پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ اگر اس کی سہیلی نجمی خود رو کر اسے نہ رلاتی تو شبانہ کا زندہ بچنا بھی محال لگتا تھا۔ کئی روز تک گھر پر سوگ کی کیفیت طاری رہی۔ شبانہ کی پیاری بہن ہی نہیں بلکہ اس کی پیاری سہیلی اس کا غم کھانے والی اس کے دل کو سمجھنے والی غزالہ اس سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی تھی۔

عامر کو بہت صدمہ ہوا تھا۔ امی بھی اس صدمے سے نڈھال ہو گئی تھیں۔ شبانہ کے ابو اور بڑے بھائی عقیل نے تھوڑے دن غزالہ کا سوگ کیا پھر اپنے کاروبار میں مصروف ہو گئے۔

امی اور شبانہ ہر روز شام کو غزالہ کی قبر پر موم بتیاں جلاتے اگر بتیاں سلگا اور فاتحہ پڑھتے جاتیں۔ چالیسویں پر شہر کے سبھی رشتے دار موجود تھے۔ چالیسویں کے بعد شبانہ جمعرات کو غزالہ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جاتی۔ امی جان پر جوڑوں کے درد نے حملہ کر دیا۔ شبانہ انہیں بڑی مشکل سے گاڑی میں بٹھا کر قبرستان لے جاتی تھی۔ غزالہ کی وفات کو دوسرا مہینہ جا رہا تھا کہ ایک دن شبانہ کی امی پر فالج کا شدید حملہ ہوا اور وہ تین روز بے حس و حرکت پڑے رہنے کے بعد اپنی بیٹی غزالہ کے پاس پہنچ گئیں۔ چار پانچ مہینوں کے اندر اندر "کینال لاج" جیسے ویران ہو کر

رہ گیا۔ شبانہ پہلے بڑی بہن اور پھر اپنی پیاری امی کے صدمے سے بے حال ہو کر ایسی بیمار ہوئی کہ اس کے بھائیوں اور ابو کو اس کی جان کے بھی لالے پڑ گئے۔ اسے پرائیویٹ ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا جہاں اس کی پیاری سہیلی نجمی دن رات اس کی خدمت کرتی رہی۔

ایک ہفتے بعد شبانہ کی طبیعت بحال ہونا شروع ہو گئی۔ وہ بہت کمزور ہو گئی تھی۔ اب اسے حوصلہ دینے والا سوائے نجمی کے اور کوئی نہیں تھا۔ چھوٹا بھائی عامر اس کا ضرور خیال رکھتا تھا مگر وہ نوجوان تھا۔ اس کا زیادہ وقت کالج کے دوستوں کے ساتھ گزرتا۔ بڑا بھائی عقیل اور ابو اپنے ٹھیکیداری کے کاموں میں الجھے رہتے۔

شبانہ نے خود ہی حوصلہ کیا اور غم کے جو پہاڑ اس پر ٹوٹ پڑے تھے ان کے بوجھ تلے سے نکلنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس دوران پراسرار راحیل سے بھی اس کی ملاقات نہیں ہوئی تھی اسے اتنی فرصت ہی نہیں ملی تھی کہ وہ کینال بینک کے نہر والے پرانے مکان میں جاتی اور یہ معلوم کرتی کہ راحیل وہاں پر موجود ہے کہ نہیں۔ والدہ کی وفات سے پہلے دو ایک بار وہ نجمی کے ساتھ پبلک لائبریری میں ضرور گئی تھی۔ اس خیال سے کہ شاید وہاں راحیل سے اچانک ملاقات ہو جائے اور وہ اسے اپنی بہن کی وفات کا بتائے۔ مگر راحیل اسے لائبریری میں بھی کہیں نظر نہ آیا۔

پھر والدہ بھی اللہ کو پیاری ہو گئی اور شبانہ بیمار ہو کر ہسپتال میں داخل ہو گئی نجمی دن میں دو بار اس کے پاس ہسپتال آتی تھی۔ کالج کی دوسری سہیلیاں بھی شبانہ کا دل بہلاتے آ جاتی تھیں۔ امتحان قریب آ گئے۔ شبانہ پوری طرح سے صحت مند نہیں ہوئی تھی مگر وہ بی اے کے امتحان میں ضرور بیٹھنا چاہتی تھی۔ امتحان شروع ہو گئے۔ شبانہ نے پورے پرچے دے دیئے۔ تین مہینے بعد نتیجہ نکلا تو شبانہ دوسری پوزیشن لے کر پاس ہو گئی تھی۔

اس نے یونیورسٹی میں داخلے کی درخواست دی تو ایک روز ابو نے اسے بلا کر کہا "بیٹی مزید تعلیم حاصل کرنے سے کیا فائدہ ہوگا۔ نوکری تو تمہیں کرنی نہیں میں چاہتا ہوں کہ اب تم اپنا گھر بسانے کے بارے میں سوچو۔ یہاں تمہاری خبر گیری کرنے والی نہ تمہاری بہن رہی اور نہ تمہاری والدہ ہی سلامت رہی۔ ہمیں اپنے کاروبار سے فرصت نہیں ملتی۔

عامر کو تو میں اسی برس ظفر کے پاس امریکہ بھجوا رہا ہوں۔ وہ خود بھی امریکہ جا کر ہی پڑھنا چاہتا ہے۔ شبانہ نے جواب میں صرف اتنا کہا کہ وہ ابھی شادی کے بارے میں نہیں سوچ سکتی۔ وہ انگریزی میں ایم اے کرنے کے بعد ہی کچھ کہہ سکے گی۔ ابو خاموش ہو گئے۔

شبانہ واپس اپنے کمرے میں آگئی۔ بستر پر لیٹ کر اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ اسے غزالہ اور امی جان یاد آگئیں اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کافی دیر تک رونے کے بعد جب اس کے دل کا غبار ہلکا ہوا تو اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ گاڑی نکالی اور نہر کے ساتھ ساتھ شمال کی طرف چل دی۔

غزالہ اور امی جان کی وفات پر امریکہ سے شبانہ کا منگیتر ظفر لاہور نہیں آیا تھا مگر اس نے ٹیلیفون پر ابو اور بڑے بھائی عقیل سے اپنے غم کا بار بار اظہار کیا اور معذرت پیش کی تھی کہ بعض کاروباری مجبوریوں کی وجہ سے وہ امریکہ نہیں چھوڑ سکتا۔

ابو کو ظفر کا کچھ زیادہ ہی خیال رہتا تھا انہوں نے ظفر کو ہدایت کی کہ جو اللہ کو منظور تھا وہ ہو گیا۔ اب اسے اپنے کاروبار کی طرف زیادہ دھیان دینا چاہیئے۔ خود شبانہ کے ابو جان اور بھائی جان عقیل کو بھی دن رات کاروبار ہی کی فکر پڑی رہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ غزالہ اور امی کے انتقال کے بعد شبانہ اتنی بڑی کوٹھی میں خود کو تنہا محسوس کرنے لگی تھی۔ ان ہی خیالوں میں الجھی شبانہ گاڑی کو کینال بینک والی نہر کے کچے راستے پر شمال کی طرف لیئے جا رہی تھی۔

اکتوبر کی آخری تاریخیں تھیں پنجاب میں یہ خزاں کا موسم ہوتا ہے۔ سفیدے کے درختوں کے پتے اسی موسم میں گرتے ہیں۔ نہر کی کچی سڑک پاپولر کے سوکھے پتوں سے بھری ہوئی تھی۔ درختوں کی شاخوں پر جو زرد پتے لگے رہ گئے تھے وہ ہوا کے جھونکے سے ٹوٹ کر چکراتے ہوئے نیچے گر پڑتے تھے۔

شیشم کے درختوں پر پتوں نے ابھی گرنا شروع نہیں کیا تھا۔ پنجاب میں شیشم کے درختوں کے پتے نومبر دسمبر میں گرنا شروع ہوتے ہیں۔ شہتوت کے پیڑوں کی شاخیں بھی ننگی ہو گئی تھیں۔ نہر میں پانی کناروں سے بہت نیچے ہو کر بہہ رہا تھا پانی کا رنگ سبزی مائل ہو رہا تھا۔ موسم میں ہلکی ہلکی خنکی آگئی تھی۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ مئی جون جولائی اور اگست میں جو گرمی پڑی تھی لاہور کے لوگوں کو اس سے نجات مل چکی تھی۔ رات کو سردی ہو چکی تھی اور کمبل اوڑھ کر سونا پڑتا تھا دن میں دھوپ ناگوار نہیں لگتی تھی پے در پے صدموں اور بیماری کی وجہ سے شبانہ کا چہرہ کمزور پڑ گیا تھا۔

نجمی نے بھی بی اے کلیئر کر لیا تھا اور شبانہ کے ساتھ ہی اس نے بھی یونیورسٹی میں ایم اے انگریزی کے لئے فارم بھر کر جمع کرا دیا تھا۔ غزالہ اور امی جان کی وفات کے بعد شبانہ کو نجمی کی دوستی اور بے لوث محبت کا زیادہ احساس ہونے لگا تھا۔ پہلے وہ نجمی سے جو کبھی کبھی بے اعتنائی برت لیتی تھی اب اس نے اس عادت کو ترک کر دیا تھا۔ وہ نجمی کا پہلے سے زیادہ خیال رکھتی تھی لیکن ابھی تک شبانہ نے اسے راحیل کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ یہ راز شبانہ کے دل میں ابھی تک محفوظ تھا اگرچہ وہ چاہتی تھی کہ نجمی کو اس راز میں شریک کرے۔ آخر اس کی ایک ہی تو سہیلی تھی۔

گاڑی نہر کے اس مقام پر پہنچ گئی جہاں سے ایک چھوٹی سی نہر نکل کر ٹاہلیوں میں گھری ہوئی پرانی کوٹھی کی طرف جاتی تھی۔ شبانہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس چھوٹی نہر کے کنارے کنارے گاڑی لئے بڑھی۔ پرانی شکستہ کوٹھی

ویسے ہی ویران اور سنسان تھی۔ برآمدے کے فرش پر گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی وہ برآمدے سے گزر کر دروازے کی طرف بڑھی لیکن یہ دیکھ کر ٹھٹک کر رہ گئی کہ دروازے پر تالا پڑا تھا اسے وہاں سے پائپ کے تمباکو کی خوشبو بھی نہیں آ رہی تھی کہیں کسی جگہ اسے گلاب کا کوئی پھول بھی گرا ہوا دکھائی نہ دیا یہ بوسیدہ پرانی کوٹھی گولائی کی شکل میں بنی ہوئی تھی۔

شبانہ اس کی دوسری جانب گئی کہ ادھر ہی انگور کا باغ تھا مگر اسے وہ باغ کہیں دکھائی نہ دیا جہاں انگور کی بیل کی چھت کے نیچے میز پر بیٹھ کر اس نے راحیل کے ساتھ چائے پی تھی وہ چھوٹی سی نہر بھی یہاں نہیں تھی جس کے کنارے کبھی سنگ مرمر کا کوئی محل ہوا کرتا تھا۔ کچھ فاصلے پر ٹاہلیوں کے نیچے وہ نہر ضرور بہہ رہی تھی جو بڑی نہر سے نکل کر ادھر کھیتوں میں سے گزرتی تھی۔

شبانہ کوٹھی کے پچھے لان کی طرف واپس آ گئی یہاں شہتوت کے جو چند ایک درخت تھے ان کے پتے جھڑنے کے بعد کچے صحن میں بکھرے ہوئے تھے ٹاہلیوں کے پتے ابھی اپنی شاخوں پر ہی لگے خزاں کی بارش کا انتظار کر رہے تھے۔ کب خزاں کی پہلی بارش ہو اور درختوں کے پتے گرنا شروع ہو جائیں۔ ایک جانب چھپر کے نیچے پرانی زنگ خوردہ بگھی ویسے ہی پڑی تھی۔ کوئی نوکر یا چوکیدار بھی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

شبانہ گاڑی میں بیٹھ کر واپس روانہ ہو گئی وقت گزرتا چلا گیا۔ شبانہ اور نجمی کو یونیورسٹی میں ایم اے انگریزی میں داخلہ مل گیا۔ شبانہ نے ساری توجہ اپنی پڑھائی کی طرف مبذول کر دی کبھی کبھی اسے راحیل کا ضرور خیال آتا اس سے ملے ایک عرصہ گزر گیا تھا اس نے کہا تھا میں دریائے ایراوتی کے شہر رنگون جا رہا ہوں۔ کیا تم مجھے وہاں ملنے آؤ گی؟ ضرور وہ رنگون جا چکا ہے شبانہ یہ سوچ کر خاموش ہو رہتی۔ سردیاں گزر رہی تھیں کہ ابو نے شبانہ کے بڑے بھائی عقیل کی شادی کر دی۔

شادی اپنے پرانے رشتہ داروں میں ہی ہوئی جو رنگ محل میں رہتے تھے۔ شبانہ بھابھی کو جانتی تھی شادی بڑے سادہ طریقے سے ہوئی۔ بھابھی کے آنے سے "کینال لاج" والے گھر کی رونق کسی حد تک واپس آ گئی۔ بھابھی کا نام نجمہ تھا نجمہ زیادہ پڑھی لکھی خاتون نہیں تھی۔ خاص اندرون شہر رہنے والی لڑکی تھی۔ اسے لباس گہنے زیور اور کھانے پکانے کا بہت شوق تھا۔ آتے ہی اس نے خانساماں اور نوکرانی کو اپنے کنٹرول میں لے لیا۔

شبانہ کو بڑی خوشی ہوئی کیونکہ اب کھانے وغیرہ کا سارا انتظام بھابھی نجمہ کے ذمے تھا شبانہ پوری یکسوئی سے اپنی پڑھائی کر سکتی تھی نجمہ بھابھی ویسے بھی بڑی ہنس مکھ اور سیدھے سبھاؤ کی تھی۔ عقیل بھائی اس سے بہت خوش تھے۔ روپے پیسے کے معاملے میں انہوں نے نجمہ کو پورا اختیار دے رکھا تھا۔

شبانہ ہر جمعرات کو اپنی امی اور بہن غزالہ کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے اور پھول چڑھانے ضرور جاتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ اپنی والدہ کی دوسری روایت کو بھی نبھانے کی پوری کوشش کرتی۔

مہینے کی آخری جمعرات کو ابو کے ساتھ موچی دروازے والے اپنے پرانے مکان کے شنیش محل میں دیا جلانے اور پھول چڑھانے ضرور جاتی تھی شبانہ کی امی جان نے اپنی موت سے کچھ روز پہلے اپنے خاوند اور شبانہ کے ابو کو اپنی آخری خواہش ان الفاظ میں بیان کی تھی کہ میری موت کے بعد شنیش محل والے پرانے مکان کو ہرگز فروخت نہ کرنا۔ نہیں تو میری روح کو بہت تکلیف پہنچے گی شبانہ کے ابو نے اپنی بیمار اور زندگی کے دکھ سکھ کی ساتھی بیوی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے یقین دلایا تھا کہ وہ موچی دروازے والا مکان کبھی فروخت نہیں کریں گے اور شنیش محل میں ہر جمعرات کو دیا بتی جلتی رہے گی مگر شبانہ کے ابو ہر جمعرات اب شنیش محل خود نہیں جاتے تھے بلکہ چوکیدار کو کہہ دیا تھا کہ وہ جمعرات کی جمعرات شنیش محل میں اگربتیاں سلگا کر دیا بتی

جلا دیا کرے۔ خود صرف مہینے کی آخری جمعرات کو شیش محل جاتے تھے جب
شبانہ بھی ان کے ساتھ ہوتی تھی۔ عقیل بھائی کی شادی کے بعد اچانک امریکہ سے
شبانہ کا منگیتر ظفر لاہور آگیا۔

شبانہ کی پھوپھی کے ساتھ وہ غزالہ اور شبانہ کی امی کا افسوس کرنے
کینال بینک والی کوٹھی آیا۔ عجیب کاؤبوائے والا لباس پہن رکھا تھا اس نے
شبانہ گھر پر ہی تھی۔ ظفر کو غزالہ اور امی کی موت کا کیا افسوس ہو سکتا تھا۔ بس
جان بوجھ کر اداس شکل بنائے شبانہ کے ابو اور عقیل بھائی کے پاس بیٹھا افسوس
کرتا رہا۔ پھر وہ پھوپھی اور ابو کے ساتھ قبرستان چلا گیا واپس آکر شبانہ کے پاس آکر
بولا۔ "آئی ایم سوری شبانہ! میں تار ملتے ہی آجاتا مگر کچھ ایسی پرابلمز میں پھنسا تھا کہ نہ
. . . آسکا۔ آپ کا مجھے بہت افسوس ہوا تھا۔"

شبانہ نے بھی دو ایک رسمی سے جواب دیئے اور یہ کہہ کر بھابھی نجمہ کے کمرے
میں چلی گئی کہ بھابھی نے اسے بلایا ہے۔ ظفر بھی نیچے چلا گیا تھوڑی دیر بعد عقیل بھائی کے
کمرے . . . سے اس کے منہ پھاڑ کر ہنسنے کی بے ہنگم آواز آئی تو شبانہ کو بہت برا لگا
ظفر پندرہ دنوں کے لئے آیا تھا رات کو وہ اپنے رنگ محل والے مکان پر سوتا اور
دن بھر کینال بینک والی کوٹھی میں منڈلاتا رہتا۔

شبانہ بارہ بجے کے بعد یونیورسٹی سے واپس آتی تو ظفر عجیب عجیب لباس میں
اس کا منتظر ہوتا چونکہ شبانہ کے ابو اور بھائی عقیل نے ظفر کو بہت منہ لگا رکھا تھا
اس لئے وہ شبانہ سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا اس کے رویے
میں . . کچھ کچھ اہانت کا پہلو بھی جھلکنے لگا تھا جیسے وہ شبانہ کو اپنے زیر دام سمجھ رہا
ہو شبانہ بھی اس کی ذرا پروا نہیں کرتی تھی مگر اندر سے وہ ایک طرح کا خوف سا
محسوس کرنے لگی تھی حقیقت یہ تھی کہ غزالہ اور امی کی موت کے بعد وہ اپنے آپ
کو بے یار و مددگار سمجھنے لگی تھی وہ جانتی تھی کہ اب اس خاندان میں ایسا کوئی شخص
نہیں ہے جو اس کے دل کو سمجھ سکے اور مصیبت کے وقت اس کی حمایت کر سکے۔

ظفر کی ماں نے شبانہ کے ابو سے ایک بار پھر بیاہ کی بات چھیڑ دی اور کہا کہ
بچی کو آگے پڑھا کر کیا کر لو گے ظفر آیا ہوا ہے چار کلمے پڑھا کر اسے ساتھ ہی امریکہ
بھیج دو اس بار شبانہ کے ابو نے اپنی بہو نجمہ کے ذریعے شبانہ کا عندیہ معلوم کیا تو شبانہ
نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا میں جب تک اپنی پڑھائی مکمل نہ کر لوں شادی کے
متعلق سوچ بھی نہیں سکتی پھر اس نے نجمہ بھابھی کا ہاتھ پکڑ لیا اور منت کے انداز میں
کہا بھابھی! تم عقیل بھائی جان کو سمجھاؤ کہ میری شادی یہاں نہ کریں میں ظفر کے ساتھ
خوش نہیں رہ سکوں گی۔

بھابھی نجمہ ایک عام لڑکی تھی اس نے شبانہ کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ "اری امریکہ
جا کر عیش کرے گی وہاں ایسی ایسی وائل اور ریشنر کی چادریں ملتی ہیں کہ سارا انارکلی بازار
چھان مارو کبھی نہیں ملیں گی میں تو خود سوچ رہی ہوں کہ عقیل سے کہوں۔ یہاں کا کام
سمیٹو اور امریکہ چلے چلو کہتے ہیں وہاں سونا بھی سستا ہے۔"

شبانہ ٹھنڈا سانس بھر کر رہ گئی ایک روز شبانہ یونیورسٹی کیمپس کے لان میں
نجمی کے ساتھ بیٹھی کافی پی رہی تھی کہ نجمی نے شبانہ کو کہنی مار کر کہا۔ "یہ لو وہ یہاں بھی
آگیا ہے۔"

شبانہ نے سر گھما کر دیکھا ظفر سرخ رنگ کی ٹیوٹا گاڑی سے باہر نکل رہا تھا اس
نے دور ہی سے شبانہ کو ہاتھ اٹھا کر امریکی طرز میں سلام کیا نجمی کو معلوم تھا کہ شبانہ
ظفر سے بیاہ نہیں کرنا چاہتی کیونکہ ان دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا
شبانہ ایک آئیڈیل پرست اور خوابوں میں رہنے والی لڑکی تھی جبکہ ظفر کا آئیڈیل
صرف دولت تھا اور وہ دولت کمانے کے ہی خواب دیکھتا تھا شبانہ نے کافی کا
مگ گھاس پر رکھ دیا۔

"یہ کم بخت یہاں بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا نجمی تم مجھے اکیلی چھوڑ کر نہ جانا پلیز۔"
نجمی وہیں بیٹھی رہی۔ ظفر کاؤبوائے کی طرح چلتا چیونگ گم چباتا قریب آ کر بے تکلفی
سے گھاس پر بیٹھ گیا اور بولا۔

"میں ادھر اپنے ایک مجسٹریٹ دوست سے ملنے آیا تھا سوچا تمہاری یونیورسٹی دیکھتا چلوں۔ اچھی یونیورسٹی ہے تم کیسی ہو نجمی؟" نجمی نے سر ایک طرف کرتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہوں۔"

"ویری گڈ! چاکلیٹ تمہیں ضرور پسند ہوں گے۔" اور ظفر نے جیب سے چاکلیٹ کی بار نکال کر اس کے دو ٹکڑے کئے ایک نجمی اور ایک شبانہ کو پیش کیا۔ شبانہ نے بیزاری سے کہا۔

"میں چاکلیٹ نہیں کھایا کرتی۔" نجمی نے کہا۔ "لاؤ دونوں مجھے دیدو مجھے چاکلیٹ بہت پسند ہیں۔" ظفر منہ پھاڑ کر ہنسا اور بولا۔ "ونڈرفل" نجمی میں تمہارے لئے اور چاکلیٹ لاؤں گا۔ امریکہ میں چاکلیٹ بہت عمدہ ہوتے ہیں پھر اس نے جیب سے بٹوہ نکال کر کھولا اور بیس بیس ڈالر کے نوٹوں کی جھلک دکھا کر کریڈیٹ کارڈ باہر گرا دیا پھر جلدی سے اسے اٹھایا اور بولا۔

"شبانہ! یہاں امریکن ایکسپریس والوں کا کریڈیٹ... کارڈ تو نہیں چلتا میرا خیال ہے۔"... شبانہ نے منہ سکیڑتے ہوئے کہا۔

"مجھے کیا معلوم"... نجمی بولی۔

"تم کسی بینک سے دریافت کر لو۔" ظفر ایک بار پھر گنواروں کی طرح ہنسا۔

"بینک والوں کا اس کریڈیٹ کارڈ سے کوئی لنک نہیں ہے بہت بلند چیز ہے امریکن ایکسپریس والوں کا کریڈیٹ کارڈ تو امریکہ میں بھی کسی کسی کو ہی ملتا ہے اس کارڈ پر میں جب اور جس وقت چاہوں دنیا کے کسی بڑے دارالسلطنت کے بڑے سے بڑے ہوٹل میں جا کر ٹھہر سکتا ہوں مجھے ایک سینٹ بھی ادا نہیں کرنا... پڑے گا۔" نجمی نے کہا۔

"تو کیا یہ سب کچھ مفت ہی چلتا ہے؟"

ظفر نے پھر وہی بے ہنگم قہقہہ لگایا شبانہ کے کانوں میں جیسے کسی نے کھولتا ہوا پانی ڈال دیا اسے نجمی پر سخت غصہ آ رہا تھا کہ خواہ مخواہ اس سے باتیں کیوں کئے جا رہی ہے شبانہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے میں تو نوٹس کلاس روم میں ہی بھول آئی ابھی لے کر آتی ہوں۔" اور وہ تیز تیز قدموں سے چلتی کاریڈور میں آ گئی جب وہ اپنی طرف سے کافی دیر لگا کر واپس آئی تو دیکھا کہ نجمی بھی ظفر کے ساتھ قہقہے لگا رہی تھی جانے کیوں شبانہ کو نجمی کا اس طرح بے تکلفی سے ہنسنا پسند نہ آیا۔ انہوں نے کافی بھی منگوا رکھی تھی۔ شبانہ کو دیکھ کر ظفر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"شبو! تمہارا کیا خیال ہے؟ نجمی کہہ رہی ہے کہ مجھے گلبرگ میں کوٹھی بنانی چاہیئے اور میں سوچ رہا ہوں کہ جزیرہ ہوائی میں کسی جھیل کے پاس کاٹج بنواؤں وہاں جواہرات کا کاروبار بھی خوب ہوتا ہے ارے ہاں یہ تو میں تمہیں بتانا بھول ہی گیا شبانہ میں نے امریکہ میں ہیرے جواہرات کا کاروبار بھی شروع کر دیا ہے۔" نجمی نے شبانہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔

"اری شبو! ظفر بھائی جان نے ایک ہیرا مجھے دکھایا ہے سچ ایسا چمکیلی تراش والا ہیرا میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

شبانہ بادل نخواستہ وہاں ایک بار پھر بیٹھ گئی اب ظفر نے دوسری جیب میں سے مخمل کی چھوٹی سی تھیلی نکالی اور اس میں سے سبز کاغذ میں لپٹا ہوا ہیرا نکال کر شبانہ کو دکھایا۔ شبانہ نے اسے ایک نظر دیکھ کر کہا۔

"اچھا ہے" اور پھر بولی۔

"نجمی! میں اب گھر جاؤں گی۔" اس پر ظفر فوراً بولا۔

"میں بھی ادھر ہی جا رہا ہوں عقیل بھائی سے ایک ضروری کام ہے۔" شبانہ نے کہا۔

"وہ اس وقت گھر پر کبھی نہیں ہوتے۔" یہ محض اتفاق تھا کہ شبانہ کی گاڑی سروس اسٹیشن پر تھی۔

ظفر ہنس کر بولا۔ "وہ کوٹھی پر ہی ہے میں نے تھوڑی دیر پہلے اسے فون کیا تھا۔

وہ میرا انتظار کر رہا ہوگا آؤ گھر چلتے ہیں۔"
شبانہ انکار نہ کر سکی اور ظفر کے ساتھ سرخ ٹیوٹا میں بیٹھ کر کوٹھی کی طرف روانہ ہوگئی راستے میں ظفر نے اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اپنی شادی کی بات چھیڑ دی۔ اس کے انداز اور باتوں سے شبانہ نے پہلے بھی یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ شبانہ ہی سے شادی کرنا چاہتا ہے اور یہ شادی وہ شبانہ کے سر کو نیچا کرنے اور اس پر فتح حاصل کرنے کے لئے کرنا چاہتا ہے۔

ظفر کے لئے لڑکیوں کی کمی نہیں تھی اس کے ساتھ رشتے داروں میں کوئی بھی اپنی لڑکی بیاہنے کے لئے تیار تھا مگر وہ صرف شبانہ ہی سے شادی کرنے کا عزم کئے ہوئے تھا وہ شبانہ پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ ممکن تھا کہ شادی کے بعد وہ اسے چھوڑ کر کسی دوسری لڑکی سے شادی کر لے مگر یہ شادی اس کے وقار کا مسئلہ بن گئی تھی۔

شبانہ نے بھی عہد کر رکھا تھا کہ وہ ہرگز ہرگز اس چھوٹی سطح کے آدمی سے بیاہ نہیں کرے گی جب ظفر نے بیاہ کی تاریخ کے بارے میں شبانہ کو بتایا کہ وہ اسی برس موسم گرما میں واپس آکر اس سے بیاہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو شبانہ کو سخت غصہ آگیا وہ کہنا نہیں چاہتی تھی مگر اس سے رہا نہ گیا اس نے ظفر کی طرف دیکھے بغیر کڑوے لہجے میں کہا۔

"میں کوئی بھیڑ بکری نہیں ہوں ظفر صاحب کہ صرف آپ ارادہ کریں اور مجھے خرید کر امریکہ لے جائیں شادی کے لئے میری مرضی بھی ضروری ہے اور میں ابھی شادی کرنا نہیں چاہتی۔"

ظفر کار ڈرائیو کرتے ہوئے سامنے سڑک پر نظریں جمائے ہوئے تھا اس نے بھی کسی قدر تلخی سے کہا۔ "شادی کرنا نہیں چاہتی ہو یا صرف مجھ سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔"

شبانہ نے فوراً جواب دیا۔ "یہی سمجھ لو کہ میں تم سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔" ظفر کے چہرے پر سے ایک سایہ سا آکر گزر گیا۔ اس نے آگے کوئی بات نہ کی

کیمپس سے شبانہ کی کینال بینک والی کوٹھی "کینال لاج" زیادہ دور نہیں تھی ظفر نے کار کوٹھی کے پورچ میں کھڑی کی تو شبانہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی ظفر اب بھی خاموش رہا اس کے اندر جیسے زہر کا پھپھولا پھوٹ پڑا تھا اور اس کا سارا زہر اس کے جسم میں سرایت کر گیا تھا یہ زہر مطالبہ کر رہا تھا کہ مجھے شبانہ چاہیئے شبانہ ہی اب وہ تریاق تھا جو ظفر کے خون سے زہریلے اثرات نکال کر باہر پھینک سکتا تھا۔ شبانہ تیز تیز قدم اٹھاتی اپنے کمرے کی طرف چلی... گئی اور ظفر کار بند کر کے چابی کی زنجیر انگلی کے ساتھ گھماتا کسی گہری سوچ میں گم عقیل بھائی کے کمرے کی طرف بڑھا.. شبانہ کا چھوٹا بھائی عامر امریکہ جا کر انجینیئرنگ کی تعلیم حاصل کرنے کو شروع ہی سے بیتاب تھا دوسری طرف ظفر بھی اس تلاش میں تھا کہ اسے شبانہ کے قلعے کی دیوار توڑنے کا کوئی موقع ہاتھ لگے۔

عامر نے امریکہ جانے کی خواہش کا مکرر اظہار کیا تو ظفر اسے ساتھ لے جانے پر تیار ہو گیا وہ شبانہ کی فیملی کو اپنے احسانوں کے بوجھ تلے کچھ اس طرح دبانا چاہتا تھا کہ وہ وقت آنے پر اس کی گرفت سے آزاد نہ ہو سکیں عقیل بھائی اور ابو بھی راضی ہو گئے انہیں اور کیا چاہیئے تھا چنانچہ ظفر جب پندرہ دن بعد امریکہ واپس جانے کے لئے طیارے میں سوار ہوا تو شبانہ کا چھوٹا بھائی عامر بھی اس کے ساتھ تھا۔

شبانہ نہیں چاہتی تھی کہ ظفر کا احسان لیا جائے مگر اس کی اب وہاں کون سنتا تھا اس کی بات سننے والی عنزالہ اور اس کی امی اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔ شبانہ دل مسوس کر رہ گئی لیکن یہ احساس اس کی تالیف قلب کا باعث بھی.... تھا کہ ظفر لاہور سے چلا گیا۔

جنوری کا ابر آلود موسم تھا کہ رنگون میں بہادر شاہ ظفر کا مزار دیکھنے کے لئے ایم اے کی طالبات کو رنگون یونیورسٹی کا ایک دعوت نامہ آگیا ہر لڑکی کو پانچ ہزار روپے جمع کروانے تھے۔

کل بارہ لڑکیاں رنگون جا رہی تھیں۔ شبانہ کا خیال راحیل کی طرف چلا گیا اس نے کہا تھا۔

"میں دریائے ایراوتی کے شہر میں تمہیں ملوں گا دریائے ایراوتی کے شہر میں جب بارش ہوتی ہے تو اندھیرا چھا جاتا ہے اور فضا صندل ناریل اور کیلے کے درختوں کی ٹھنڈی مہک سے لبریز ہو جاتی ہے۔"

شبانہ نے فوراً پانچ ہزار روپے جمع کروا دیئے اور ٹیم میں اپنا نام لکھوا دیا اس نے ابو اور عقیل بھائی سے اجازت بھی لے لی یونیورسٹی کی دو پروفیسرز بھی ساتھ جا رہی تھیں نیم سرکاری ٹور تھا نجمی کے پاس جمع کروانے کے لئے اتنی رقم نہیں تھی۔

شبانہ نے رقم خود جمع کروانی چاہی مگر اس کے ماں باپ نے لڑکی کو رنگون جانے کی اجازت نہ دی۔ نجمی لاہور میں ہی رہ گئی اور شبانہ کالج کی لڑکیوں کے ساتھ اپنی۔۔۔ پروفیسروں کی نگرانی میں رنگون روانہ ہو گئی۔

رنگون ایئرپورٹ پر حکومت برما کے محکمۂ تعلیم کے اعلیٰ افسران اور رنگون گورنمنٹ کالج فار گرلز کی لیڈی پروفیسروں نے پاکستانی وفد کا خیر مقدم کیا انہیں دو کاروں میں ایئرپورٹ سے منکی پوائنٹ میں دریائے ایراوتی کے کنارے ایک گرلز ہوسٹل میں پہنچا دیا گیا ان کی رہائش کے لئے ہوسٹل کے ایک پورے ونگ کو خالی کروا دیا گیا تھا۔ شبانہ لو بین کی کھڑکی میں سے دریا نظر آیا تو اس نے برمی لیڈی پروفیسر می ہونگ سے۔۔۔ پوچھا کہ ایراوتی دریا ہے؟ می ہونگ مسکرائی۔

"یس! یہ ایراوتی ہے۔ رنگون کا سب سے خوبصورت دریا۔" شبانہ راحیل کے خیال میں کھو گئی۔ کیا اس دریائے کنارے وہ اس کا انتظار کر رہا ہو گا؟ کیا معلوم وہ کہاں ہو؟ کس ملک میں ہو؟ کس دیس میں ہو؟

اس کے بارے میں شبانہ کو کچھ بھی تو معلوم نہیں تھا۔ دریا کا پاٹ کافی چوڑا تھا اس کنا۔۔۔ ناریل اور تاڑ کے درخت دریا پر جھکے ہوئے تھے۔ دریا کی

سطح پر ماہی گیروں کی کشتیاں اِدھر اُدھر تیرتی نظر آ رہی تھیں شبانہ پہلی بار برما کا دارالسلطنت دیکھ رہی تھی اونچی عمارتیں کشادہ سڑکیں، ٹرامیں، بگھیاں رکشے جنہیں انسان کھینچ رہے تھے۔ ریستورانوں کے باہر لٹکتے زرد کیلوں کے گچھے اور رنگ برنگی لنگیوں اور سفید فراکوں میں ملبوس زرد رنگ کی برمی عورتیں آسمان بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔ دن کے چار بج رہے تھے فضا میں ناریل اور کافی کی مہک رچی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ گرلز ہوسٹل کے ایک کمرے میں دو دو لڑکیوں کو ٹھہرایا گیا۔ شبانہ کے ساتھ شادباغ لاہور کی عارفہ ٹھہری شبانہ اسے پسند کرتی تھی۔ بڑی صاف ستھرے ذہن کی پاک صاف لڑکی تھی کبھی کوئی غیر ضروری بات نہیں کرتی تھی شبانہ کے بعد وہ اس کے گروپ کی سب سے سنجیدہ لڑکی تھی جسے کچھ شوخ لڑکیاں بقراط بیگم کے نام سے بھی پکارتی تھیں۔

عارفہ نے عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہا۔ "یہاں سیل بہت ہے۔"

شبانہ نے کھڑکی کھول دی اور بولی۔

"یہ مرطوب ملک ہے عارفہ! یہاں بھی کولمبو اور تھائی لینڈ کی طرح بہت بارشیں ہوتی ہیں دیکھو باہر آم کے درخت پر کتنے سنہری آم لگے ہیں۔"

عارفہ نے آنکھوں پر عینک ٹھیک طرح سے جماتے ہوئے کھڑکی سے باہر جھک کر دیکھا۔ آم کے ایک گنجان درخت پر زرد اور سنہری آم لٹک رہے تھے عارفہ کہنے لگی۔ "بالکل اپنے لاہور کے آم لگتے ہیں۔"

شبانہ نے مسکرا کر کہا "آم تو ہر جگہ کے ایک جیسے ہی ہوتے ہوں گے۔" عارفہ کھڑکی سے ہٹ کر پلنگ کی طرف گئی اور اپنے سوٹ کیس میں سے کپڑے باہر نکالتے ہوئے بولی۔

"میرا بھائی لندن گیا تھا واپس آ کر اس نے بتایا کہ لندن کے آم میٹھے تو ہوتے ہیں مگر ان میں خوشبو نہیں ہوتی۔"

شبانہ کھڑکی میں سے باہر درختوں کو تک رہی تھی ان میں آم کے درخت

بھی بھتے ناریل اور ناڑ کے درخت بھی تھے اور کچھ ایسے درخت بھی تھے جنہیں شبانہ نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ عارفہ اپنے لمبے سیاہ بالوں کا جوڑا بناتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"شبو! بہادر شاہ ظفر کا مزار دیکھنے ہم کل جائیں گے کیا؟"

"میرا خیال ہے کل ہی لے جائیں گے یہ لوگ مگر یہاں ہمیں کچھ لیکچر بھی تو دیئے جائیں گے۔" شبانہ نے پلنگ پر آرام سے نیم دراز ہوتے ہوئے کہا عارفہ گیلے تولیے سے اپنی گردن رگڑنے لگی۔

"اگر یہ سرکاری کلچرل ٹور تھا تو ہم سے پانچ پانچ ہزار روپیہ فی لڑکی کیوں لیا گیا؟ یہ بہت رقم ہے۔" شبانہ اب بھی کھڑکی سے باہر تک رہی تھی جہاں سے اسے درختوں کی جھومتی ہوئی شاخیں صاف نظر آ رہی تھیں۔

"ہوائی جہاز میں آنے جانے کا کرایہ بھی تو بہت لگتا ہے اور پھر یہ نیم سرکاری ٹور ہے چلو اسی بہانے رنگون کی سیر بھی کر لیں گے۔" عارفہ بولی۔

"مجھے تو بہادر شاہ ظفر کا مزار دیکھنے کا بڑا شوق ہے میں وہاں فاتحہ ضرور پڑھوں گی۔" شبانہ کا خیال راحیل کی طرف سے پلٹ آیا کہنے لگی۔

"کیوں نہیں فاتحہ خوانی تو ہم سب کریں گے۔" عارفہ غسل خانے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

"یہ چائے کب دیں گے ہمیں میرے تو سر میں درد شروع ہو گیا ہے۔" شبانہ بھی چائے کی ضرورت محسوس کر رہی تھی۔ اتنے میں شبانہ کی کچھ ساتھی لڑکیاں ہنستی چہلیں کرتی کمرے میں آ گئیں۔ صدف نے اِدھر اُدھر دیکھ کر آہستہ سے پوچھا۔

"بقراط بیگم کہاں ہے؟"

عاشی نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا "شبو! بقراط بیگم تمہیں بہت بور کرے گی۔" نائیلہ نے ہنس کر کہا۔

"یہ شبو بھی تو آدھی بقراط بیگم ہے اس پر کوئی اثر نہیں ہو گا۔" اور سب قہقہہ

لگا کر ہنس پڑیں شبانہ بولی۔

"دوستو! چائے کب ملے گی؟ کہاں ملے گی؟ کیسے ملے گی؟" عاشی نے گردن اٹھا کر کہا۔

"جناب یہ چائے کے باغوں کا ملک ہے چلو نیچے ڈائننگ روم میں چل کر چائے کا مطالبہ کرتے ہیں۔" شبانہ نے فوراً کہا۔

"نہیں نہیں عاشی! ہمیں کوئی ایسی حرکت نہیں کرنی چاہیئے جس سے ہمارے ملک کی بدنامی ہو۔" صدف نے منہ بنا کر کہا۔

"ہم چائے پینے جا رہے ہیں کوئی ڈاکہ مارنے نہیں جا رہے۔"

"میرا مطلب ہے ہمیں نیچے چل کر ڈائننگ روم میں بیٹھ جانا چاہیئے چائے کا وقت ویسے بھی ہو رہا ہے چائے ضرور آ جائے گی۔"

شبانہ کی اس بات پر دوسری لڑکیاں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں نائیلہ بولی۔ "تو پھر تم ہماری لیڈر بن کر آگے آگے چلو اگر دس منٹ کے اندر اندر بسکٹوں کے ساتھ چائے نہ آئی تو ہم اٹیک کر دیں گے۔"

سب لڑکیوں نے اونچی آواز میں "شبانہ زندہ باد" کے نعرے لگائے اور شبانہ کو اپنا لیڈر بنا کر آگے آگے چلاتی نیچے ڈائننگ روم میں لے آئیں برمی لیڈی پروفیسر ہونگ نے انہیں دیکھ کر مسکراتے ہوئے انگریزی میں کہا۔

"سسٹرز! ٹی از ریڈی۔"

عاشی نے آہستہ سے پنجابی میں کہا۔

"ایہہ ساڈی مامی کیتھوں آ گئی اے۔"

شبانہ نے برمی لیڈی پروفیسر کا شکریہ ادا کیا اور انگریزی میں کہا۔

"ہم چائے پینے ہی نیچے آ رہی تھیں۔ ہمیں آپ کا ملک برما بہت پسند آیا ہے۔"

صدف نے شوخی سے کہا "اور تم بھی ہمیں بہت پسند ہو۔" برمی لیڈی پروفیسر نے شکریہ ادا کرنے کے انداز میں تھوڑا سا سر جھکایا اور مسکراتی ہوئی کچن کی طرف

گھوم گئی۔ دوسرے روز رنگون کے گورنمنٹ گرلز کالج کے آڈیٹوریم میں کالج کی پرنسپل نے برما کی ثقافتی تاریخ اور وہاں مسلمانوں کی آمد کے بارے میں ایک لیکچر دیا۔ شبانہ بھی اپنے وفد کی پاکستانی لڑکیوں کے ساتھ وہاں موجود تھی۔ پھر انہیں کالج کی لیبارٹریز دکھائی گئیں۔ اس کے بعد یہ بہادر شاہ ظفر کے مزار کی طرف روانہ ہو گئیں۔

بہادر شاہ ظفر کا مزار رنگون شہر سے دور ایک پہاڑی کے دامن میں واقع ہے ایک فوجی بیرک نما خانقاہ میں چھوٹا سا مزار ہے جہاں اسماۓ ربانی کے طغرے لگے تھے اگربتیاں سلگ رہی تھیں کچھ عقیدت مندوں نے پتھر کی جالیوں میں منت کے سرخ وسیاہ دھاگے باندھ رکھے تھے کئی لڑکیوں نے وہاں تصویریں اتاریں سب نے مل کر فاتحہ پڑھی اور ہندوستان کے آخری بادشاہ کی روح کو ثواب پہنچایا۔ مزار کی حالت اچھی نہیں تھی۔ یہاں سے واپسی پر دن کا ایک بج گیا۔ کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کیا اور پھر لڑکیاں شہر میں شاپنگ کے لئے نکل گئیں۔

شبانہ بھی ان کے ساتھ تھی سوامی پگوڈا رنگون کا سب سے بڑا بودھ مندر ہے اور ایک بہت بڑے اور بلند چبوترے پر بنا ہے اس میں ساکیہ شہزادے گوتم بدھ کی سونے کی مورتیاں بھی رکھی گئی ہیں کئی سیڑھیاں چڑھ کر مندر کے بڑے دروازے تک جانا پڑتا ہے ہر پچاس ساٹھ سیڑھیوں کے بعد ایک کشادہ ڈیوڑھی آجاتی ہے جس کی دونوں جانب برمی لڑکیاں اور عورتیں پانی سے بھری ہوئی لکڑی کی بالٹیوں میں کنول، رجنی گندھا اور رتنا گری کے پھولوں کے بڑے بڑے گلدستے رکھے بیٹھی ہوتی ہیں۔ زائرین ان سے پھول خرید کر لے جاتے ہیں اور اوپر بودھ مندر میں ساکیہ شہزادے کی مورتی کے قدموں میں رکھ دیتے ہیں اور اگربتیاں سلگاتے ہیں موم بتیاں روشن کرتے ہیں اور دنیا بھر کے لوگوں کی بھلائی اور امن کے لئے دعائیں مانگتے ہیں۔

شبانہ نے اس بودھ مندر یعنی سوامی پگوڈا کی بہت تعریف سن رکھی تھی فریزر اسٹریٹ میں تھوڑی بہت شاپنگ کے بعد باقی لڑکیاں تو واپس ہوسٹل کو

چل دیں اور شبانہ اکیلی ہی رکشے میں بیٹھ کر سوامی پگوڈا مندر کی طرف روانہ ہو گئی۔ رنگون میں رکشے کو ٹیچہ کہتے ہیں اور جو آدمی رکشہ چلاتے ہیں وہ عام طور پر تامل لوگ ہوتے ہیں جنہیں فرنگی کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے ان کالے کلوٹے فرنگیوں نے اپنے بالوں کا سر کے پیچھے جوڑا بنا رکھا ہوتا ہے اور پتلی پتلی ٹانگوں سے رنگون کی سڑکوں پر کافی تیز رکشا بھگاتے ہیں۔

شبانہ کو یہ سواری پسند نہیں تھی مگر وہاں کوئی ٹیکسی یا بگھی وکٹوریہ بھی اس وقت نہیں تھی۔ مجبوراً اسے انسانی رکشہ پر ہی سوار ہو کر سوامی پگوڈا پہنچنا پڑا۔

مندر کی فراخ سیڑھیوں کی دونوں جانب ناریل کے اونچے اونچے درختوں نے اپنا سایہ ڈال رکھا تھا۔ اس نے کچھ یورپی سیاح عورتوں کو بھی دیکھا جو مندر کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھیں چند ایک برمی بھکشو زرد لباسوں میں ملبوس سر جھکائے بڑے احترام کے ساتھ اوپر جا رہے تھے۔ پچاس ساٹھ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد پہلی کشادہ ڈیوڑھی آئی تو شبانہ نے دیکھا کہ دونوں جانب برمی عورتیں اور نوجوان لڑکیاں پھول بیچ رہی تھیں۔

انہوں نے رنگ برنگے لہنگے اور سفید کرتیاں پہن رکھی تھیں۔ کئی عورتوں نے برمی لوگوں کی طرح سروں پر زرد یا قرمزی رومال بھی باندھ رکھے تھے۔ یورپی سیاح عورتیں پھول خریدنے کے لئے رک گئیں۔ برمی بھکشو جنہیں رنگون میں پھونگی کہا جاتا ہے خود پھول نہیں خریدتے بلکہ انہیں پھول بیچنے والیاں خود اٹھ کر عقیدت سے پھول پیش کرتی ہیں۔ شبانہ نے اس طرح کے کنول کے پھولوں کو تصویروں میں ہی دیکھا تھا اب جب اس نے بالٹیوں کے ٹھنڈے پانی میں کنول کے کھلے ہوئے پھولوں کے گچھوں کو سر اٹھائے دیکھا تو اس کا چہرہ ایک انجانی روحانی مسرت سے چمک اٹھا۔

کنول کے پھول کو پاکیزگی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ یہ واحد پھول ہے جو تالاب یا جھیل کے کیچڑ میں اگتا ہے مگر کیچڑ سے پاک رہتا ہے اور اپنا شاہانہ کھلا ہوا چہرہ پانی کی سطح سے اوپر اٹھائے رکھتا ہے۔

کنول کو برمی دیو مالا میں روحانی ارتقاء اور روح کے امن کی علامت بھی سمجھا جاتا جاتا ہے۔ شبانہ ان پھولوں کے قریب آ گئی۔ بالٹی میں بے داغ سفید اور ہلکے قرمزی کنول پھولوں کے کچے مسکرا رہے تھے۔ شبانہ انہیں دیکھتی رہ گئی۔ یہ کس عظیم مصور کے ہاتھ تھے جس نے اتنا عالی شان حسین اور باوقار پھول بنایا تھا۔ پھول بیچنے والی لڑکی شبانہ کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی

اس نے ٹوٹی ہوئی انگریزی میں پوچھا کہ وہ کون سے پھول خریدنا پسند کرے گی شبانہ نے سوچا کہ ان پھولوں پر تو خود قربان ہو جانے کو جی چاہتا ہے۔ ان کی کوئی قیمت نہیں تھی لیکن وہ انہیں خرید کر ہی حاصل کر سکتی تھی۔ شبانہ نے پھول بیچنے والی لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کا معصوم چہرہ بھی کنول کے پھول کی طرح شگفتہ پاکیزہ اور مقدس کیفیات کا حامل تھا۔ اٹھارہ انیس سال کی عمر ہو گی۔ زرد لہنگے اور سفید کرنڈی کی کرتی میں ملبوس وہ کنول پھولوں کی بالٹیوں کے پیچھے لکڑی کی چوکی پر بیٹھی تھی۔ اس نے اپنے سیاہ بالوں کے جوڑے میں بھی کنول کا ایک پھول سجا رکھا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے معصومیت کے ساتھ شبانہ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے دانت پاکیزہ سمندروں کے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ قدرت کی آغوش میں کئی نسلیں اپنے نیک اعمال کے خزانے جمع کراتی ہیں تو کہیں ایک نسل کو خوبصورت چہرے اور موتیوں ایسے دانت نصیب ہوتے ہیں۔

اس پھول بیچنے والی لڑکی کے چہرے پر نیک خیالات رکھنے والی ماں کا نور چمک رہا تھا اس کے نقوش برمی نہیں تھے۔ شبانہ نے مسکراتے ہوئے اس سے اس کا نام پوچھا لڑکی نے شرماتے ہوئے کہا۔ "روہنی" اس پھول بیچنے والی لڑکی کا نام روہنی ہے۔ یہ برمی نام نہیں تھا۔

شبانہ نے اس سے کنول پھولوں کا ایک گلدستہ خریدا اور باتیں کرنے لگی روہنی نے اسے بتایا کہ اس کی دادی شمالی ہند سے یہاں آکر آباد ہو گئی تھی۔ شہر کے باہر ان کا ایک چھوٹا سا باغ تھا جہاں تالاب میں انہوں نے کنول اگا رکھے تھے۔

روہنی نے شبانہ کے پوچھنے پر بتایا کہ وہ ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں بھی بات کر لیتی ہے۔ "امی کو ہندوستانی بولنا اچھا لگتا ہے۔" اس قسم کی اردو رنگون میں عام بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ شبانہ نے کہا۔

"ہم واپسی پر تمہیں ملے گا۔" اور مسکرا کر لڑکی کو سلام کیا اور سوامی پگوڈا کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ مندر کے فراخ صحن میں پہنچ کر وہ ساکیہ شہزادے کی جگہ نصب پتھر اور پیتل کی مورتیوں کو دیکھنے لگی۔ وہ بت پرست نہیں تھی۔ اس لئے شبانہ نے کنول کے گلدستے کو صحن کی ایک جانب اگے ہوئے ناریل کے درختوں میں جا کر گھاس پر ڈال دیا۔ پھول درختوں اور گھاس کو پسند کرتے ہیں۔

پتھر کی مورتیوں کے پاس ان کا دم گھٹتا ہے۔ وہ خود بھی پتھر ہو جاتے ہیں۔ شبانہ نے گھوم پھر کر سارے پگوڈا کو دیکھا۔ واقعی بہت شاندار بودھ مندر تھا۔ ساکیہ شہزادے گوتم کا وہ بڑا احترام کرتی تھی۔ اس لئے کہ اس نے دکھی انسانوں کی بھلائی اور ان کے دکھوں کا علاج تلاش کرنے کی خاطر محل کا عیش و آرام اور اپنی بیوی اور بچے کو چھوڑا تھا۔

گوتم بودھ کی نیت پر کوئی شک نہیں کر سکتا۔ فضا میں اگربتیوں اور لوبان کی بوجھل خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ معبد سے واپس آنے سے پہلے شبانہ ایک بار پھر ناریل کے درختوں کے پاس گئی۔ اس کے کنول کے پھول اسی طرح ہری بھری گھاس پر لیٹے ہوئے تھے۔ شبانہ کو وہ بڑے پیارے لگے جیسے معصوم شہزادے زمین کی سیج پر سو رہے ہوں۔

دوپہر کے بعد ہی سے رنگون کے آسمان پر کالی گھٹائیں چھانا شروع ہو گئی تھیں۔ رنگون میں بارشیں بہت ہوتی ہیں۔ یہ موسلا دھار بارشیں ہوتی ہیں بارش رک بھی جائے تو آسمان پر بادل ہفتہ ہفتہ بھر چھائے رہتے ہیں۔ شبانہ معبد کی سیڑھیاں اتر کر جب اس ڈیوڑھی میں آئی جہاں پھول بیچنے والی لڑکی روہنی تھی تو ہلکی ہلکی بوندا باندی ہونے لگی۔

روہنی نے شبانہ کو رجنی گندھا پھولوں کا ایک چھوٹا سا گلدستہ پیش کیا۔ شبانہ نے اس کی قیمت ادا کرنی چاہی تو روہنی نے ہاتھ جوڑ لیے اور نفی میں سر ہلا کر پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ شبانہ نے روہنی کا شکریہ ادا کیا اور خاموشی سے سیڑھیاں اترنے لگی۔

جب وہ سڑک پر آئی تو بارش زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ وہاں کوئی رکشہ وغیرہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ شبانہ جلدی سے ایک گنجان درخت کے نیچے آ کر کھڑی ہو گئی۔ بارش کے قطرے درخت کی شاخوں میں سے اس کے اوپر ٹپک رہے تھے۔ اس نے رجنی گندھا کے پھولوں کو اپنے ساتھ لگا رکھا تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ ایک کالے رنگ کی چھوٹی سی موٹر کار عقب کی طرف سے آئی اور شبانہ کے قریب آ کر سڑک کے کنارے رک گئی۔ شبانہ نے کوئی خیال نہ کیا لیکن جب اسے پائپ کے تمباکو کی ہلکی سی مہک محسوس ہوئی تو اس نے پلٹ کر گاڑی کی طرف دیکھا۔ گاڑی کا دروازہ کھلا تھا۔ اسٹیئرنگ پر راحیل پائپ لیے بیٹھا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"رنگون کی بارش بڑی رومانٹک ہے مگر تم بھیگ جاؤ گی۔" شبانہ جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ راحیل نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ تم رنگون میں ہو۔"

گاڑی گرتی بارش میں رنگون کی دھندلی اور ناریل کے درختوں میں گھری ہوئی سڑک پر چلی جا رہی تھی اور شبانہ سوچ رہی تھی کہ وہ کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی۔ رجنی گندھا کے پھولوں کی گہری طلسمی خوشبو اسے سرگوشیوں میں کہہ رہی تھی۔ شبانہ تم خواب دیکھ رہی ہو، خواب دیکھ رہی ہو۔

- - - - -

گاڑی گرتی بارش میں رنگون کی سڑکوں پر چلی جا رہی تھی۔ شبانہ نے راحیل کو بتایا کہ وہ منکی پوائنٹ والے گرلز ہوسٹل میں ٹھہری ہوئی ہے۔ راحیل کی نگاہیں سامنے سڑک پر گرتی بارش پر جمی تھیں۔ اس نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔" اس کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔ شبانہ ایک ایک سڑک کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ جب گاڑی ایک سڑک کا موڑ گھوم کر دریائے ایراوتی کے ساحل والی سڑک پر آئی تو شبانہ نے پہچان لیا۔ یہی وہ سڑک تھی جو گرلز ہوسٹل کو جاتی تھی۔ راحیل نے ہوسٹل کی ایک جانب سڑک کے کنارے درختوں میں گاڑی کھڑی کر دی اور شبانہ سے کہا۔

"میرا کالج یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے کل تم کس وقت فارغ ہو گی تمہیں اپنا کالج دکھانا چاہتا ہوں۔"

دوسرے روز کا سارا شیڈول شبانہ کے سامنے تھا۔ اسے سہ پہر کو ہی وقت مل سکتا تھا۔ راحیل نے کہا۔

"میں کل سہ پہر کو اسی جگہ گاڑی لے کر آ جاؤں گا۔ میں تمہیں ہوسٹل کے اندر لے جاتا لیکن میں جانتا ہوں دوسری لڑکیاں تمہیں میرے ساتھ دیکھ کر نہ جانے کیا کیا سوچنے لگیں۔ . . اب تمہیں بارش میں ہی دوڑ کر ہوسٹل کے گیٹ تک جانا ہو گا۔

"بارش میں بھیگنا مجھے اچھا لگتا ہے۔"

راحیل نے پائپ کا ہلکا سا کش لیتے ہوئے کہا۔ "بارش ہمیں ہر برسات کے موسم میں ان بنگلوں کی یاد دلاتی ہے جہاں سے نکل کر ہم نے شہر کی سنگین عمارتوں کی طرف اپنا سفر شروع کیا تھا۔ بارش ہمیں واپس لینے آتی ہے۔ میں کل سہ پہر کو آؤں گا۔ . . بارش کے ساتھ نہیں لیتے۔ . . ."

وہ تھوڑا تھوڑا مسکرا رہا تھا۔ شبانہ نے راحیل کو رجنی گندھا کے پھول پیش کرتے ہوئے کہا "تمہیں تو گلاب کے پھول زیادہ پسند ہیں نا؟" راحیل نے رجنی گندھا کی پھولوں بھری ٹہنیاں شبانہ کے ہاتھ سے لے لیں اور بولا۔

"سب سے پہلے پھول انسان کی روح میں اگتے ہیں اس کے بعد وہ ٹہنی پر کھلتے ہیں۔ . . تم اسے مقولہ مت سمجھنا۔ . . یہ بات مجھے خود گلاب کے ایک پھول نے بتائی تھی۔"

شبانہ گاڑی سے نکل کر گرتی بارش میں سڑک کراس کر کے ہوسٹل کے گیٹ کی طرف بھاگی جہاں ناریل کے درخت بارش اور ہوا میں جھوم رہے تھے۔ راحیل شبانہ کو بارش میں دوڑتے دیکھتا رہا۔ . . اسے محسوس ہوا جیسے بارش کی تلاش میں بھاگ رہی ہو۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی گہری اور معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے گرتی بارش میں گاڑی آگے بڑھا دی۔

شبانہ کی روم میٹ عارفہ عرف بقراط بیگم نے بھیگے ہوئے کپڑوں کی طرف دیکھ کر تعجب سے پوچھا "تم کہاں چلی گئی تھیں شبانہ؟ یہ تم ساری بھیگ رہی ہو۔" شبانہ اپنے گیلے دوپٹے کو اتار کر کرسی پر ڈالتے ہوئے بولی۔

"سوامی پگوڈا دیکھنے گئی تھی۔ . . . واپسی پر بارش شروع ہو گئی۔ . . کوئی سواری ہی نہیں ملی۔ . . اف کس قدر موسلا دھار بارش ہوتی ہیں یہاں۔" عارفہ قمیض استری کر رہی تھی۔ کہنے لگی۔ . . جلدی سے کپڑے تبدیل کر لو تمہیں زکام نہ ہو جائے یہاں ملیریا بھی بڑی جلدی ہو جاتا ہے "میں تو تنگ آ گئی ہوں اس شہر سے۔ . . مجھے گیلے کپڑے دے دینا۔ . . استری کر دوں گی۔"

شبانہ نے دوسرے کپڑے پہن لئے۔ عارفہ اس کے گیلے کپڑوں کو باتھ روم میں جا کر نچوڑ کر لائی اور ان پر استری پھیرتے ہوئے بولی۔ "میں تو ان کے روز روز کے لیکچروں سے تنگ آ گئی ہوں۔ . . وہی باتیں بتا رہے ہیں جو ہمیں پہلے سے معلوم ہیں بہادر شاہ ظفر کا مزار دیکھ لیا ہے۔ . . بس۔ . . اب تو ہمیں یہاں سے کوچ کر جانا چاہیئے۔"

شبانہ کھڑکی کے پاس والی کرسی پر بیٹھ کر باہر گرتی بارش میں جو تاڑ اور آم کے درخت نظر آ رہے تھے ان کو دیکھنے لگی۔ عارفہ کہہ رہی تھی۔

"یہ لوگ سارا سال کس طرح چاول کھاتے ہیں۔ . . میں تو تنور کی روٹی کو ترس گئی ہوں۔ دھوپ نکلے تو حبس بھی بہت ہو جاتا ہے۔ لاہور کا موسم بہت یاد آ رہا ہے۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے لاہور لاہور ہی ہے۔"

پھر وہ شبانہ کی طرف پلٹ کر بولی۔ "تم تو خاص موچی دروازے کی رہنے والی جدی پشتی لاہوری ہو۔ . . تمہیں لاہور یاد نہیں آتا! ہم تو خیر وزیر آباد سے لاہور میں آئے تھے۔"

شبانہ نے باہر آم کے درخت کی شاخوں میں ایک زرد رنگ کے آم کو تلاش کر لیا تھا جو بارش میں بھیگ رہا تھا۔ شبانہ اسے مسلسل دیکھ رہی تھی اور اس کی روح ایک انجانی، انمول خوشی کی کیفیت میں سرشار ہو رہی تھی۔ ہنری ڈیوڈ تھارو نے اپنی کتاب "والڈن" میں اس خوشی کو ہی روح کی حقیقی مسرت کہا ہے۔

شبانہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے درخت پر لگا، بارش میں بھیگتا زرد ٹھنڈا آم لافانی مسرتوں کی نظر نہ آنے والی لہریں اس کی طرف بھیج رہا ہے جو شبانہ کی گہرائیوں میں اترتی چلی جا رہی ہیں۔ بارش میں بھیگتے آم کو مسلسل دیکھتے رہنے سے اس کی شکل بدل گئی، اب وہ شبانہ کو سورج مکھی کا پھول دکھائی دینے لگا۔ . . پھر وہ گلاب کا پھول بن گیا۔ . . پھر اس نے چمکیلے زرد مرجان کی شکل اختیار کر لی اور پھر وہ جیسے قوس قزح بن کر سارے درخت پر پھیل گیا۔ اب شبانہ کو درخت نظر نہیں آ رہا تھا۔ آم بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے قوس قزح کے رنگ ہی رنگ تھے۔

ستارے ہی ستارے تھے، پریاں ہی پریاں تھیں، عقیق و زمرد اور نیلم کی لڑیاں ہی لڑیاں تھیں۔ شبانہ کے کانوں میں بینھاون اور میلبنی کے سرمدی نغمات کی مترنم آوازیں ابھرنے لگیں۔ چلو... چلو... اوپر بادلوں کی طرف چلو زمرد، عقیق اور نیلم کی روشنیوں کی طرف چلو... چھوڑ دو... چھوڑ دو... کبھی گیلے، کبھی خشک کپڑوں، گرم تپتی سڑکوں کو، سنگین عمارتوں کو پتھروں کی قبروں کو... موت کے خوف میں مبتلا لوگوں کو، زلزلوں کی لہروں پر کھڑے شہروں کو، کھل کر مرجھا جانے والے پھولوں کو اور مل کر بچھڑ جانے والے ساتھیوں کو چھوڑ دو... اور اوپر چلو... بینھاون، میلبنی اور برسط کے پاکیزہ، بلند اور سرمدی نغمات کی بہشتیوں میں چلو۔

"شبانہ! کھڑکی بند کر دو۔ بارش والی ہوا میں تمہیں زکام ہو جائے گا۔"

عارفہ کی آواز پر شبانہ سے پہلے کھڑکی سے باہر برستی بارش نے چونک کر دیکھا پھر سارے زمرد، سارے نیلم، سارے عقیق، سارے نغمات سمٹ کر زرد بھیگتے آم میں واپس آ گئے اور شبانہ نے گہرا سانس بھرتے ہوئے عارفہ کی طرف دیکھا اور بولی

"تم کیا کہہ رہی تھیں عارفہ؟"

"بھئی کھڑکی بند کر دو... کیسی بارش میں بھیگی ہوئی ہوا آ رہی ہے مجھے تو سردی لگنے لگی ہے۔" شبانہ نے کھڑکی بند کر دی اور بولی...

"میں تمہارے لئے چائے لے کر آتی ہوں۔" دوسرے دن پھر وہی تھکا دینے والے لیکچروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ باقی لڑکیاں بھی اب ان لیکچروں سے بور ہو گئی تھیں اور شہر کی سیر بھی کرنا چاہتی تھیں... مگر یہ خالص کلچرل ٹور تھا... لیکچر بڑے ضروری تھے۔ دوپہر کا کھانا مہمان لڑکیوں کو گرلز کالج کی کینٹین میں ہی کھلایا گیا۔ عارفہ عرف بقراط بیگم نے موٹے چاول دیکھے تو منہ بنا کر شبانہ سے کہا۔

"ان چاولوں سے کب پیچھا چھوٹے گا۔" شبانہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ راحیل کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد لڑکیاں ہوسٹل کی طرف چلنے کے لئے باہر آئیں تو ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ عارفہ بقراط نے سر پکڑ

لیا اور بے زاری سے بولی۔ "پھر بارش ہونے لگی ہے... یہ لوگ یہاں کس طرح زندہ رہتے ہیں۔"

سہ پہر کو بھی بوندا باندی ہو رہی تھی جب شبانہ چھوٹی سی چھتری لے کر ہوسٹل سے نکلی۔ عارفہ بقراط اس وقت سر پر پٹی باندھے سو رہی تھی۔ موسم بے حد خوشگوار تھا۔ خشک ہوا کے بارش میں بھیگے ہوئے جھونکے چل رہے تھے۔ شبانہ سڑک پار کر کے سامنے والے درختوں میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ دو منٹ ہی گزرے ہوں گے راحیل اپنی سیاہ چھوٹی گاڑی لے کر آ گیا۔

اس نے گاڑی روک کر دروازہ کھول دیا۔ گاڑی میں داخل ہوتے ہی پائپ اور گلاب کی ملی جلی مہک نے شبانہ کو گھیر لیا۔ گاڑی دریائے ایراوتی کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف دوڑنے لگی۔

راحیل نے بارش میں دریا کی طرف دیکھا اور کہا۔ "عورت کو اس وقت دیکھنا چاہیئے جب وہ اپنے بچے کو پیار کر رہی ہو۔ اس وقت روح کا بچھڑا ہوا حصّہ روح سے دوبارہ مل رہا ہے اور دریا کو اس وقت دیکھو جب بارش ہو رہی ہو۔ اس وقت دریا کا بچھڑا ہوا جسم قطرہ قطرہ ہو کر دریا سے دوبارہ مل رہا ہوتا ہے۔"

شبانہ کے کانوں میں پنجابی کافی کے بول گونجنے لگے۔ "کدی سانول موڑ مہاراں"

ہاں... کبھی سانول مہار موڑتا ہے تو ماں اپنے بچے کا منہ چومتی ہے اسے پیار سے اپنے ساتھ لگاتی ہے۔ سانول کبھی مہاریں موڑتا ہے تو دریا بارش کے روپ میں اپنے دریا کے سینے پر گرنے لگتا ہے اور پھولوں سے بچھڑی ہوئی خوشبو واپس دھرتی کے سینے میں اترنے لگتی ہے۔ ے

وے ہیں رو رو عرض گزاراں
کدی سانول موڑ مہاراں

شبانہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے کون تھا اس کا سانول؟ کس نے اس کی طرف اپنی مہاروں کو موڑنا تھا؟

وہ فلائنگ ڈچ مین کون تھا؟ وہ بکاشی وینیس کی نہروں والی گلیوں کے کس
خوابیدہ پرانے مکان کی شہ نشین میں محوِ خواب تھا۔ کیا اس کا کوئی وجود بھی تھا؟ اس
نے آہستہ سے سانس کھینچا اور کھڑکی میں سے دریا کی طرف دیکھنے لگی۔ یہ ایراوتی
دریا تھا۔ بارش میں بھیگتا لبریز بھرا بھرا باوقار سمندر کی طرح کا دریا۔ راحیل کہہ رہا
تھا دریائے ایراوتی کے بارے میں ایک گیت بہت مشہور ہے اسے ایراوتی کے
ملاح جب مچھلیاں پکڑنے نکلتے ہیں تو گاتے ہیں تم سنو گی؟ . . . سنو . . . میں
تمہیں اس گیت کا اردو میں ترجمہ کر کے سناتا ہوں۔

"ایراوتی! ہماری ندی ایراوتی! تو اتنی اداس کیوں ہے؟
تیرے پانیوں میں ہمارے آنسو گرتے ہیں۔
کیا تو اس لئے اداس ہے؟
ایراوتی! تو نے یہ رقص کہاں سے سیکھا ہے؟
کیا پہاڑی کے اس موڑ سے جہاں تو جنگل کی طرف اپنا راستہ بدلتی ہے؟
ایراوتی! تیرے پانیوں میں ہمارے آنسو بھی شامل ہیں ایراوتی! تو اتنی اداس
کیوں ہے؟
"ایراوتی! ہماری پیاری ایراوتی! . . ."

شبانہ ایراوتی دریا کی ایک لہر بن کر اس کے سینے کے ساتھ لگی گمنام سمندروں
کی طرف بہہ رہی تھی۔ یہ ایراوتی کی لہر تھی یہ جہلم اور راوی کی لہر تھی، یہ عظیم دریا
سندھ کی لہر تھی . . . یہ کہاں سے شروع ہو کر کہاں ختم ہوتی ہے؟ بارش . . . بارش . . .
بارش . . . دریا . . . دریا . . . دریا . . . گلاب کے سرخ پھول . . . زمردیں آسمان پر
چمکتے نیلم کے ستارو! تم طلوعِ آفتاب کے گیت گاؤ . . . راحیل کہہ رہا تھا۔
"ایراوتی کاشان کی پہاڑیوں سے نکلتا ہے، دریا کو نکلتے کسی کسی کی آنکھ
ہی دیکھتی ہے۔"
اس نے گلاب کا سرخ پھول ڈیش بورڈ پر سے اٹھا کر شبانہ کی جھولی میں ڈال

دیا اور کہا۔ "یہ تم سے ملنے میرے پاس آیا تھا۔" شبانہ نے گلاب کو اپنے ہونٹوں کے
قریب لاتے ہوئے کہا۔
"یہاں گلاب نہیں ہوتا۔"
راحیل بولا۔ "پھول کو یاد کرو وہ آ جاتا ہے۔" شبانہ کو وہ سرخ گلاب یاد آ گئے
جو اس نے اپنی والدہ اور بہن غزالہ کی قبروں پر ڈالے تھے۔ اس نے راحیل سے کہا۔
"شاید تمہیں معلوم نہیں راحیل . . . میری بڑی بہن غزالہ اور پیاری امی جان کا
انتقال ہو گیا تھا۔"

راحیل نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا۔ بوندا باندی اسی طرح
ہوتی رہی پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ "مجھے معلوم ہے تمہیں دکھ ہوا تھا۔ اس لئے
مجھے بھی دکھ ہوا تھا . . . تم نے اس دکھ کا اظہار نہیں کیا اچھا کیا . . . دکھ غیر قدرتی ہے
. . . جب ہمیں کوئی دکھ پہنچتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم کسی شے کی حقیقت
سے بے خبر ہیں . . . تم اسے فلسفے کی باتیں تو نہیں سمجھ رہی ہو؟
اچھا چلو . . . ان باتوں کو چھوڑو . . . کبھی تم نے موت کو دیکھا ہے؟ اس سے
زیادہ خوبصورت دنیا کی کوئی شے نہیں ہے . . . کیا تم اسے سمجھتی ہو؟ اچھا یہ بتاؤ . . .
تم نے پنجاب میں چیت وساکھ کی چاندنی راتیں دیکھی ہیں . . . ان رتوں میں آموں پر
سرخی آتی ہے . . . تم نے سندھ کے صحراؤں میں کھلنے والے حیرت انگیز پھولوں کو دیکھا
ہے؟ پھول روہی میں بھی کھلتے ہیں . . . روہی میں نیچر کا جمال بھی ہے اور جلال بھی . . .
کیا تم کبھی ان لوگوں سے ملی ہو جو سندھ اور بلوچستان کی سرزمین میں آج سے دس ہزار
سال پہلے تہذیب و تمدن کی غیر فانی شمعیں روشن کر رہے تھے؟
چلو ان باتوں کو بھول جاؤ . . . دیکھو دریائے ایراوتی کی لہریں کتنی بے تابی
سے اٹھ اٹھ کر بارش کا خیر مقدم کر رہی ہیں . . . یہ مائیں ہیں جو اپنے بچوں کو سینے
سے لگا رہی ہیں۔"
بارش . . . بارش . . . بارش . . . بارش میں بھیگتی گاڑی دریا سے ہٹ کر ایک

پختہ سڑک پر آ گئی تھی اس سڑک کی دونوں جانب تھوڑے تھوڑے فاصلے پر باغیچوں میں گھرے ہوئے بنگلے تھے۔ ہر بنگلہ زمین سے چار فٹ اونچے مچان پر بنایا گیا تھا۔ یہ بنگلے لکڑی اور بانس سے بنے تھے۔ ان کے باغیچوں میں گل مہر، رتنا گری اور ناریل کے درخت بارش کی ہوا میں جھوم رہے تھے۔ دریائے ایراوتی ان کے عقب میں بہہ رہا تھا۔

راحیل نے ایسے ہی ایک بنگلے کے بانس کی چھت والے گیراج میں لے جا کر گاڑی کھڑی کر دی۔ بارش میں بھیگتے ہوئے وہ برآمدے کے لکڑی کے فرش سے گزر کر ایک مختصر سے کمرے میں آ گئے۔ برآمدے کے بانسوں پر نیلے پھولوں والی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ اس کمرے کا سارا فرنیچر بانس کا تھا۔ فرش گیروے رنگ کے پھولدار قالین سے ڈھکا ہوا تھا۔ کیبنٹ پر کانسی کا ایک گلدان پڑا تھا جس میں کنول کے پھول سجے ہوئے تھے۔ رنگون کے موسم میں کسی آتشدان کی ضرورت نہیں ہوتی۔

راحیل شبانہ کو لے کر بنگلے کے پچھلے برآمدے میں آ گیا۔ یہاں بید کی سبز کرسیاں اور بید ہی کی گول میز پر سرخ گلابوں سے بھرا ہوا چینی کا گلدان پڑا تھا۔ برآمدے کی ڈھلانی چھت پر بارش کی بوندیں ہلکا ہلکا جل ترنگ ساز بجا رہی تھیں۔ چھوٹے سے لان میں کیلے کے درختوں کا ایک جھنڈ تھا جس کی شاخوں میں قرمزی اور زرد کیلوں کے گچھے لٹک رہے تھے۔ کیلے کے چوڑے پتے برسات کی بھیگی ہوئی ہوا میں جیسے مورچھل ہلا رہے تھے۔ راحیل نے بید کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کیلے کے ان جھنڈوں کے پیچھے دریائے ایراوتی بہہ رہا ہے۔"

شبانہ خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گئی اور سامنے کیلے کے درختوں کے پاس گل مہر کے چھوٹے درختوں کو تکنے لگی جن کی جھکی ہوئی ٹہنیوں پر گل مہر کے سرخ پھول لٹک رہے تھے اور بارش میں بھیگ رہے تھے۔ مرطوب ہوا میں کیلے کے پتوں کے علاوہ دریائی سرکنڈوں کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔

شبانہ نے راحیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہاں اور کوئی نہیں رہتا؟"

راحیل پائپ میں نیا تمباکو بھر رہا تھا... اس نے آہستہ سے کہا "جہاں میں رہتا ہوں وہاں کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔" پائپ میں تمباکو بھر کر اس نے میز پر رکھا اور اندر چلا گیا۔ شبانہ نے راحیل کو جیسے وہ تھا قبول کر لیا ہوا تھا۔ وہ اس کے خوابوں کی علامت تھا جہاں واقعی کوئی دوسرا نہیں ہوتا... کوئی دوست، کوئی دشمن، کوئی اپنا، کوئی پرایا نہیں ہوتا... اب اسے راحیل سے کبھی یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی کہ وہ کون ہے؟ کہاں کا رہنے والا ہے، کیا کرتا ہے اور کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے وہ اس کے ساتھ ہوتی تو اسے محسوس ہوتا کہ وہ جاگتے جاگتے اچانک سو گئی ہے اور ایک خواب دیکھنے لگی ہے۔ . تب اسے ہر شے دھند میں ڈوبی اور ان دیکھی سی لگتی تھی۔ اسے پھول دھندلے دکھائی دیتے تھے اور خوشبوئیں صاف نظر آتی تھیں۔ یہ دنیا شبانہ کو اپنی دنیا لگتی تھی۔ وہ ہمیشہ اسی دنیا میں رہنا چاہتی تھی۔ جاگتی دنیا نے اسے سوائے دکھوں اور تکلیف کے اور کچھ نہیں دیا تھا۔ جاگتی دنیا میں وہ ایک مجبور، بے کس لڑکی تھی۔ اس کی ناک میں نکیل پڑی تھی اور نکیل کی رسی دنیا والوں کے ہاتھوں میں تھی جو جدھر چاہتا اسے موڑ کر لے جاتا تھا... لیکن راحیل کی دنیا میں وہ ایک آزاد اور خود مختار عورت تھی۔

یہاں نہ کوئی اس پر اپنا حکم چلاتا تھا اور نہ وہ کسی کی غلام تھی۔ موسیقی کی ایک مترنم لہر کی طرح وہ اپنے ساز کے تاروں سے نکل کر فضاؤں میں پرواز کرتے ہوئے واپس اپنے تار کے پردوں میں آ کر سو جاتی تھی۔ راحیل واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں نیلے رنگ کے دو مگ تھے ان سے کافی کی تلخ مہک اٹھ رہی تھی۔ "جانتی ہو جنوب مغربی ایشیاء میں کافی کیوں پی جاتی ہے؟" وہ شبانہ کے پاس ہی اپنی کرسی پر بیٹھ گیا... پھر اس نے پائپ سلگایا تو پائپ کے تمباکو کی خوشبو بارش اور رتنا گری کے پھولوں کی مہک میں گھل مل گئی۔ بارش کی آواز ایسی تھی جیسے کوئی رک رک کر سرگوشیوں میں اپنی طرف بلا رہا ہو۔

شبانہ کو بچپن میں سنا ہوا ایک کشمیری گیت یاد آ گیا۔ شبانہ کے ماں باپ

کشمیری تھے مگر صرف اس کی دادی ہی کشمیری زبان جانتی تھی۔ جب وہ چھوٹی سی تھی تو اس کی دادی اسے گود میں لے کر ایک کشمیری گیت سنایا کرتی تھی جس کا ترجمہ اس نے بڑی ہوئی تو سنا۔ گیت یہ تھا۔

"سنو! سنو! چیڑھ کے ہرے بھرے جنگل میں کوئی اپنی طرف بلاتا ہے۔
یہ کس کی آواز ہے جو پریوں کی سرسراہٹ کے ساتھ گھل مل گئی ہے۔
سیب کے درختوں پر شگوفے پھوٹنے لگے ہیں۔
بھونروں سے کہو شگوفے سو رہے ہیں شور نہ مچائیں۔
ہرے بھرے جنگل میں یہ کون ہمیں بلا رہا ہے۔
کانگڑی کی آگ مدھم پڑ گئی ہے۔
"سیب کے شگوفے سو گئے ہیں۔"

دادی کے پاس ایک چھوٹا سا سماوار تھا یہ روسی طرز کا کشمیری سماوار تھا۔ اس میں جب چائے ابلتی تو سیٹی بجنے لگتی تھی۔ دادی اماں ایسی سماوار میں سبز چائے اور برسات کے دنوں میں قہوہ بناتی تھیں۔۔۔ جیسا قہوہ شبانہ کی دادی بناتی تھی ویسا قہوہ اس نے پھر کبھی نہیں پیا۔

دادی پہلے صاف شفاف پانی کو سماوار میں ابالتیں۔۔۔ پھر اس میں تھوڑی سی دار چینی اور بادیان فطائی ڈالتی۔ ایک منٹ کے بعد کھولتے پانی میں سبز چائے کی چند ایک پتیاں ڈال دیتی۔ اس کے تین منٹ بعد وہ سماوار کے نیچے دہکتے کوئلوں کو سلاخ سے جھاڑ دیتیں پھر نیلی پھولدار پیالیوں میں جب وہ سماوار سے قہوہ انڈیلتیں تو قہوے کا رنگ خالص زرد سونے جیسا ہوتا اور اس میں سے کبھی دار چینی، کبھی صندل اور کبھی بادیان فطائی کے جنگلوں کی مہک آتی۔

شبانہ قہوے کا گھونٹ پیتی تو خوشبوؤں کی آبشار سی اس کے جسم میں اتر کر اس کی روح کو خوشبوؤں میں سرشار کر دیتی۔ اسے اپنا جسم روح سے بھی زیادہ لطیف محسوس ہوتا۔ دادی کی موت کے بعد جب اس نے ہوش سنبھالا تو اپنے

آپ کو کینال بینک والی کوٹھی میں پایا جہاں صبح شام لپٹن چائے ہی پی جاتی تھی۔ امی جان سردیوں میں صبح اپنے لئے سبز چائے ضرور بنواتی تھیں۔ قہوہ صرف شدید سردی اور بارش میں ہی پیا جاتا تھا مگر جس اہتمام سے دادی اماں قہوہ بناتی تھیں وہ اہتمام مفقود ہو چکا تھا۔

راحیل کہہ رہا تھا۔ "جنوب مشرقی ایشیاء کی بارشیں کافی طلب کرتی ہیں جس طرح کیلے کا درخت بارش مانگتا ہے اسی طرح یہاں کی بارش کافی مانگتی ہے۔ بارش کو کافی کی پیاس ہوتی ہے۔"

شبانہ نے پوچھا "ساتھ والے کمرے میں جو گلاب کے پھول پڑے ہیں وہ کہاں سے آتے ہیں؟" راحیل نے کافی کا ہلکا سا گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔

"وہ بہت دور سے آئے ہیں۔۔۔ ایک ایسے دیس سے جہاں وہ کھل کر کبھی نہیں مرجھاتے۔۔۔ یا تم یہ کہہ لو کہ جہاں یہ مرجھا کر جاتے ہیں اور دوبارہ کھل اٹھتے ہیں۔" پھر وہ شبانہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگا۔ "جانتی ہو گلاب کے باسی پھول کہاں جاتے ہیں؟"

بارش کے قطرے کیلے کے پتوں پر گر کر عجیب خشک سی آواز پیدا کر رہے تھے۔ شبانہ راحیل کے یونانی ناک والے چہرے کو تک رہی تھی اور راحیل اب شبانہ کے چہرے سے نظریں ہٹا کر ناریل کے درختوں کے پیچھے کسی ایسی شے کو دیکھ رہا تھا جو اسے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ شاید وہاں دریائے ایراوتی کی لہریں ہونی چاہئے تھیں یا انناس کے چھوٹے پودوں کی قطاریں ہونی چاہیئے تھیں جو نہیں تھیں۔

"کیسی عجیب بات ہے۔" راحیل نے کافی کا مگ میز پر رکھتے ہوئے شبانہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کیسی عجیب بات ہے کہ تم جو بہت کچھ مجھے کہنا چاہتی ہو خاموش ہو اور میں جو نہیں کچھ بھی نہیں کہنا چاہتا بہت باتیں کر رہا ہوں۔ شبانہ نے چونک کر راحیل کی طرف دیکھا۔۔۔ وہ راحیل سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔ اس سے اپنے دل کی، اپنی

جاگتی دنیا کے دکھوں، غموں اور کلفتوں کی کئی ایک باتیں کرنا چاہتی تھی مگر اس نے کبھی اس سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ کیا وہ چاہتا ہے کہ میں اس سے اپنی جاگتی دنیا کے دکھوں کی بات کر دوں؟

شبانہ دل میں سوچ رہی تھی۔ اس نے راحیل کی پیشانی کو غور سے دیکھا۔ پائپ سلگانے کے لئے اس نے دیا سلائی جلائی تو پیشانی چمک اٹھی۔ پیشانی پر دو تین شکنیں بڑی گہری تھیں۔ کنپٹیوں پر تھوڑے تھوڑے سفید بال چاندی کی کہکشاں کی طرح لگ رہے تھے۔ شبانہ سامنے باغ کے درختوں کو تکنے لگی۔۔۔ پھر جیسے اس کے ہونٹوں سے یہ جملہ اپنے آپ نکل گیا۔

"میرے ابو میری شادی ایک ایسی جگہ کرنا چاہتے ہیں جہاں میں نہیں چاہتی کہ میری شادی ہو۔" راحیل پائپ سلگا رہا تھا۔۔۔ دوسری دیا سلائی بھی ضائع ہو گئی تھی اس نے تیسری دیا سلائی جلا کر پائپ کو اچھی طرح سے سلگایا اور پھر سامنے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"ان درختوں کے پیچھے ہی دریا ہے۔۔۔ کیا تم بارش میں دریا کی سیر کرو گی؟"

راحیل نے شبانہ کی زندگی کے سب سے اہم جملے کو سن کر بھی کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ کیا جاگتی دنیا کے حقائق کی طرف سے اس کے کان بند ہیں؟ شبانہ کو دل میں غصہ آ رہا تھا کہ اس نے یہ بات راحیل سے کیوں کہی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ہلکی بوندا باندی میں کشتی میں بیٹھ کر دریا کی سیر کرے مگر راحیل کی بے اعتنائی کو دیکھ کر اس نے اپنا ارادہ بدل لیا۔ اپنے دل کی بات زبان پر لانے کے بعد اسے راحیل کی بے اعتنائی کا زیادہ احساس ہوا تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں اب واپس ہوسٹل جاؤں گی۔۔۔ دوسری لڑکیاں ہوسٹل پہنچ چکی ہوں گی"

راحیل یوں اٹھا جیسے پہلے ہی سے تیار ہو۔ شبانہ کو یہ بات بھی ناگوار گزری وہ چاہتی تھی کہ راحیل اسے اتنی جلدی واپس نہ جانے کے لئے کہے۔ اسے روکے اور کچھ دیر اور بیٹھنے کو کہے۔۔۔ مگر اس نے ایسا نہ کیا اور شبانہ کو ساتھ لے کر بنگلے کے گیراج

میں آ گیا۔ کار باہر نکالی۔ شبانہ کو بٹھایا اور ہلکی بارش میں اس کے ہوسٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ منکی پوائنٹ سے نکل کر رنگون کی بارش میں بھیگتی مختلف سڑکوں پر سے ہوتے ہوتے جب وہ ہوسٹل کی سڑک پر آئے تو راحیل نے شبانہ کو بتایا کہ رنگون کے زولوجیکل گارڈن کے پیچھے جھیلوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ وہاں جھیلوں میں کنول کے پھول ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ڈولتے رہتے ہیں اور مہاگنی اور تاڑ کے گہرے سبز سایوں والے بے شمار کنج ہیں۔

"وہاں ایک لوٹس گارڈن بھی ہے اس باغ میں ہر وقت ایک ایسے پھول کی مہک رچی رہتی ہے جو کسی کو نظر نہیں آتا۔ وہ درختوں کے نیچے پھیلی ہوئی جھاڑیوں میں کسی پوشیدہ جگہ پر اگتا ہے۔ برما کے لوگ اس پھول کو پنشپانگ پھول کے نام سے پکارتے ہیں۔ کنواری لڑکیاں اکثر اس پھول کی تلاش میں نکلتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ جس لڑکی کو یہ پھول مل جائے اس کی شادی اس کی پسند کے لڑکے سے ہو جاتی ہے کیا تم اس پھول کو تلاش کرنے آؤ گی؟ کل اتوار ہے۔۔۔ تمہیں چھٹی ہو گی۔۔۔۔ میں صبح نو بجے گاڑی لے کر آ جاؤں گا۔"

شبانہ خوشی سے راحیل کی باتیں سنتی رہی۔ گرلز ہوسٹل آ گیا۔ راحیل نے گاڑی ایک طرف درختوں میں کھڑی کر دی۔ شبانہ دروازہ کھول کر اترنے لگی تو راحیل نے کہا۔ "میں کل صبح نو بجے آؤں گا۔۔۔ ہو سکتا ہے تم پنشپانگ پھول تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاؤ۔"

شبانہ نے دھیمی آواز میں کہا "ٹھیک ہے" اور گاڑی سے نکل کر بارش میں تیز تیز قدم اٹھاتی گرلز ہوسٹل کی طرف چل پڑی۔ ہوسٹل کے گیٹ کے پاس پہنچ کر اس نے پلٹ کر دیکھا راحیل گاڑی سے باہر کھڑا پائپ پیتے ہوئے اس کی طرف تک رہا تھا پھر اس نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا۔ شبانہ نے بھی آہستہ سے ہاتھ ہلایا اور جلدی سے ہوسٹل کے گیٹ میں داخل ہو گئی۔ اپنے کمرے میں آتے ہی اس نے کھڑکی کھول کر باہر دیکھا۔

درختوں کے نیچے راحیل کی کار نہیں تھی۔ پیچھے سے عارفہ کی تیز آواز آئی۔۔۔۔

"کھڑکی بند کر دو شبانہ مجھے سردی لگ رہی ہے۔"

شبانہ نے کھڑکی بند کر دی۔ عارفہ پلنگ پر کمبل اوڑھے سر پر پٹی باندھے لیٹی تھی۔ "شبانہ! خدا کی قسم یہاں کوئی کسی کو نہیں پوچھتا۔۔ تم میری بڑی پیاری سہیلی ہو۔۔ تھرمامیٹر لگا کر دیکھو۔۔ مجھے بہت بخار ہے۔" شبانہ نے تھرمامیٹر لگا کر دیکھا معمولی بخار تھا۔ اس نے کہا۔

"عارفہ تم خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بنا دیتی ہو۔۔ ذرا سا بخار ہے۔۔۔ میں تمہارے لئے قہوہ بنوا کر لاتی ہوں۔۔۔ تم ابھی ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

رات کو عارفہ نے بہت شور مچایا۔ بخار سو سے اوپر نہیں تھا مگر اس نے ایسی ہائے ہائے کی کہ شبانہ کو سونے نہ دیا۔ گیارہ بجے رات ایک ڈاکٹر کو بلوایا گیا۔ ڈاکٹر نے آتے ہی اسے ایسا ٹیکہ لگایا کہ وہ مرغی کی طرح گردن ایک طرف ڈال کر ایسی سوئی کہ باقی رات پہلو تک نہ بدل سکی۔ صبح نو بجے راحیل نے آنا تھا۔ شبانہ جلدی جلدی تیار ہو گئی۔ اس نے زرد رنگ کا اپنا پسندیدہ سوٹ پہنا۔ موسم خوشگوار تھا سردی نام کو بھی نہیں تھی۔

ٹھیک نو بجے شبانہ ہوسٹل سے نکل کر سڑک پار والے درختوں میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ دو منٹ بعد راحیل بھی آ گیا۔ رنگون کے زولوجیکل گارڈن کے پیچھے جھیلوں کا واقعی بہت ہی خوبصورت سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ایک جھیل ختم ہوتی تھی تو ساتھ ہی دوسری جھیل شروع ہو جاتی تھی۔ کناروں پر مہاگنی ناریل، تاڑ اور خدا جانے کس نسل کے سینکڑوں گنجان درخت مرطوب موسم میں خاموش کھڑے تھے۔ بارش رات بھر ہوتی رہی تھی۔ اب بارش رکی ہوئی تھی۔ جھیل کنارے کی سڑکیں پختہ تھیں۔ ان پر کیچڑ کا نام و نشان تک نہ تھا۔ لوگ چھٹی کی وجہ سے اپنے بال بچوں کے ساتھ وہاں سیر کرنے آئے ہوئے تھے۔ فضا میں مرطوب سبزے کی مہک رچی ہوئی تھی۔ شبانہ راحیل کے ساتھ ایک روش پر چل رہی تھی۔ اس نے راحیل سے پوچھا۔

"وہ پھول کہاں ہے جس کے بارے میں تم بتا رہے تھے؟"

راحیل بولا۔ "یہ اگر پتہ چل جائے تو میں اسے ڈھونڈ نہ لاؤں یہی تو تمہیں معلوم کرنا ہے۔" شبانہ نے کہا۔

"مگر مجھے تو اس پھول کی خوشبو تک نہیں آ رہی میں اسے کیسے تلاش کروں گی؟"

راحیل بولا "ابھی جھیل کے جنگل کا وہ حصہ نہیں آیا جہاں اس خاص پھول پنشپانگ کی مہک پھیلی رہتی ہے۔ وہ سامنے کیلے کے جنگلی درخت دیکھ رہی ہو نا؟ بس ان درختوں کے پیچھے جو جھیل ہے اس کے کنارے پر اس پھول کی خوشبو شروع ہو جائے گی۔" کیلے کے جھنڈوں کے پیچھے ایک خوبصورت جھیل تھی جس کے پرسکون نیلے پانی کی شفاف سطح پر کنول کے بے شمار پھول کھلے ہوئے تھے۔

اس جھیل کے کنارے کنارے مہاگنی اور تاڑ کے درختوں کا سلسلہ دور تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ یہاں آتے ہی شبانہ کو ایک ایسی خوشبو محسوس ہوئی جو اس سے پہلے اس نے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ یہ کسی خواب کے باغ عدن کے پھول کی خوشبو تھی۔ اس میں ایک سحر تھا جو شبانہ کو اپنے احساسات پر طاری ہوتا لگ رہا تھا۔ راحیل نے کہا۔

"یہ خوشبو پنشپانگ پھول کی ہے۔ یہ کنواریوں کے سپنوں کے شہزادے کا پھول ہے۔ کیا تم اسے تلاش کرو گی؟"

"ہاں۔" شبانہ نے جیسے خواب کے انداز میں کہا۔۔ راحیل مسکرا کر وہیں ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ اور پائپ کا تمباکو انگوٹھے سے دباتے ہوئے بولا۔

"تم اس پھول کی تلاش میں جاؤ۔۔۔ میں یہاں بیٹھ کر تمہارا انتظار کروں گا۔"

شبانہ پنشپانگ پھول کی خوشبو کے ساتھ ساتھ مہاگنی کے گھنے درختوں میں داخل ہو گئی۔ پہلے جنگلی جھاڑیاں آئیں۔ پھر زناگری کے پیڑوں کا جنگل شروع ہو گیا۔ پراسرار پوشیدہ پھول کی خوشبو برابر آ رہی تھی۔ شبانہ اس خوشبو کے پیچھے پیچھے آگے ہی آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اس نے تمام جھاڑیوں اور پودوں کو چھان مارا۔ خوشبو آ رہی تھی۔

مگر پھول کا سراغ نہیں مل رہا تھا۔ وہ اس تلاش بے سود سے تھک گئی مگر اس نے ہمت نہ ہاری۔ جانے اسے کیوں یقین سا آگیا تھا کہ اگر اس نے پنشپانگ پھول کو تلاش کر لیا تو وہ اپنے سپنوں کے شہزادے کے پاس پہنچ جائے گی۔ اس نے ایک بار پھر پھول کی تلاش شروع کر دی۔ خوشبو اسے اپنے ساتھ لے کر جھیل کے کنارے کی طرف آ گئی۔ یہاں جنگلی شریفے کے درخت ہی درخت اگے ہوئے تھے۔ گھاس جھاڑیوں اور درختوں کی شاخیں بارش کی وجہ سے بھیگی ہوئی تھیں۔

شبانہ کی شلوار کے پائنچے اور قمیض جگہ جگہ سے گیلی ہو گئی۔ مگر وہ خوشبو کا سراغ لیتی آگے ہی آگے بڑھتی چلی گئی۔ ایک مقام پر اسے پھول کی خوشبو بہت زیادہ گہری محسوس ہوئی۔ وہ اس جگہ رک گئی۔ اس نے دو تین لمبے لمبے سانس لے کر پھول کی سمت کو متعین کیا اور گارڈینا کے ایک جھاڑ میں داخل ہو گئی۔ یہاں خوشبو اتنی گہری تھی کہ شبانہ کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔ وہ یقیناً پھول کے پاس پہنچ چکی تھی۔ اپنے سپنوں کے شہزادے کے پاس پہنچ گئی تھی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک جگہ جھاڑیوں کی شاخوں کو پیچھے ہٹایا تو بیچ میں ہلکے نیلے رنگ کا کنول کی طرح کا ایک پھول اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ شبانہ نے جھک کر اسے سونگھا۔ وہی خوشبو تھی جو اس پھول کی پنکھڑیوں سے ان دیکھی لہریں بن کر پھوٹ رہی تھی۔ اس نے پھول کو توڑ لیا۔ وہ بھاگتی ہوئی اس جگہ پہنچی جہاں وہ راحیل کو چھوڑ گئی تھی۔ خوشی سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا مگر بنچ کے پاس آ کر ٹھٹھک سی گئی۔

راحیل وہاں پر نہیں تھا پنشپانگ پھول کو سینے سے لگائے وہ راحیل کو ادھر ادھر درختوں میں تلاش کرنے لگی۔ مگر راحیل جیسے غائب ہو چکا تھا۔ وہ اسے تلاش کرتے کرتے تھک گئی۔ راحیل اسے نہ ملا۔۔۔ پھول کو اپنے سینے سے لگائے وہ جھیل کے باغوں سے باہر سڑک پر آ گئی۔ یہاں راحیل کی کار بھی موجود نہیں تھی۔ کیا وہ اسے اکیلا چھوڑ کر چلا گیا ہے؟

شبانہ کو راحیل پر سخت غصہ آنے لگا۔ پھر اس نے یہ کہہ کر صبر کر لیا کہ راحیل پر اس کا کوئی حق بھی تو نہیں ہے۔ آخر وہ اس کا کون ہے؟ وہ اس کی کون ہے؟ وہ کیوں اس کے لئے وہاں بیٹھا رہتا۔۔۔ اسے چلا جانا تھا۔۔۔ وہ چلا گیا۔۔۔ وہ سپنوں کے شہزادے کا پھول کسے دکھائے گی؟

شبانہ کی نگاہ ایک برمی لڑکی پر پڑی جس کی عمر سولہ سترہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی جھیل والے باغ کی طرف جا رہی تھی۔ شبانہ نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ لڑکی نے مسکرا کر شبانہ کو دیکھا اور وہیں رک گئی۔ شبانہ نے انگریزی میں اسے پوچھا۔۔۔ "کیا تم انگریزی میں بات کر لیتی ہو؟" لڑکی نے مسکراتے ہوئے سر کو اثبات میں ہلایا۔ شبانہ نے پھول اس کی طرف بڑھا دیا اور کہا۔

"یہ پنشپانگ کا پھول ہے۔"

برمی لڑکی کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا "تم خوش قسمت ہو۔۔۔ یہ پھول تو کسی کسی کو ملتا ہے۔" شبانہ نے کہا۔

"میں یہ پھول تمہیں دینا چاہتی ہوں اسے میری طرف سے تحفہ سمجھ کر قبول کرو۔"

برمی لڑکی ایک قدم پیچھے ہٹ گئی اور سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے بولی۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ یہ بدشگونی ہو گی۔۔۔ یہ تم نے تلاش کیا ہے اب یہ تمہارا ہے۔۔۔ کیا تمہیں اپنے سپنوں کے شہزادے کی تلاش نہیں ہے؟"

شبانہ نے ایک اداس تبسم کے ساتھ پھول کو اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ برمی لڑکی اسے تعجب سے دیکھ رہی تھی کہ یہ کیسی لڑکی ہے۔ وہ پھول اسے دے رہی ہے جس کی تلاش میں کنواری لڑکیاں جنگل میں ماری ماری پھرتی ہیں۔ شبانہ واپس ہوسٹل میں آ گئی عارفہ بقراط کمرے میں نہیں تھی۔ شبانہ کا دل مغموم تھا۔ اسے اپنا گھر یاد آ رہا تھا۔ اپنی پیاری امی اور بڑی بہن یاد آ رہی تھیں۔۔۔ وہ بستر پر لیٹ گئی اور دیر تک آنسو بہاتی رہی۔ جب دل ہلکا ہوا تو اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔۔۔ بالوں میں کنگھی کر رہی تھی کہ عارفہ کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ بڑبڑا رہی تھی۔

"صدف اور نائیلہ یہاں آکر بہت شوخ ہو گئی ہیں۔ . . ہر کسی کو مذاق کرتی ہیں۔ . . اری شبانہ . . . . یہ پھول کون رکھ گیا ہے یہاں ؟" شبانہ نے پھول کی طرف بے نیازی سے دیکھا اور بولی ۔

"شاید نوکرانی رکھ گئی ہو گی ۔"

عارفہ نے پھول کو اٹھا کر سونگھا . . . ناک سکیڑی اور زور سے چھینک مار کر بولی . . . "یہ تو نسوار کا پھول لگتا ہے مجھے ۔" اس نے پھول اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا اور پیڈ قلم لے کر گھر خط لکھنے بیٹھ گئی ۔ تیسرے پہر شبانہ کے قدم اپنے آپ دریا کنارے والے بنگلے کی طرف اٹھنے لگے ۔ وہ راحیل کے بارے میں پتہ کرنا چاہتی تھی کہ کہاں ہے اور جھیل کنارے والے باغ سے اچانک غائب کیوں ہو گیا تھا ۔ رنگون اس کے لئے ایک اجنبی شہر تھا مگر خاص خاص علاقوں میں جانے کے لئے اس نے کچھ نشانیاں یاد کر رکھی تھیں ۔ وہ ٹیکسی میں سوار ہو کر اس بنگلے پر پہنچ گئی جہاں راحیل اسے لے کر گیا تھا ۔ حسبِ دستور یہ بنگلہ بھی خالی پڑا تھا ۔ راحیل وہاں نہیں تھا وہاں کوئی چوکیدار بھی نہیں تھا ۔

شبانہ واپس آ گئی ۔ کمرے میں داخل ہو رہی تھی کہ صدف برآمدے میں ملی ۔ اس کے پاس ایک لفافہ تھا ۔ "شبانہ ! لاہور سے تیرا خط آیا ہے . . . ." شبانہ لفافہ لے کر کمرے میں آ گئی ۔ ایڈریس انگریزی میں ٹائپ کیا ہوا تھا جلدی سے کھول کر پڑھنے لگی ۔ یہ اس کی پیاری سہیلی اور یونیورسٹی کی ساتھی نجمی کا خط تھا ۔ صرف اتنا ہی لکھا تھا ۔ "مجھ پر مصیبت ٹوٹنے والی ہے ۔ گھر والوں نے میری شادی ندیم کی بجائے اسی لڑکے سے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے جس کو میں ذرا پسند نہیں کرتی ۔ اس وقت مجھے تمہاری بہت ضرورت محسوس ہو رہی ہے ۔ کیا تم ٹور ختم کر کے پہلے لاہور نہیں آ سکتیں شبو ؟ یہ لوگ کل میری منگنی کر رہے ہیں ، ندیم بھی پریشان ہے ۔ وہ کہتا ہے چلو بھاگ چلتے ہیں ۔ مگر تم جانتی ہو میں ایسا نہیں کر سکتی . . . مجھے اپنے ماں باپ کی عزت کا بہت خیال ہے خدا کے لئے تم جلدی آ جاؤ . . . مجھے تمہاری ضرورت ہے . . . تمہاری نجمی ۔"

خط پڑھ کر شبانہ کو نجمی کی بہت فکر لگی ۔ اسے معلوم تھا کہ نجمی کی ماں کو زیور اور پیسے کا بڑا لالچ ہے اور جس لڑکے کے ساتھ وہ نجمی کی بات پکی کر چکی ہے وہ دولت مند لوگ ہیں اور لڑکی کے لئے الگ کوٹھی اور کار دے رہے ہیں ۔ یہ عجیب بات تھی کہ بجائے جہیز کا مطالبہ کرنے کے لڑکے والے خود بہت کچھ دے رہے تھے ۔ شبانہ کو شک ہونے لگا کہ لڑکے میں ضرور کوئی خرابی ہو گی ۔ ابھی ٹور ختم ہونے میں چار دن باقی تھے اور وہ اکیلی واپس نہیں جا سکتی تھی ۔ یہ چار دن شبانہ نے بڑی اداسی سے گزارے ۔

تقریباً ہر روز وقت نکال کر وہ راحیل کی تلاش میں دریائے ایراوتی والے بنگلے پر ضرور جاتی مگر راحیل اسے نہ ملتا آخر رنگون سے لاہور روانہ ہونے کا دن آ گیا . . .

شبانہ نے خدا کا شکر ادا کیا ۔ نجمی کو اس نے تسلی کا خط لکھ دیا کہ وہ پریشان نہ ہو سب ٹھیک ہو جائے گا ۔ میں بہت جلد واپس آ رہی ہوں لاہور یہ لوگ رات کے وقت پہنچے ۔ اگلے روز شبانہ یونیورسٹی گئی تو نجمی کو دیکھ کر اسے صدمہ ہوا ۔ اس کا چہرہ دبلا ہو گیا تھا ۔ آنکھوں کے گرد حلقے سے پڑ گئے تھے ۔ وہ شبانہ کے گلے لگ کر رونے لگ پڑی ۔ شبانہ نے اس کی دل جوئی کی ۔ پھر دونوں سہیلیاں یونیورسٹی کینٹین کے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئیں اور راز و نیاز کی باتیں کرنے لگیں ۔

نجمی کی زبانی شبانہ کو معلوم ہوا کہ لڑکے کا نام پرویز ہے ۔ اس کا کپڑے کا بہت بڑا بزنس ہے ۔ وہ پہلے سے شادی شدہ ہے ۔ اس کی بیوی مر چکی ہے ، ایک تین برس کا لڑکا ہے جو لندن میں اپنی پھوپی کے پاس پرورش پا رہا ہے شبانہ نے تلخ لہجے میں کہا ۔

"اس کے باوجود تمہاری امی وہاں تمہاری شادی کر رہی ہیں ؟ کیا انہیں تمہارا کچھ خیال نہیں ۔ کیسی ماں ہے یہ ؟" نجمی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ اس نے دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ۔ "شبو ! یہ راز میں نے آج تک تمہیں نہیں بتایا . . .

یہ میری سوتیلی ماں ہے۔ ۔ ۔"

شبانہ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ نجمی نے آج تک یہ بات اسے نہیں بتائی تھی۔

شبانہ کا نجمی کے ہاں کبھی کبھار ہی جانا ہوتا تھا۔ ان کا گھر اندرون شہر لوہاری دروازے کے اندر ایک گلی میں تھا۔ نجمی کی ماں کو دیکھ کر شبانہ کو یہ خیال ضرور آتا تھا کہ اس کی عمر اتنی زیادہ نہیں ہے۔ اب نجمی نے اسے بتایا کہ جب وہ دو برس کی تھی تو اس کی حقیقی ماں کا انتقال ہو گیا تھا اور اس کے ابو نے دوسری شادی کر لی تھی۔ لیکن سوتیلی ماں نے نجمی کو اپنی اولاد کی طرح پالا تھا۔ نجمی کے دو سوتیلے بھائی بھی تھے۔ جو عمر میں اس سے بڑے تھے اور کوہ مری کے اسکول میں پڑھتے تھے۔ نجمی کہہ رہی تھی۔

"میری سوتیلی ماں کی ایک ہی کمزوری ہے اور وہ ہے دولت۔ دولت حاصل کرنے کے لئے وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ پرویز کے ماں باپ اسے بہت کچھ دے رہے ہیں۔ اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟

ندیم خود بڑا پریشان ہے۔ وہ کہتا ہے کراچی بھاگ چلتے ہیں۔ ۔ ۔ وہاں جا کر شادی کر لیں گے۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر میں اپنے باپ کی بدنامی کا باعث نہیں بننا چاہتی۔ اگرچہ وہ میری سوتیلی ماں کے زیر اثر ہے اور ان میں اخلاقی جرأت نہیں ہے لیکن وہ میرے ابو ہیں۔ میں ان سے پیار کرتی ہوں اور ان کی عزت خاک میں ملانے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتی۔" شبانہ سوائے تسلی دینے کے نجمی کے لئے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے نجمی کو اتنا ضرور کہا کہ گھر سے بھاگنے کا کبھی خیال بھی دل میں نہ لانا۔ پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔

"میں تمہارے ابوجان سے بات کرتی ہوں۔ ۔ ۔ ہو سکتا ہے وہ اس بیاہ کو رکوا دیں۔ مگر اب تو منگنی بھی ہو چکی ہے۔ پرویز کی ماں نے میری ماں کو ہیرے کی انگوٹھی دی ہے۔ ابوجان اب شاید کچھ نہیں کر سکیں گے۔" پھر ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔

"شاید میری قسمت میں یہی لکھا تھا۔"

اور نجمی نے سر جھکا لیا۔ ۔ ۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

○

نجمی نے شبانہ کو منع کر دیا کہ وہ اس کے ابوجان سے کوئی بات نہ کرے کیونکہ ان سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ نجمی کے سامنے اب ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ وہ اپنی خالہ کو کہہ کر یہ شادی رکوانے کی کوشش کرے۔ نجمی کی خالہ بڑی درویش صفت خاتون تھی اور نجمی سے پیار بھی کرتی تھی۔ جب نجمی نے اپنی خالہ سے ساری بات کر دی تو وہ خاتون سوچ میں پڑ گئی۔ پھر چہرہ اٹھا کر کہا۔

"بیٹی! منگنی ہو چکی ہے۔ تم نے دیر کر دی۔ پہلے مجھ سے ذکر کرتی کہ تم یہاں شادی نہیں کرنا چاہتی ہو تو میں تمہارے ابو سے بات کر سکتی تھی۔ اب اس کا کچھ فائدہ نہیں نکلے گا۔"

نجمی نے خالہ کی منت کی کہ "خالہ خدا کے لئے کچھ کرو۔ میری امی آج زندہ ہوتیں تو میری زندگی تباہ ہوتے کبھی نہ دیکھ سکتیں۔" خالہ کو اپنی مرحومہ بہن کا خیال آ گیا۔ اس نے کچھ سوچ کر کہا۔

"ایک ترکیب ہو سکتی ہے۔ میں شاہ پری کی چوکی دلواتی ہوں۔ تمہاری سوتیلی ماں کو بھی بلواؤں گی تم ایسا کرنا کہ اپنی کسی سہیلی سے کہنا کہ جب شاہ پری مجھ پر حاضر ہو جائے تو تمہارے بارے میں مجھ سے سوال کرے۔ مجھے۔ ۔ ۔ یقین ہے کہ شاہ پری اس بے انصافی کے خلاف تمہاری سوتیلی ماں کی سرزنش کرے گی۔ ممکن ہے تمہاری ماں شاہ پری کے کہنے پر اس شادی سے باز آ جائے۔"

نجمی اپنی سوتیلی ماں کی طبیعت سے واقف تھی وہ جانتی تھی کہ دولت کے سامنے وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی۔ مگر خالہ کے اصرار پر اس نے یہ حربہ بھی آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔ نجمی کی خالہ کا گھر رنگ محل کی ایک تنگ گلی میں تھا۔ خالہ نے اعلان کر دیا کہ وہ اس جمعرات کو چوکی دلوا رہی ہے۔ اس نے نجمی کے گھر بھی پیغام بھجوا دیا۔

نجمی کی ماں نے سوچا کہ وہ شاہ پری سے نجمی کی شادی کے سلسلے میں پوچھے گی کہ لڑکے والوں سے اور کیا کچھ اینٹھا جا سکتا ہے۔ نجمی نے شبانہ کو بھی ساتھ چلنے کے لئے تیار کر لیا۔ چوکی کا وقت دن کے نو بجے کا تھا۔ نجمی شبانہ کو لے کر یونیورسٹی سے سیدھی رنگ محل خالہ کے مکان پر آ گئی۔ مکان کی بیٹھک کو جھاڑ پونچھ کر صاف ستھرا کر دیا گیا تھا۔ فرش دھو کر چاندنی کا فرش بچھا دیا گیا تھا۔ درمیان میں پھولدار جازم کے اوپر دو طرف پیتل کی گلاب دانیاں رکھی تھیں۔

درمیان میں پیتل ہی کے بڑے گلدان میں گلاب کے پھولوں کا بڑا گلدستہ سج رہا تھا۔ ایک جانب چوکی پر طشت پھلوں سے بھرا پڑا تھا جس پر ململ کا رومال ڈال دیا گیا تھا۔ سامنے دیوار پر پشمینے کی کشمیری چادریں جن کو کشمیری فردیں کہتے ہیں لٹک رہی تھیں۔ نیچے دو گاؤ تکیے لگے تھے۔ یہاں نجمی کی خالہ کو بیٹھ کر حال کھیلنا تھا۔ نجمی بچپن ہی سے خالہ کو شاہ پری کی چوکی دلواتے اور حال کھیلتے دیکھتی آئی تھی۔ اس کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔

شبانہ کے موچی دروازے والے گھر میں جو شیش محل تھا وہاں بھی ان کی رشتے دار عورتیں کبھی کبھی آ کر چوکی دلوایا کرتی تھیں۔ شبانہ بھی بچپن ہی سے عورتوں کو حال کھیلتے دیکھتے آئی تھی۔ نجمی اپنی سہیلی شبانہ کے ساتھ خالہ کے گھر میں داخل ہو کر سیدھی اوپر والی منزل میں خالہ کے پاس آ گئی۔ دونوں نے خالہ کو سلام کیا۔ خالہ صاف ستھرا سفید پاکیزہ لباس پہنے چارپائی پر بیٹھی تھیں۔

ان کی بیٹی طاہرہ ان کے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی فضاء میں عطر چنبیلی کی خوشبو اڑ رہی تھی۔ شبانہ خالہ جان سے کئی بار مل چکی تھی۔ دونوں سہیلیاں پیڑھیوں پر خالہ کی چارپائی کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔ طاہرہ نے سبز چائے کا پوچھا۔ شبانہ نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ وہ یونیورسٹی سے چائے پی کر ہی آ رہی ہیں۔ خالہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"وہ تو کالی چائے ہو گی۔ ہم تمہیں سبز کشمیری چائے پلائیں گے۔"

طاہرہ فوراً پھولدار جاپانی پیالوں میں سبز چائے ڈال کر لے آئی۔ نجمی نے خالہ کو بتایا اس کی سوتیلی ماں بھی پہنچ رہی ہے اور وہ شاہ پری سے اس کے بیاہ کی تاریخ کے بارے میں شاید پوچھے گی۔" خالہ بولی۔

"تم گھبراؤ نہیں بیٹی۔ اللہ میاں سب ٹھیک کر دے گا۔" چونکہ آج چوکی کا دن تھا اس لئے خالہ نے صبح ہی سے اپنے لڑکوں کو کہہ دیا تھا کہ وہ دوپہر کا کھانا دفتروں میں ہی کھائیں۔ محلے کی صرف دو ایک عورتوں کو ہی دعوت دی گئی تھی جو خالہ کی پرانی ملنے والیاں تھیں اور جن کے سروں پر بھی شاہ پری کا سایہ تھا۔ ابھی شبانہ اور نجمی نے چائے ختم نہیں کی تھی کہ سیڑھیوں والا دروازہ کسی نے زور سے کھٹکھٹایا خالہ نے طاہرہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"جیو مراثن آ گئی ہو گی اسے اوپر بلا لو۔" طاہرہ بڑی تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی پھر سیڑھیوں میں جیو مراثن کی آواز بلند ہوئی۔

"رب بھاگ لگائے رکھے۔ خیر کرے۔ داراں کہاں ہے خیر نال۔"

"طاہرہ کی آواز آئی۔ اوپر ہے امی ماسی۔"

جیو مراثن اس گھر کی بڑی پرانی دوست تھی اور طاہرہ اور گھر کے دوسرے افراد اس کا بے حد احترام کرتے تھے اور اسے ماسی کہہ کر بلاتے تھے۔" جیو مراثن اپنی دو جوان بیٹیوں کے ساتھ اوپر آ گئی۔ آتے ہی اس نے آگے بڑھ کر نجمی کی خالہ کا ماتھا چوما اور ہاتھ باندھ کر بولی۔

"داراں میرے حق میں ضرور دعا کروانا شاہ پری سے تمہارا بھانجا کویت جانا چاہتا ہے۔"

داراں نے جیو مراثن کی طرف دیکھ کر کہا۔" جیو! جب شاہ پری آئے گی تو تم خود سوال کر لینا اس سے وہ تو تمہیں جانتی ہی ہے۔" جیو مراثن نے دعائیں دیتے ہوئے کہا۔

"مولا مشکل کشا رنگ لائے گا۔ خیر نال طبلے کی جوڑی میں نیچے بیٹھک میں ہی رکھ

آئی ہوں چنبیلی کا عطر منگوا لیا ہے ناں۔" طاہرہ بولی۔

"ہاں ماسی! نیچے طاق میں بھری ہوئی بوتل پڑی ہے۔" جیو مراثن کی بیٹیاں بھی باتیں لے رہی تھیں۔ بار بار ان کے منہ سے دعائیں نکل رہی تھیں۔ شبانہ اور نجمی نے انہیں گیارہ گیارہ روپے کی نذر پیش کی تو جیو مراثن نے باری باری دونوں کے ماتھے چوم کر انہیں ڈھیروں دعائیں دیں۔ پھر طاہرہ کی طرف دیکھ کر بولی۔

"پتر! طبلے کے لئے تھوڑا آٹا گوندھ کر رکابی میں رکھ دینا۔" اتنے میں نجمی کی امی بھی آگئی۔ وہ اپنے ساتھ پھل کی ٹوکری لائی تھی۔ نجمی اور شبانہ کو دیکھ کر وہ حیران سی ہوئی۔ اسے نجمی کا وہاں آنا اچھا نہیں لگا تھا۔ اس نے کہا۔ "تو کالج کی پڑھائی چھوڑ کر کیوں آگئی ہے ری۔"

نجمی نے کہا۔ "امی! شبانہ کو اپنے امتحانوں کے بارے میں کچھ پوچھنا تھا۔ اس کے ساتھ آئی ہوں۔"

نجمی کی امی نے خالہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ "چوکیوں میں جوان لڑکیوں کو نہیں آنا چاہیے بھابی۔"

درویش صفت خالہ نے ہلکے سے تبسم کے ساتھ کہا۔ "یہ تو شاہ پری کا دربار ہے ہم کسی کو آنے اور کچھ پوچھنے سے منع نہیں کر سکتے بھابھی۔"

طاہرہ پھلوں کی ٹوکری اندر لے گئی۔ اندر ایک بڑے ٹبنوس میں نوکرانی پہلے سے ہی پھل کاٹ کر ڈال رہی تھی۔ کیلوں، امرود اور سیبوں کے کئی کئی ٹکڑے کئے جا رہے تھے۔ یہ پھل چوکی کے دوران شاہ پری کی حاضری پر اہل مجلس کو تبرک کے طور پر دیا جاتا تھا اور بعد میں اسے محلے کے بچوں میں بانٹ دیا جاتا تھا۔ نجمی کی امی نے نجمی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"جاؤ نیچے جا کر بیٹھو۔" نجمی شبانہ کو لے کر نیچے بیٹھک میں آگئی۔ بیٹھک میں پہلے ہی سے محلے کی دو عورتیں بیٹھی تھیں جنہیں خالہ نے مدعو کیا ہوا تھا۔ نجمی اور شبانہ انہیں سلام کر کے چاندنی کے فرش کی ایک جانب ہو کر بیٹھ گئیں اور سرگوشیوں میں

باتیں کرنے لگیں۔ اتنے میں طاہرہ اور نوکرانی نیچے آگئیں۔ نوکرانی نے کٹے ہوئے پھلوں والا ٹبنوس اٹھا رکھا تھا۔ طاہرہ کے ایک ہاتھ میں گندھے ہوئے آٹے کی رکابی اور دوسرے ہاتھ میں اگربتیوں کا بنڈل تھا۔ آج اس نے بھی نہا دھو کر نئے کپڑے پہن رکھے تھے اور سر کے بالوں کو دوپٹے میں ڈھانپ رکھا تھا۔

نجمی اور شبانہ بھی سر کو پوری طرح ڈھانپ کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ اگربتیاں سلگا دی گئیں۔ پھلوں کا ٹبنوس یا طشت درمیان میں رکھ دیا گیا۔ پہلے جو ثابت پھلوں کا طشت پڑا تھا طاہرہ نے اسے گاؤتکیوں کے برابر میں رکھ دیا۔ وہ خاص پھل تھے جو شاہ پری حاضر ہو کر خالہ جان کی وساطت سے خاص خاص لوگوں کو عطا کرتی تھی۔ تھوڑی دیر میں جیو مراثن بھی اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ نیچے آگئی۔ گاؤتکیوں کے بالکل سامنے دیوار کے ساتھ ان کے لئے تین پیڑھیاں لگا دی گئیں تھیں۔ انہوں نے چادر کھول کر طبلے کی جوڑی نکالی۔

جیو مراثن نے پان والی مخملی تھیلی اپنے سامنے رکھ لی۔ قوام والا پان منہ میں رکھا اور اگالدان کو اپنے قریب کر لیا۔ ایک بیٹی نے گھنٹی نکال کر ذرا سی بجائی۔ اس گھنٹی کی آواز پر جیو مراثن نے طبلے پر آٹا لگا کر اسے سر کرنا شروع کر دیا۔ محلے کی دونوں عورتیں بڑے ادب سے خاموش بیٹھی تھیں۔ تھوڑی دیر گزری ہو گی کہ اوپر سے خالہ جان، طاہرہ اور نوکرانی کے ہمراہ نیچے تشریف لے آئیں۔

ان کے ساتھ ہی عطر پھلیل کی تیز خوشبوئیں بھی نیچے بیٹھک میں آگئی۔ بیٹھک کی گلی کی طرف نکلنے والی ساری کھڑکیاں بند کر دی گئی صرف ایک روشندان ہی کھلا تھا۔ سردیوں کا موسم کچھ کچھ شروع ہو گیا تھا مگر ابھی اتنی سردی نہیں تھی۔ خالہ جان جازم پر گاؤتکیوں کے درمیان بیٹھ گئیں۔ ان کے کھچڑی بال پورے کھلے تھے اور ان کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ ان بالوں میں بھی چنبیلی کا تیل لگایا گیا تھا۔ بیٹھک کی فضا مختلف قسم کی دیسی خوشبوؤں سے بوجھل ہو گئی مگر شبانہ ان خوشبوؤں کی عادی تھی۔

طاہرہ نے اب طاق میں سے چنبیلی کے عطر کی شیشی اٹھائی اور اس کا کارک کھول کر خالہ جان کے لباس اور سر کے بالوں میں عطر لگانا شروع کر دیا۔ جو عطر باقی بچا وہ اس نے نجمی اور شبانہ کے دوپٹوں پر مل دیا نوکرانی نے رہی سہی کسر گلاب دانیوں میں سے گلاب چھڑک کر پوری کر دی۔ فضاء خوشبوؤں سے اس قدر بوجھل ہو گئی کہ شبانہ کو ہر سانس کے محسوس ہوتا کہ وہ عطر کے گھونٹ پی رہی ہے۔

جیو مراثن طبلہ سر کر چکی تھی۔ اس نے خالہ جان کی طرف دیکھا۔ نجمی کی سوتیلی ماں خالہ جان کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ جیو مراثن نے خالہ سے اجازت طلب کی۔

"سرکار کی اجازت ہو تو بندی دوہے کے بول شروع کرے۔ خالہ جان پر ماحول کے اثر اور کچھ ان کی طبیعت کی پاکیزگی اور خدا سے پیار کی وجہ سے ایک عجیب سی کیفیت ابھی سے طاری ہونے لگی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ ہل رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں بند تھیں، آنکھیں کھول کر جیو مراثن کی طرف ایک نگاہ ڈالی اور بڑی نرم مگر باوقار آواز میں کہا۔ "ہماری طرف سے اجازت ہے۔"

جیو مراثن نے حکم پاتے ہی طبلے پر زور سے ہاتھ مارا۔ ایک خاص تال بجانی شروع کر دی جس کے ساتھ اس کی ایک بیٹی گھنٹیاں بجا رہی تھی اور دوسری بیٹی تالی پیٹ رہی تھی۔ طبلہ، گھنٹیاں اور تالی اتنے زور سے اور ایسی زبردست تال سے بج رہی تھی کہ بیٹھک کی فضا گونجنے لگی۔ دو منٹ تک طبلہ بجانے کے بعد جیو مراثن نے اپنی کراری مگر سر کی پکی آواز میں بول اٹھائے۔

پیھاں مار چنہاں بہئی وگدی اے
تیری باندی روڑ دی جاندی اے

وہ ایک بول اکیلی اٹھاتی اور اس کی دونوں بیٹیاں اپنی تیز اونچی آوازوں میں اس بول کو دوبارہ دہراتیں۔ موسیقی کی تال ایسی منتخب کی گئی تھی کہ طبلے کی گونج داہ تھاپ کا اثر سیدھا دل پر جا کر ہوتا تھا۔

شبانہ چونکہ اس قسم کی محفلیں بہت دیکھ چکی تھی اس لئے اس پر زیادہ اثر

نہیں ہو رہا تھا۔ اگر کوئی شخص پہلی بار ایسی مجلس میں آئے تو اس کے دل پر ضرور حال طاری ہو جائے۔ خالہ جان پہلے آہستہ آہستہ ہل رہی تھیں۔ پھر انہوں نے دائیں بائیں بھی جھولنا شروع کر دیا جیو مراثن نے لے تیز کر دی۔ خالہ جان کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ سر کو آہستہ آہستہ دائیں بائیں جھٹک رہی تھیں۔ جیو مراثن کچھ دیر تک وہی بول دہراتی رہی۔ پھر اچانک اس نے بول اور لے تبدیل کر دی۔ اور تیز لے میں یہ مصرعہ اٹھایا۔

ہلّا رے نی میری شاہ پریئے
نی میری شاہ پریئے
نی میری شاہ پریئے

طبلے کی گونج بلند ہو گئی۔ گانے کی لے تیز ہو گئی۔ اگربتیوں کے خوشبودار دھوئیں سے کمرہ بھر گیا۔ خالہ جان نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے سر کو آگے پیچھے ہلانا شروع کر دیا۔ وہ اپنے بالوں کو زور سے آگے گراتیں اور پھر سر اٹھا کر پیچھے لے جاتیں۔ اب وہ باقاعدہ حال کھیلنے لگی تھیں۔ ان پر حال طاری ہو گیا تھا۔ جیو مراثن نے لے اور تیز کر دی۔ خالہ جان زیادہ زور سے سر آگے پیچھے مارنے لگیں۔

شبانہ، نجمی کی امی اور محلے کی دونوں عورتیں بڑے ادب سے سر جھکائے چاندنی کے فرش پر ایک طرف ہو کر بیٹھی تھیں۔ حال کھیلنے کا یہ سلسلہ پانچ دس منٹ تک جاری رہا۔ پھر ایک دم سے خالہ جان نے ہاتھ فضاء میں بلند کر دیا۔ وہ ساتھ ساتھ حال بھی کھیلے جا رہی تھیں۔ ہاتھ کے بلند ہوتے ہی جیو مراثن نے طبلے پر اپنا ہاتھ روک لیا۔ گانا بند کر دیا گیا۔ جیو مراثن نے عاجزانہ لہجے میں آواز بلند کی۔

"شاہ پری کی تشریف آوری مبارک ہو۔ بندی کی خطائیں معاف کر دی جائیں بسم اللہ! بسم اللہ! بسم اللہ۔ ۔ ۔"

خالہ جان نے ہاتھ نیچے کر لیا اب وہ حال نہیں کھیل رہی تھیں۔ صرف اپنے جسم کو دائیں بائیں ہلا رہی تھیں ان کے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے پھر انہوں نے

اپنی آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں بیٹھک میں سناٹا چھا گیا خالہ جان نے کسی قدر بھاری آواز میں پوچھا۔ "ہمیں کس لئے دعوت دی گئی تھی؟"

خالہ جان کی جو دو بوڑھی سہیلیاں چپ چاپ ادب سے بیٹھی تھیں اب ذرا آگے ہو گئیں وہ خالہ جان کی ہم کیفیت اور ہم مشرب تھیں ان میں سے ایک نے دونوں ہاتھ باندھ کر کہا۔

"حضور کا آنا مبارک ہو سرکار کے دیدار کے لئے یہ چراغ جلائے گئے ہیں۔" خالہ جان نے اپنی لال لال آنکھیں بند کر لیں وہ عجیب کیفیت میں آہستہ آہستہ جھوم رہی تھیں دوسری ہم خیال عورت نے ہاتھ باندھ کر عرض کی۔

"سرکار کو بہشت سے آنا پڑا حضور کو ہم نے تکلیف دی ہے ہمیں بخش دیا جائے" خالہ نے کوئی جواب نہ دیا وہ مسلسل جھوم رہی تھیں پھر دایاں ہاتھ فضا میں بلند کرتے ہوئے حکم دیا۔

"ہمیں تیری باندی روڑدی جاندی اسے سناؤ۔" جیو مراثن کے ہاتھ طبلے پر ہی تھے فوراً سر جھکا دیا اور طبلے پر اتنی زور سے ہاتھ مارا کہ شبانہ کا دل بے اختیار اچھل سا پڑا خود شاہ پری کی فرمائش تھی جس پر مراثن نے جان لڑا دی وہ پوری آواز اور پورے جوش کے ساتھ سر مار مار کر گا رہی تھی۔

لیھاں مار جنہاں ہیٔ وگدی اسے

تیری باندی روڑدی جاندی اسے

جیو مراثن کی آواز پھٹ کر تین چار شاخوں میں تقسیم ہونے لگی تو خالہ جان نے ایک بار پھر ہاتھ بلند کر دیا جیو مراثن کا ہاتھ طبلے پر رک گیا وہ پسینے میں تربتر ہو گئی تھیں خالہ جان کے ماتھے پر بھی پسینے کے موتی چمکنے لگے تھے اب انہوں نے اپنی سرخ آنکھیں اٹھا کر جیو مراثن کی طرف دیکھا اور بارعب آواز میں کہا۔ "تیرا بیٹا کویت ضرور جائے گا ہم اسے کویت پہنچائیں گے۔"

جیو مراثن میری سرکار میری سرکار کہتے ہوئے سجدے میں گر پڑی خالہ جان نے اسے ایسا کرنے سے منع کرتے ہوئے کہا۔ "سجدہ مت کرو سر اٹھاؤ جیو سجدہ صرف اللہ کے لئے ہے۔"

جیو مراثن نے جلدی سے سر اٹھایا اور ہاتھ باندھ کر ادب سے بیٹھ گئی۔ اب خالہ جان نے نجمی کی امی کی طرف نگاہ کی اور پوچھا۔ "تمہارے دل کا حال ہمیں معلوم ہے جو تم سوچ رہی ہو وہ غلط ہے دولت تمہارے ساتھ نہیں جائے گی بچی جہاں چاہتی ہے وہاں اس کا بیاہ کر دے۔" نجمی کے کان سرخ ہو گئے اس نے آنکھیں نیچی کر لیں اسے اپنی سوتیلی ماں کی آواز سنائی دی۔

"سرکار ہم نے تو منگنی بھی کر دی ہے۔" خالہ جان نے کہا

"تو نے جہنم میں جانے کا راستہ چن لیا ہے ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔"

پھر خالہ جان نے نجمی کی طرف دیکھا اور فرمایا "تیری سہیلی کو ہم نے پہلے بھی دیکھا ہے۔"

شبانہ کا دل دھڑکنے لگا اگرچہ وہ ایک پڑھی لکھی لڑکی تھی جدید سائنسی علوم سے واقف تھی فلسفہ بھی اس نے پڑھ رکھا تھا اور اب انگریزی میں ایم اے کر رہی تھی مگر بچپن میں جو نقوش اس کے دل پر ثبت ہو چکے تھے انہیں وہ دور نہیں کر سکتی تھی ان کا اثر ابھی تک اس کے مزاج اور روح پر تھا اس کا دماغ اعتراض کرتا تھا مگر دل تسلیم کر رہا تھا کہ خالہ جان پر شاہ پری آتی ہے نجمی نے ادب سے کہا۔

"یہ میری سہیلی شبانہ ہے سرکار یہ آپ کی درگاہ میں اکثر حاضری دیتی رہتی ہے اس کے امتحان کے بارے میں حکم فرمائیں۔" خالہ جان نے جھومتے جھومتے آنکھیں ایک پل کے لئے بند کر لیں پھر فرمایا۔

"یہ لڑکی امتحان میں پاس ہو جائے گی۔" محلے کی دونوں عورتوں نے باری باری شاہ پری سے دعا کے لئے کہا خالہ جان نے فرمایا مسلمانوں کی فتح ہو گی خدا اور اس کے نبی پاک ﷺ کا نام روشن ہو گا کافر مٹ جائیں گے۔"

نجمی کی سوتیلی ماں نے بہت سی باتیں پوچھنی تھیں مگر خالہ جان نے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔ "اب ہم جا رہے ہیں۔" دونوں عورتوں اور جیو مراثن نے بیک آواز ہو کر کہا۔

"بسم اللہ بسم اللہ بسم اللہ۔"

خالہ جان نے دائیں جانب رکھے نایاب پھلوں کے طشت میں ہاتھ ڈالا ایک سیب جیو مراثن کو ایک ایک سیب محلے کی دونوں ہم خیال عورتوں کو ایک امرود شبانہ کو اور ایک سیب نجمی کو دیا۔ اس کے بعد بلند آواز میں السلام علیکم کہا جس کے جواب میں محفل میں بیٹھی سبھی خواتین نے بلند آواز میں وعلیکم السلام کہا اور خالہ جان وہیں گاؤ تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئیں دو منٹ کے لئے محفل پر سکوت طاری رہا نہ کوئی اپنی جگہ سے ہلا اور نہ کسی نے کوئی بات کی دو منٹ کے بعد محلے کی ہم خیال عورت اٹھ کر خالہ جان کے پاس جا کر بیٹھ گئی اور ان کے شانوں کو آہستہ سے ہلاتے ہوئے بولی۔ "داراں بہن داراں بہن۔" خالہ جان آنکھیں کھول کر اٹھ بیٹھیں آنکھیں ان کی اب بھی سرخ تھیں۔ مگر شاہ پری تشریف لے جا چکی تھی انہوں نے طاہرہ کو آواز دے کر کہا طاہری میری گت کر دے پتر پھر انہوں نے اپنی ہم خیال عورت سے پوچھا۔

"شاہ پری سے کس نے کیا کیا پوچھا؟ انہوں نے کیا جواب دیئے ہم خیال عورت نے شروع سے آخر تک محفل کی ساری کاروائی سنا دی۔ خالہ جان نے نجمی کی امی کی طرف دیکھا جو خاموش بیٹھی تھیں۔"

بھائی شاہ پری نے جو کچھ کہا ہے اس پر عمل کرنا اس میں تیرے خاندان کی بھلائی ہے نجمی کی ماں نے نجمی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تم لوگ اب کیوں بیٹھے ہو جاؤ کالج نہیں جانا ہے؟"

نجمی اور شبانہ اٹھ کھڑی ہوئیں انہوں نے خالہ جان کو بڑے احترام سے سلام کیا خالہ جان نے انہیں دعائیں دیں نجمی اور شبانہ مکان کی ڈیوڑھی سے نکل کر باہر گلی میں آ گئیں۔ گلی میں ابھی تک محلے کے دو چار چھوٹے بچے بیٹھک کی بند کھڑکی سے لگے

اندر سے اٹھنے والی گانے کی آواز کے منتظر تھے نجمی اور شبانہ کو دیکھتے ہی وہ بھاگ گئے گلی میں گزرتے ہوئے شبانہ نے کہا۔

"شاہ پری نے تو بڑے سخت لفظوں میں تیری امی کو اس بیاہ سے منع کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے اب وہ اپنا ارادہ بدل لیں گی۔" نجمی نے ٹھنڈی سانس بھری اور بولی۔ تم میری ماں کو نہیں جانتی ہو شبو شاہ پری کی باتوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہو گا اسے دولت چاہیئے دولت۔"

شبانہ کچھ اور ہی سوچ رہی تھی اس نے سوچا تھا کہ وہ نجمی سے راحیل کے بارے میں اپنے دل کا راز کھول دے گی اور اس سے راحیل کی پراسرار شخصیت کے بارے میں بات کرے گی مگر نجمی اپنے جذباتی مسائل میں اس بری طرح سے الجھ گئی تھی کہ شبانہ نے اپنے ارادے کو ایک بار پھر ملتوی کر دیا اس سے پہلے بھی شبانہ کو کئی بار خیال آیا تھا کہ وہ اسے راحیل کے بارے میں کچھ بتائے شیزان کے پرسکون ماحول میں بیٹھ کر کافی پیتے ہوئے اس رومانٹک انسان کے اچانک اس کی زندگی میں نمودار ہونے اور پھر وقفے وقفے کے ساتھ ایک دم سے غائب ہونے کے سلسلے میں گفتگو کرے لیکن ہر بار شبانہ کی راز پرستی اور اپنے خول میں بند رہنے کی طبعی عادت نے اسے اس سے باز رکھا۔

شبانہ فطری طور پر اسرار پسند لڑکی تھی اسے معلوم تھا کہ جونہی راحیل کے بارے میں اس نے کسی سے بات کی اس رومانس کا سارا اسرار اور تجسس ختم ہو جائے گا اب جب اس نے اس راز سے پردہ اٹھانے کا فیصلہ کیا تو نجمی کو اپنی جذباتی پریشانیوں میں مبتلا پایا۔ اب نجمی کو شبانہ کی دل جوئی کی ضرورت تھی۔

شبانہ کی گاڑی موچی دروازے کے باہر پولیس اسٹیشن کے پاس ہی کھڑی تھی۔ موچی دروازے کے مین بازار میں پھول بیچنے والے چاچا نے شبانہ کو دیکھا تو دور سے آواز دی۔

"پتر پھول نہیں لے جاؤ گی آج۔" شبانہ نے چاچا کو قریب جا کر ادب سے سلام

کیا چچا نے آگے بڑھ کر شبانہ کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور دعا دی پھر دونوں کو سرخ گلابوں کا ایک ایک گجرا اور کچھ ہار پتوں میں لپیٹ کر دیئے اور تاکید کی کہ خواجہ صاحب کو میرا اسلام کہنا۔ گاڑی موچی دروازے سے باہر نکالتے ہوئے شبانہ نے نجمی سے کہا۔

"پھولوں والے چچا اب بھی مجھے بچوں کی طرح پیار کرتے ہیں۔ اس شخص کو میں بچپن سے دیکھ رہی ہوں اس کے بوڑھے چہرے پر بھی نور ہے۔"

نجمی نے جیسے کچھ نہیں سنا تھا وہ سوچ رہی تھی کہ آج ندیم سے مل کر اسے کہہ دے گی کہ وہ اسے بھول جائے قسمت میں ان کا ملاپ نہیں لکھا شبانہ کہہ رہی تھی "پھول والے چچا کے چہرے پر پھولوں کی معصومیت اور پاکیزگی ہے میں سمجھتی ہوں کہ دنیا میں رہ کر یہی سب سے بڑا سرمایہ ہے جو انسان اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔" نجمی نے اپنے خیالات سے چونکتے ہوئے "ہاں" کہا تو شبانہ سمجھ گئی کہ نجمی کیوں غیر حاضر ہے اس نے گاڑی کا گیئر بدلتے ہوئے اسے بھاٹی دروازے کی طرف ڈالا اور کہا۔

"اب تم کیا سوچ رہی ہو میرا مطلب ہے کہ اگر تمہاری امی منگنی توڑنے پر راضی نہ ہوئی جو میرا خیال ہے کہ نہیں ہوں گی تو تم" نجمی نے جھنجھلا کر کہا۔

"تو میں راوی میں چھلانگ لگا دوں گی تنگ آ گئی ہوں میں اس عورت کے ستم سے" اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور بولی۔

"ابو بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتے آئے ہیں ان کو بھی میری زندگی کی پروا نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ سمجھتے ہوں کہ تم وہاں خوش رہو گی تم نے بھی تو اپنے ابو سے کبھی اس قسم کی بات نہیں کی اب ان سے بات کر کے دیکھو وہ ضرور تمہاری طرفداری کریں گے۔

"میں جانتی ہوں کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور پھر میں یہ بات اپنے باپ سے کر بھی نہیں سکتی۔"

شبانہ نے اپنے پہلے والے عزم کو پھر دہراتے ہوئے کہا۔ "اگر تم کہو تو میں بات کروں تمہارے ابو سے؟" نجمی نے کوئی جواب نہیں دیا صرف ہلکے سے نفی میں

سر ہلا کر رہ گئی شبانہ نے یہ کہہ کر اسے تسلی دینے کی کوشش کی کہ ابھی کافی وقت پڑا ہے، وہ پریشان نہ ہو کچھ سوچ لیں گے جب تک وہ ایم اے نہیں کر لیتی اس کی شادی نہیں ہو گی۔" نجمی نے کڑوا گھونٹ نگلتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔"

"ان باتوں کا گھر میں کسی کو خیال نہیں ہے انہیں میری تعلیم کی کیا فکر ہو سکتی ہے مجھے معلوم ہے وہ دو تین ماہ بعد میری پرویز سے شادی کر دیں گے امی تو گلبرگ جا کر وہ کوٹھی بھی دیکھ آئی ہیں جسے پرویز ان کے نام کرنے والا ہے۔" شبانہ نے حیرانی سے پوچھا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو کیا وہ کوٹھی تمہارے نام نہیں ہو گی۔"

"ہر گز نہیں" نجمی نے طنزیہ انداز میں کہا اس کوٹھی کی میری سوتیلی ماں کو مجھ سے زیادہ ضرورت ہے وہ لوہاری دروازے والے گندے مکان سے اٹھ کر کوٹھی میں میرے پاس جائیں گی یہ کوٹھی بھی اسی کے نام ہو گی۔"

نجمی نے شبانہ کو یہ بھی بتایا کہ پرویز عمر میں بھی اس سے کافی بڑا ہے اس نے امی کو پچاس ہزار روپے بھی دیئے ہیں اس کی منگنی پر شبانہ کو یہ سن کر بہت دکھ ہوا۔ حقیقت یہ تھی کہ نجمی ایک نوجوان اور بے حد خوبصورت لڑکی تھی اس کی خوبصورتی کے چرچے کالج بھر میں تھے۔ پرویز نے کسی فنکشن میں اسے دیکھ لیا تھا اور اپنی والدہ کو رشتہ کے لئے اس کے گھر بھیج دیا۔

پرویز کروڑپتی تھا اس کے پاس روپے پیسے کی کمی نہ تھی جب اسے معلوم ہوا کہ نجمی کی امی سوتیلی ہے اور روپے پیسے کی لالچی ہے تو اس نے چیک بک اس کے سامنے رکھ دی اور نجمی کی ماں اس رشتے پر راضی ہو گئی تھی اس نے اس حقیقت کو بھی نظر انداز کر دیا کہ پرویز نجمی سے عمر میں بیس برس بڑا ہے اور اس کا پہلے سے ایک بچہ بھی ہے جو لندن میں اس کی پھوپی کے پاس پل رہا ہے گاڑی وحدت روڈ سے نکل کر یونیورسٹی کیمپس کی سڑک پر آئی تو شبانہ نے کہا۔

تم کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھنا نجمی تھوڑا وقت گزر جانے دو حالات

معمول پر آجائیں گے۔"

"نجمی نے جھنجھلاہٹ کے ساتھ کہا جب تک میں زندہ نہیں رہوں گی۔" شبانہ نے ایک بار پھر اسے اس قسم کی جذباتی رو میں بہنے سے منع کیا اور اسے کہا کہ وہ خود اس کے ابو کے پاس جائے گی نجمی بار بار یہی کہتی رہی کہ اس کے ابو سے ملنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا ان کی اپنی کوئی رائے نہیں ہے موچی دروازے کے پھولوں والے چچا کے دیئے ہوئے گلابوں کے گجرے اور ہار ڈبنش بورڈ پر پتوں میں لپیٹے پڑے تھے جن میں سے ان کی بھینی بھینی مہک آرہی تھی اس روز باقی کا سارا دن نجمی کالج میں چپ چپ رہی۔

شبانہ نے اس کی طبیعت بہلانے کی بہت کوشش کی مگر ظاہر ہے نجمی ایک زبردست جذباتی بحران سے گزر رہی تھی ان باتوں سے وہ کیسے بہل جاتی دوسرے روز صبح نجمی نے کالج کی لائبریری میں جاکر ندیم کو فون کر دیا اور کہا کہ وہ اس سے ملنا چاہتی ہے بہت ضروری کام ہے ندیم نے اسے کہا کہ میں ریلوے اسٹیشن پر تمہارا انتظار کرتا ہوں فوراً آجاؤ نجمی نے ٹیکسی پکڑی اور لاہور اسٹیشن کی طرف چل دی۔

شبانہ سے اس نے یہی کہا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ گھر جارہی ہے ریلوے اسٹیشن پر معمول کی طرح ٹریفک کا شور اور لوگوں کا تانتا بندھا تھا مگر اس نے ندیم کو دیکھ لیا۔ وہ پورچ میں ایک طرف ستون کے پاس کھڑا بے چینی سے سگریٹ پیتے ہوئے بار بار آنے جانے والی ٹیکسیوں کو دیکھ رہا تھا۔ نجمی کو دیکھتے ہی اس نے اطمینان کا سانس لیا دونوں فرسٹ کلاس ریفریشمنٹ روم میں جاکر بیٹھ گئے۔ ندیم نے چائے کا آرڈر دیا اور نجمی سے پوچھا۔

"خیریت تو ہے نہ" نجمی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ندیم کو معلوم تھا کہ نجمی کی منگنی ایک کروڑ پتی تاجر پرویز سے ہوچکی ہے مگر وہ مجبور تھا ایک تو وہ امیر ماں باپ کا بیٹا نہیں تھا دوسرے وہ خود اپنے پاؤں پر نہیں کھڑا تھا نجمی سے وہ محبت ضرور کرتا تھا مگر اپنے آپ کو بے بس محسوس کر رہا تھا اس نے سگریٹ کی راکھ کو ایش ٹرے

میں آہستہ سے جھاڑتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تمہاری شادی ہو رہی ہے۔" نجمی نے تڑپ کر ندیم کی طرف دیکھا اور تیز لہجے میں بولی۔

"اگر تم یہی چاہتے ہو کہ میری شادی کہیں اور ہو جائے تو یہ بھی ایک دن ہو جائے گی اور تم بیٹھے سگریٹ پیتے رہو گے۔"

ندیم جھنجھلا سا گیا۔ "میں کیا کر سکتا ہوں میں نے اپنی والدہ کے ہاتھ تمہارے ہاں پیغام بھیجا جو شریفانہ طریقہ ہوتا ہے۔ تمہاری امی نے صاف انکار کر دیا میں نے تمہیں سے کہا کہ چلو کسی دوسرے شہر جاکر شادی کر لیتے ہیں تم نے انکار کر دیا اب تم ہی مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں؟ خودکشی میں نہیں کر سکتا۔"

نجمی کے دل و دماغ میں اپنی سوتیلی ماں اور معاشرے کی زیادتیوں کے خلاف ایک طوفان سا امنڈ آیا تھا۔ کیا وہ کوئی بھیڑ بکری ہے کہ جس نے زیادہ رقم دی اس کے حوالے کر دیا؟ کیا اس کی اپنی کوئی حیثیت نہیں؟ اپنی کوئی شناخت نہیں؟ اپنا کوئی حق نہیں؟ کیا اسے یہ حق بھی حاصل نہیں کہ اپنی مرضی سے زندگی بسر کر سکے؟

ندیم اسے کہہ رہا تھا' بعد میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ایک بار ہماری شادی ہو گئی تو پھر کوئی ہمیں کچھ نہیں کہے گا۔ تمہارے ماں باپ بھی ہمیں قبول کر لیں گے۔ ہم شادی کے بعد فوراً لاہور واپس آجائیں گے میں تمہارے ماں باپ کے قدموں پر گر پڑوں گا۔ مجھے یقین ہے تب وہ مجھے ٹھوکر نہیں مار سکیں گے تم ایک بار حوصلہ تو کرو۔ میرے ساتھ نکل چلو۔ ہم کراچی جاکر فوراً شادی کر لیں گے۔ وہاں میرا ایک بڑا عزیز دوست رہتا ہے وہ ہماری شادی کا سب بندوبست کر دے گا میں نے تو اس سے بات بھی کر لی تھی لیکن جب تم نہ مانیں تو میں بھی خاموش ہو گیا۔"

نجمی کے ذہن میں ندیم کی باتیں چنگاریاں بن کر گر رہی تھیں جو اس کے باغیانہ جذبات کو مزید بھڑکا رہی تھیں سب سے زیادہ اسے اپنی سوتیلی ماں پر غصہ آرہا تھا جو اسے دولت کے عوض ایک بڈھے کے ہاتھ فروخت کر رہی تھی اگر اسکی

اپنی ماں ہوتی تو اس کا درد بھی کرتی۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ میں کوئی بکاؤ مال نہیں ہوں پڑھی لکھی لڑکی ہوں مجھے آگے بڑھ کر معاشرے سے اپنا حق چھین لینا ہوگا نہیں تو ساری زندگی تباہی کے جہنم میں سلگتی رہوں گی۔ ندیم کہہ رہا تھا۔

"تمہیں اپنی زندگی، اپنے مستقبل کو بربادی سے بچانے کا پورا حق حاصل ہے نجمی تم پڑھی لکھی لڑکی ہو کوئی جاہل یا گنوار نہیں ہو۔ آج کل تو ان پڑھ لڑکیاں بھی اپنے اوپر ظلم ہوتے گوارا نہیں کرتیں اگر تم ہاں کہہ دو تو۔۔۔۔۔

اس وقت ساڑھے نو بجے ہیں۔ ہم دوپہر کی ٹرین پکڑ کر یہاں سے نکل پڑیں گے کل شام کو کراچی پہنچتے ہی ہماری شادی ہو جائے گی اور سب ٹھیک ہو جائے گا۔

نجمی کو یہ راستہ بڑا آسان لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے تمام مسائل اس کی زندگی کے سارے دکھ اور اس کے مستقبل کے خدشات صرف چوبیس گھنٹے گزرنے کے بعد حل ہو سکتے ہیں۔ وہ اپنی پسند کے لڑکے سے شادی کرنے کے لئے گھر سے جا رہی ہے۔ وہ شادی کے دوسرے ہی دن واپس لاہور آجائے گی۔ اس کے ابو اسے ضرور معاف کر دیں گے۔ سوتیلی ماں کی نجمی کو کوئی پرواہ نہیں تھی وہ اپنے خاوند کے ساتھ اپنے گھر واپس آئے گی۔ اسے کسی زیور کپڑے کی پرواہ نہیں وہ تو صرف ندیم سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ ندیم کہہ رہا تھا۔

"تمہیں ابھی اسی وقت فیصلہ کرنا ہے نجمی۔ ورنہ اس کے بعد تمہاری میری راہیں جدا ہو جائیں گی۔ پھر مجھ سے کبھی یہ توقع نہ رکھنا کہ میں تم سے ملنے تمہارے گھر آؤں گا۔ کیا تم مجھ سے شادی کرنے پر تیار ہو؟"

نجمی کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ "ہاں میں تم سے اور صرف تم ہی سے شادی کروں گی۔" ندیم نے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھاتے ہوئے نجمی کی چمکیلی آنکھوں کی طرف دیکھا اور کہا۔

"کیا تم آج دوپہر میرے ساتھ کراچی چل رہی ہو؟ میں اپنے دوست کو ابھی فون کر دونگا۔ وہ ہماری شادی کا سارا انتظام تیار کروا رکھے گا۔"

"ہاں۔ میں کراچی جا کر تم سے بیاہ کر لوں گی۔ میں تیار ہوں۔" یہ جملہ جیسے نجمی کے اندر چھپی ہوئی، کھولتی ہوئی لڑکی نے کہا تھا۔ ندیم نے گھڑی پر وقت دیکھا اور ویٹر کو بل لانے کا اشارہ کیا۔ "نجمی ایک بار پھر غور کر لو۔ سوچ لو کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں تم پچھتانا شروع کر دو۔" نجمی نے ندیم کی طرف پر عزم نظروں سے دیکھا اور کہا۔

"میں نے سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے ندیم! لیکن اب تم اپنے فیصلے سے پیچھے مت ہٹ جانا۔ مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ گے میری ناموس کی حفاظت کرنا۔ مجھ سے شادی کر کے مجھے واپس میرے ماں باپ کے پاس لے آنا۔" ندیم بولا۔

"کیسی باتیں کرتی ہو نجمی۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تمہاری عزت میری عزت ہے۔ تم میری بیوی بننے والی ہو۔ میری ناموس پر تو میری جان بھی قربان ہے۔"

نجمی کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے ارد گرد حفاظتی دیوار کھینچ دی ہو۔ جیسے کسی نے اسے اپنے مضبوط بازوؤں کے حصار میں لے لیا ہو لیکن یہ ساری جذباتی تخیل کاری تھی۔ نجمی نے کس قدر بھیانک فیصلہ کیا تھا۔ یہ خود اسے بھی معلوم نہیں تھا جھوٹ میں جب تھوڑا سا سچ ملا دیا جائے تو وہ بہت خطرناک ہو جاتا ہے۔

نجمی زہر پینے والی تھی لیکن اپنی خوش فہمیوں اور خوش کن قیاس آرائیوں سے اس نے اس زہر کو تھوڑا سا میٹھا کر لیا تھا۔ یہ شیرینی وقتی تھی جبکہ زہر کی ہلاکت مستقل اور دائمی تھی۔ نجمی کو ایک لمحے کے لئے محسوس ہوا کہ اس کے کاندھوں سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے۔ اب یہ بوجھ ندیم کے کندھوں پر منتقل ہو گیا تھا لیکن ندیم نے صدق دل اور پوری ذمہ داری سے یہ بوجھ اٹھا لیا تھا۔

وہ نجمی سے شادی کر کے ایک ذمہ دار اور کامیاب شہری کی زندگی بسر کرنا چاہتا تھا۔ کراچی میں اس کا ایک قابل اعتبار دوست ایک ہوٹل کا منیجر تھا۔ اس کا نام زمان تھا۔ زمان سے ندیم کی ملاقات ایک برس پہلے کراچی کے اسی ہوٹل میں ہوئی تھی جس کا زمان منیجر تھا۔ دونوں بہت جلد ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے تھے۔

زمان کا مہینے میں لاہور کا ایک پھیرا ضرور لگتا تھا اور وہ ندیم سے ملے بغیر واپس نہیں جاتا تھا۔ زمان خوش پوش اور بہت خرچیلا تھا۔ اس کی تنخواہ اتنی نہیں تھی مگر وہ بڑے ٹھاٹھ سے کراچی میں رہتا تھا۔ اس کے پاس ایک ٹیوٹا گاڑی بھی تھی۔ زمان نے ندیم کو یہی بتایا تھا کہ وہ ساتھ ساتھ درآمد برآمد کا کاروبار بھی کرتا ہے۔ ندیم کو اس کے کاروبار اور ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے زمان کی خوش گفتاری اور خوش لباسی بہت پسند تھی۔ اسی وجہ سے وہ اس کا ایک برس میں ہی گہرا دوست بن گیا تھا، جب نجمی کی منگنی ہو گئی تو ندیم بے حد پریشان ہوا اچانک اسے زمان کا خیال آگیا۔ وہی ایک ایسا دوست تھا جو ندیم کی دل جوئی کر سکتا تھا۔

ندیم ٹرین میں بیٹھا اور سیدھا کراچی زمان کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے زمان کو بتایا کہ جس لڑکی سے وہ محبت کرتا ہے اس کا بیاہ کسی دوسرے سے ہو رہا ہے زمان نے ندیم کو کندھے سے پکڑ کر ہنستے ہوئے ہلکا سا جھٹکا دے کر کہا" اور تم بدھو بنے اپنی محبوبہ کو دوسرے کے ساتھ جاتے دیکھتے رہ گئے؟ ندیم بھائی تم کس زمانے میں رہ رہے ہو۔ لڑکی کو بھگا کر یہاں لے آؤ۔ ہم تمہاری شادی کروا دیں گے۔"

ندیم اس کا منہ تکنے لگا۔ پہلے تو اس نے ایسا قدم اٹھانے سے خود انکار کیا۔ پھر کہا کہ نجمی گھر سے بھاگنے پر تیار نہیں ہو گی۔ زمان نے سگریٹ ایش ٹرے میں دباتے ہوئے قہقہہ لگایا اور ندیم کے کاندھے پر ہاتھ مار کر بولا۔

"تو پیارے پھر ساحل سمندر پر جا کر کوئی دردناک فلمی گیت گاؤ میرے پاس تو تمہارا جو علاج تھا وہ میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔" ندیم نے حامی تو نہ بھری مگر یہ خیال اس کے دل میں بیٹھ گیا تھا۔ چنانچہ اب جب نجمی کراچی بھاگ جانے پر راضی ہو گئی تو ندیم نے زمان کو فون کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے نجمی سے کہا۔

"میرا خیال ہے کراچی کی ٹرین بارہ بجکر بیس منٹ پر چھوٹتی ہے۔ تم یا تو

میرے ساتھ ہی رہو۔ یا اگر تمہیں گھر سے کچھ کپڑے وغیرہ لانے ہیں تو جا کر لے آؤ۔ میں کراچی اپنے دوست زمان کو فون کر دیتا ہوں وہ نکاح خواں کو بالکل تیار رکھے گا کل شام کو کراچی پہنچتے ہی ہماری شادی ہو جائے گی۔"

زندگی میں کبھی انسان کی آنکھوں کے آگے سے پردہ اٹھ جاتا ہے اور کبھی آنکھوں کے آگے پردہ گر جاتا ہے۔ نجمی کی آنکھوں کے آگے پردہ گر چکا تھا۔ ہم مشرقی لوگ جس معاشرے میں زندگی بسر کر رہے ہیں اس میں مرد لوگ تو زندگی کی کشادہ شاہراہ پر بے خطری اور بے خوفی سے سفر کرتے ہیں۔ وہ ہر پڑاؤ پر ایک نیا معاشقہ کرتے چلے جاتے ہیں اور وہ کسی کے آگے جواب دہ نہیں ہوتے لیکن ہمارے معاشرے میں عورت کو چاہے وہ شادی شدہ ہو چاہے غیر شادی شدہ ساری زندگی ایک ایسی پل صراط پر سے گزرنا پڑتا ہے کہ ذرا سی ڈگمگاہٹ اسے زندگی بھر کے لئے مردوں کی بنائی ہوئی ذلت کی دلدل میں گرا دیتی ہے۔

نجمی کو اپنی پسند کی شادی کا پورا پورا حق تھا اس نے اپنے اس حق کے حصول کا ہی فیصلہ کیا تھا لیکن وہ یہ بھول گئی تھی کہ اس کے اردگرد مشرقی روایات کی مکڑیوں کا جالا تنا ہوا ہے۔ جسے وہ بڑی آسانی کے ساتھ ذرا سا ہاتھ ہلانے ذرا سا پاؤں باہر نکالنے سے تہس نہس کر سکتی ہے مگر اس جالے کو توڑ کر وہ اس میں بری طرح سے الجھنے والی تھی۔ پھر اس جالے سے نجات تقریباً ناممکن تھی۔ اس نے ندیم سے کہا۔ "میں تھوڑی دیر کے لئے گھر جاؤں گی۔ ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے اسی ریفریشمنٹ روم میں پہنچ جاؤں گی۔ دیکھو میں تمہاری خاطر اتنا بڑا قدم اٹھا رہی ہوں۔ اب کہیں تم مجھے چھوڑ نہ جانا۔"

ندیم نے آہستہ سے نجمی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ "نجمی! تمہارے ساتھ جیوں گا، تمہاری خاطر مروں گا۔" نجمی نے اپنے اندر بے پناہ طاقت محسوس کی۔ لاہور ریلوے اسٹیشن سے نکل کر نجمی اپنے اندرون شہر والے مکان کی طرف اور ندیم مال روڈ والے ٹیلی فون اینڈ ٹیلی گراف آفس کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے پاس وقت کم

تھا خوش قسمتی سے دوسری طرف سے زمان ہی بول رہا تھا۔ ندیم ٹیلی فون بوتھ میں تھا۔ اس نے کہا۔

"زمان میں ندیم لاہور سے بول رہا ہوں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں نے تمہیں بڑی ضروری بات کرنے کے لئے فون کیا ہے۔ میری بات غور سے سنو۔ . . ."

ندیم نے مختصر لفظوں میں زمان کو ساری بات سمجھا دی اور فون بند کر کے باہر آ کر بل ادا کیا اور سیدھا اپنے گھر آ گیا اسے معلوم تھا کہ دو چار دنوں کے بعد واپس اسی گھر میں اپنی بیوی نجمی کے ساتھ آ جائے گا۔ اس لئے اسے وہاں سے کچھ بھی اٹھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اپنی الماری میں اس نے تین سو روپیہ بچا بچا کر رکھا ہوا تھا۔ یہ رقم اس نے بٹوے میں رکھ لی اور انہی کپڑوں میں گھر سے نکل گیا۔

ٹیکسی پکڑ کر وہ سیدھا بڑے ڈاکخانے میں آ گیا۔ یہاں اس نے ایک پوسٹ کارڈ خریدا۔ اس پر اپنے والد صاحب کے نام چند جملے لکھے کہ اسے ایک ضروری کام سے پشاور جانا پڑ گیا ہے۔ صورت حال ایسی پیدا ہو گئی ہے کہ میں گھر آ کر آپ کو اطلاع نہیں دے سکتا۔ دو یا تین دنوں میں واپس آ جاؤں گا آپ بالکل فکر نہ کریں میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ پوسٹ کارڈ پر اپنے گھر کا پتہ لکھ کر اس نے پوسٹ کر دیا۔ اسے کوئی شے ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ کراچی میں زمان کے ہوٹل میں سب کچھ موجود تھا صرف انہیں ایک رات ہی ٹرین میں بسر کرنی تھی۔ دوسرے روز انہیں کراچی پہنچ جانا تھا جہاں نکاح خواہ تیار ہو گا اور ان کی شادی ہو جائے گی دو ایک روز کراچی ہوٹل میں ٹھہرنے کے بعد وہ واپس لاہور آ جائیں گے اور انشاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

انہی خیالات میں کھویا ہوا ندیم گیارہ بجے ہی لاہور ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا اب اسے نجمی کی طرف سے فکر لگی تھی۔ ممکن تھا کہ وہ اپنا ارادہ بدل ڈالے۔ آخر لڑکی ہے اور پہلی بار گھر سے باہر قدم نکال رہی ہے۔ ایک لڑکی کے لئے یہ ایک بہت بڑا فیصلہ تھا۔

ندیم پہلے تو پلیٹ فارم پر ٹہلتا رہا۔ اس نے تین سگریٹ پھونک ڈالے۔ کراچی تک سیکنڈ کلاس کے اس نے دو ٹکٹ خرید کر رکھ لئے تھے۔ ساڑھے گیارہ بجے وہ اسٹیشن کی لابی میں آ کر ایک ستون کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ اس کی نگاہیں پورچ میں داخل ہوتی گاڑیوں، ٹیکسیوں اور تانگوں پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے حلق کا ذائقہ کڑوا ہو گیا تھا۔ سگریٹ کا مزہ جاتا رہا تھا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ پونے بارہ بج رہے تھے۔ پلیٹ نمبر ۴ پر کراچی جانے والی گاڑی آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

ندیم بے چینی کے عالم میں ہر آنے والی ٹیکسی اور تانگے اور رکشے کو تک رہا تھا پینتالیس منٹ بعد ٹرین کو کراچی روانہ ہو جانا تھا۔ نجمی ابھی تک نہیں آئی تھی پھر بارہ بج گئے۔ ندیم ناامید ہو گیا۔ نجمی نہیں آئے گی۔ گھر کی دہلیز نے اس کے پاؤں پکڑ لئے ہیں۔ لڑکی چاہے کتنی پڑھ لکھ جائے وہ لڑکی ہی رہتی ہے۔ اسے مرزا صاحباں کے پنجابی بول یاد آنے لگے جن میں جٹ وجھل پنجاب کے دلبر عاشق مرزے کو سمجھاتا ہے کہ دیکھو ان عورتوں کی باتوں کا اعتبار نہ کرو۔ یہ پہلے ہنس ہنس کر دوستی کرتی ہیں اور بعد میں روتی ہوئی پیچھے ہٹ جاتی ہیں۔

"فیر رو کے دیندیاں" اس کا ترجمہ اردو میں شاید نہیں ہو سکتا۔ ندیم کے ذہن میں بھی پنجابی کے بول ہی گونج رہے تھے۔ ندیم نے سگریٹ پھینک دیا۔ وہ نجمی کی طرف سے ناامید ہو گیا تھا کہ اچانک ایک رکشا پورچ میں آ کر رکا اور اس میں سے نجمی باہر نکلی۔ ندیم نے جٹ وجھل کو مخاطب کر کے کہا تم عورتوں کو نہیں سمجھ سکے مسٹر۔ عورت اگر کمزور ہے تو اس سے زیادہ طاقتور کوئی ذی روح بھی اس دنیا میں نہیں ہے۔ وہ بے اختیار ہو کر نجمی کی طرف بڑھا۔ نجمی کے پاس بھی کوئی بریف کیس وغیرہ نہیں تھا۔ صرف ایک بڑا پرس تھا جو اس نے کاندھے سے لٹکا رکھا تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ دونوں کے چہرے آنے والی خوشیوں کے تصور سے جگمگا اٹھے۔ ندیم نے کہا۔ "جلدی چلو۔ ٹرین تیار ہے۔" وہ پل عبور کر کے پلیٹ فارم نمبر چار پر آ گئے کراچی جانے والی گاڑی ان کا انتظار کر رہی تھی۔

کراچی ایکسپریس چھوٹے چھوٹے اسٹیشن چھوڑتی کراچی کی طرف اڑی جا رہی تھی نجمی کو ندیم نے سیکنڈ کلاس کے زنانہ کمپارٹمنٹ میں بٹھایا تھا۔ ڈبے میں دوسری مسافر عورتیں بھی بیٹھی تھیں ان کے بچے بھی ساتھ تھے۔ نجمی کھڑکی کے بند شیشے سے سر لگائے مسلسل باہر کھیتوں کو پیچھے کی طرف جاتے دیکھ رہی تھی۔ دن کے دو تین بجے تک گھر میں کسی کو پتہ نہیں چلے گا کہ وہ گھر سے بھاگ گئی ہے۔

اس کے بعد جب وہ کالج سے گھر واپس نہ پہنچی تو اس کی سوتیلی ماں کو پریشانی ہوگی اور جب رات ہوگی تو اس کے ابوجان کی جو حالت ہوگی اس کا خیال کر کے نجمی کا دل پھٹا جاتا تھا مگر وہ مجبور تھی۔ اگر اس کے ابوجان میں اپنی بیٹی کے مستقبل کو تباہی سے بچانے کی ہمّت ہوتی تو نجمی کبھی گھر سے باہر قدم نہ نکالتی وہ تو اپنی دوسری بیوی اور نجمی کی سوتیلی ماں کے سامنے آنکھ اٹھا کر بات نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کی بیٹی کو ایک ادھیڑ عمر شادی شدہ شخص کے حوالے کیا جا رہا ہے لیکن وہ خاموش تھے وہ اپنی بیٹی کو تباہی کے اندھے کنوئیں میں گرتے خاموشی سے دیکھ رہے تھے مگر نجمی ایک پڑھی لکھی اور ہوش مند لڑکی تھی۔

اسلام نے اسے اپنی پسند کی شادی کرنے کا پورا پورا حق دیا تھا اگرچہ وہ گھر سے فرار ہو کر ایک [illegible] اور غیر ذمہ دارانہ قدم اٹھا چکی تھی لیکن اس کے سوا کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا۔ وہ اپنی زندگی، اپنے مستقبل اور اپنی آئندہ

نسل کو تباہ ہونے سے بچانا چاہتی تھی وہ اپنی پسند کی شادی کر کے اپنی تمناؤں کے مطابق پرسکون زندگی بسر کرنا چاہتی تھی۔ وہ بار بار یہ کہہ کر اپنے ضمیر کو تسلی دے رہی تھی کہ آج کراچی پہنچ کر وہ ندیم سے شادی کرے گی اور کل وہ لاہور واپس روانہ ہو جائے گی اور اپنے شرعی خاوند کے ساتھ اپنے ماں باپ کے قدموں پر گر کر ان سے معافی مانگ لے گی سب انہیں معاف کر دیں گے۔ آخر وہ شادی کرنے جا رہی ہے صرف دو دنوں کی تو بات ہے یہ دو دن اس کے ابوجان کو بے حد اذیت ضرور دیں گے لیکن نجمی کی ساری زندگی، سارا مستقبل تباہ و برباد ہونے سے بچ جائے گا یہ اس کا حق تھا وہ کوئی ناجائز کام نہیں کر رہی تھی۔

کراچی میں جاتے ہی ان کا باقاعدہ شرعی نکاح پڑھایا جائے گا اور وہ قانونی طور پر ندیم کی بیوی بن جائے گی۔ ٹرین ایک بڑے اسٹیشن پر رکی۔ ندیم دوسرے کمپارٹمنٹ سے بھاگتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔ نجمی نے کھڑکی کا شیشہ گرا دیا۔

"تم ٹھیک ہو ناں؟" ندیم نے کسی قدر تشویش کے ساتھ پوچھا۔ نجمی نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔" ندیم نے فوراً اسے ٹھنڈا مشروب پلایا اور اسے حوصلہ دیتا رہا کہ نجمی ہم کوئی گناہ نہیں کر رہے صرف گھر سے چلے جانے کی تکلیف ضرور دی ہے ہم نے اپنے ماں باپ کو... لیکن کل صبح ہی ہم لاہور واپس چل پڑیں گے اور اس وقت ہم میاں بیوی ہوں گے۔ نجمی نے اداس نگاہوں سے ندیم کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کیا لاہور میں رہ کر ہم شادی نہیں کر سکتے تھے؟" ندیم نے کھڑکی کے قریب آتے ہوئے کہا۔

"وہاں بڑا مشکل تھا نجمی... وہاں بات نکل جاتی اور ہمیں کوئی شادی نہ کرنے دیتا... اب تم ایسی باتیں مت سوچو... رات کو ہم کراچی پہنچ جائیں گے۔ زمان نے وہاں نکاح خواں کو بٹھا رکھا ہوگا... گواہ بھی موجود ہوں گے... جاتے ہی ہمارا

بیاہ ہو جائے گا... اور صبح پہلی گاڑی میں ہم واپس لاہور چل پڑیں گے۔" گاڑی نے سیٹی بجائی... ندیم نے ایک بار پھر نجمی کو تسلی دی اور اپنے ڈبے کی طرف دوڑا...
ٹرین ایک بار پھر اپنے سفر پر چل پڑی۔ نجمی کے ساتھ جو بھاری بھرکم عورت بیٹھی تھی اس سے باتیں کرنے لگ گئی جیسا کہ ہمارے ہاں لوگوں کی عادت ہے وہ کرید کرید کر نجمی سے پوچھنے لگی کہ وہ کراچی کیوں جا رہی ہے؟ لاہور میں کہاں رہتی ہے جو لڑکا ہر اسٹیشن پر اس کو پوچھنے کے لئے آتا ہے کون ہے؟

نجمی نے اسے مختصر لفظوں میں بتایا کہ وہ کراچی اپنی خالہ سے ملنے جا رہی ہے اور یہ لڑکا اس کا خالہ زاد ہے۔ اس کے بعد وہ اخبار پڑھنے لگ گئی اسے معلوم تھا کہ کراچی تک یہ عورت اس کی جان کھا جائے گی۔ عورت نجمی کو اخبار پڑھتے دیکھ کر بھی باز نہ آئی اور پوچھنے لگی کہ کراچی میں اس کی خالہ کہاں رہتی ہے، اس کے خالو کیا کاروبار کرتے ہیں۔ کیا سرکاری آفیسر ہیں؟ نجمی نے کہا۔ "وہ ریلوے میں افسر ہیں"۔ عورت نے خوش ہو کر کہا۔

"جب تو تم ریلوے پاس پر سفر کر رہی ہو گی۔"

نجمی تنگ آکر اپنی سیٹ پر لیٹ گئی اور بولی۔ "میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔" اور اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھیں بند کرتے ہی اس کے سامنے اس کی اپنی مرحوم والدہ کی شکل آگئی۔ کس قدر سنجیدہ اور خاموش خاموش شکل ہوا کرتی تھی اس کی امی کی... نجمی کو وہ دن یاد آگیا جب وہ اسے اپنے ساتھ لے کر رنگ محل مشن ہائی اسکول میں داخل کرانے گئی تھی۔

اس کی امی نے نسواری برقعہ اوڑھ رکھا تھا۔ نجمی کو پانچویں جماعت میں داخل کرانا تھا۔ نجمی کی امی نے اسے کوچہ قاصداں میں سے گزرتے ہوئے بتایا کہ جب میں رنگ محل مشن ہائی اسکول میں پڑھتی تھی تو وہاں کی پرنسپل ایک گوری میم ہوا کرتی تھی اس کا نام مس ایبل تھا۔ وہ گھر گھر جا کر لوگوں سے کہتی کہ اپنی بچیوں کو اسکول میں داخل کراؤ۔

مس ایبل امریکہ کی رہنے والی گوری چٹی دبلی پتلی میم تھی۔ وہ موچی دروازے اور رنگ محل کی تنگ و تاریک گلیوں میں ناک پر رومال رکھے بغیر گزرتی اور اندھیری ڈیوڑھیوں والے مکانوں کی تنگ سیڑھیاں چڑھ کر لوگوں سے انتہائی خوش اخلاقی سے بات کرتی اس کے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ رہتی تھی۔

نجمی کی امی نے اسے یہ بھی بتایا کہ ایک بار مس ایبل کوچہ نیر گراں میں سے گزر رہی تھی کہ اسے وہاں ایک کوڑھی عورت دکھائی دی جو گندی نالی کے پاس پڑی تھی اور اس پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ مس ایبل نے اپنے رومال سے اس عورت کا چہرہ صاف کیا اور اسے سہارا دیتی ہوئی باہر سڑک تک لائی.... پھر تانگے میں بٹھا کر اسے اسپتال لے گئی۔

نجمی کی بند آنکھوں میں اپنی مرحوم والدہ کا چہرہ خاموش تھا۔ پھر جیسے اس کی والدہ نے اسے آہستہ سے کہا... "بیٹی تیرے باپ کو بڑا دکھ ہو گا۔ تیرے باپ نے ساری زندگی مجھے کوئی سکھ نہیں دیا... مگر تو اسے دکھ نہ دے۔"

نجمی نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ ٹرین دھڑ دھڑاتی ہوئی ایک چھوٹے اسٹیشن کو چھوڑ رہی تھی۔ نجمی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ اس نے دور کھیتوں کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی والدہ کی روح سے کہا.....

"امی جان! میں کیا کروں؟ میں آپ کی طرح اپنی زندگی جہنم میں نہیں گزار سکتی۔ آپ نے خودکشی گوارا کر لی تھی۔ میں ایسا نہیں کر سکتی... اور پھر کوئی گناہ نہیں کر رہی... میں اپنی پسند کی شادی کرنے جا رہی ہوں۔ ابو جان کو آخر اپنی بیٹی کا خیال کیوں نہیں ہے؟ کیا میں ان کی بیٹی نہیں ہوں؟ کیا انہیں میرے مستقبل کا خیال نہیں ہونا چاہیے؟ مگر ان پر تو میری سوتیلی ماں نے جادو کر دیا ہوا ہے... جو وہ کہتی ہے وہی کرتے ہیں... جدھر وہ کہتی ہے ادھر کو ہی آنکھیں بند کر کے چل پڑتے ہیں میں اب رنگ محل مشن ہائی اسکولوں کے زمانے کی لڑکی نہیں ہوں... میں ایم اے میں پڑھ رہی ہوں اور شادی کے بعد سب سے پہلے اپنی تعلیم مکمل کروں گی۔ میرا

خاوند بھی اپنی تعلیم جاری رکھے گا۔ پھر ہم دونوں ڈاکٹریٹ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہم نوکری بھی کریں گے اور اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کریں گے۔ میری پیاری شریف اور بزدل امی جان مجھے معاف کر دینا۔ ۔ میں بغاوت ضرور کر رہی ہوں مگر یہ بغاوت ایک خوش آئند اور سنہری مستقبل کے لئے کر رہی ہوں۔

"بیبی چائے پیو گی؟"

نجمی اپنے خیالات سے چونک پڑی۔ اس کی ہم سفر خاتون تھرماس میں سے چائے کا کپ بھر کر نجمی کو پیش کر رہی تھی۔ نجمی نے شکریہ ادا کر کے کپ لے لیا اور چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ نگلنے لگی۔ اسے ان تمام لڑکیوں کا خیال آنے لگا جنہوں نے ہلاکت خیز فرسودہ روایات کے خلاف بغاوت کی اور آنے والی لڑکیوں کے لئے قربانیاں دے کر راستہ ہموار کیا۔ ۔ مگر جب شام ہو گئی اور ٹرین کے باہر میدانوں میں اندھیرا چھا گیا تو نجمی کا دل بیٹھنے لگا۔ ۔ ۔ اب گھر میں اس کے فرار کا علم ہو گیا ہو گا۔ اس کے ابو جان اپنے کمرے کے پلنگ پر پریشانی کی حالت میں سر پکڑ کر بیٹھے ہوں گے۔ اس کی سوتیلی ماں انہیں کوس رہی ہو گی کہ ان کے بے جا لاڈ پیار نے ہی بچی کو خراب کیا ہے۔ سوتیلی ماں کسی کو نہیں بتائے گی کہ نجمی گھر سے فرار ہو گئی ہے۔

پولیس کو رپورٹ کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا مگر وہ اس خیال سے بے حد پریشان ہو گی کہ نجمی کو کہاں تلاش کرے؟ وہ فوراً یہ پتہ کروائے گی کہ کیا ندیم بھی گھر پر نہیں ہے مگر وہ ندیم کے ماں باپ سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کرے گی کیونکہ اگر اس کے ہونے والے بوڑھے داماد پرویز کو علم ہو جاتا ہے تو سارے کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا ہو سکتا ہے پھر وہ نجمی سے شادی کرنے پر تیار نہ ہو۔ وہ انکار کر دے اور نجمی کی سوتیلی ماں گلبرگ والی کوٹھی، زیورات اور اپنے پچاس ہزار روپے سے محروم ہو جائے۔

نجمی کو بار بار اپنے ابو کا خیال آ رہا تھا کہ انہیں بیٹی کے گھر سے بھاگ جانے کا بے حد صدمہ ہو گا۔ نجمی کو یہ غم بھی تھا کہ کہیں اس صدمے کی تاب نہ لاتے ہوئے

انہیں خدا نہ کرے کچھ ہو نہ جائے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ نجمی کے باپ کو اپنی بیٹی کے مستقبل کا خیال نہ تھا اگر خیال تھا بھی تو وہ اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے باوجود نجمی کو اپنے باپ سے محبت تھی جس طرح کہ لڑکیوں کو اپنے باپ سے محبت ہوا کرتی ہے چاہے باپ ان کا خیال رکھیں چاہے نہ رکھیں۔ ماں باپ اور بھائی کا رشتہ ایک ایسا رشتہ ہوتا ہے کہ لڑکی اس رشتے کے تقدس پر کبھی آنچ نہیں آنے دیتی۔ ۔ ۔ پھر نجمی کو اپنی پیاری اور رازدار سہیلی ثریا کا خیال آ گیا اسے اس خیال سے ضرور افسوس ہو گا کہ نجمی نے گھر سے بھاگنے سے پہلے اس سے مشورہ تک نہیں کیا لیکن ہو سکتا ہے وہ اس کے ابو جان کے پاس جا کر انہیں تسلی دے کہ نجمی بہت جلد واپس آ جائے گی۔

نجمی ایسی لڑکی نہیں ہے جو ناجائز طور پر گھر سے فرار ہو۔ ۔ ۔ ممکن ہے وہ انہیں یہ بھی بتا دے کہ نجمی ندیم کے ساتھ گئی ہو گی اور وہ شادی کرنے کے فوراً بعد واپس آ جائیں گے عجیب صورتحال تھی۔ نجمی کبھی کچھ سوچتی، کبھی کچھ سوچتی، کبھی اسے خیال آتا کہ اس نے شادی کے لئے ہی سہی مگر گھر سے بھاگ کر سخت غلطی کی ہے اور اسے اگلے اسٹیشن سے ہی واپس چلے جانا چاہیئے اور کبھی یہ سوچتی کہ اس نے وہی کچھ کیا ہے جو ایک پڑھی لکھی، اپنے حقوق سے باخبر اور اپنی زندگی تباہ نہ ہوتے دیکھنے والی لڑکی کو کرنا چاہیئے تھا۔

گاڑی رات ڈیڑھ بجے کے قریب کراچی اسٹیشن کے پلیٹ فارم میں داخل ہوئی اس خیال سے کہ گھر والوں کو اس کے فرار کا علم ہو گیا ہے اور جو کچھ گزرنی تھی گزر گئی ہے نجمی کے ذہن سے ایک بوجھ سا اتر گیا تھا۔ اب اس کی ساری توجہ اس طرف تھی کہ جتنی جلدی ہو سکے ندیم سے اس کا نکاح ہو جائے تاکہ وہ قانونی اور شرعی طور پر اس کی بیوی بن جائے اور اگلے دن پہلی گاڑی سے واپس لاہور روانہ ہو جائے۔ اسٹیشن پر ندیم کا کراچی والا دوست زمان انہیں لینے آیا ہوا تھا۔ ایک خوش لباس، خوش شکل مضبوط جسم والا آدمی سگریٹ پاؤں تلے مسلتا ہوا ندیم کی طرف بڑھا اسے گلے لگایا اور نجمی کی طرف دیکھ کر اسے سلام کیا اور کہا۔ ۔ ۔ آداب عرض بھابی جان!"

نجمی نے شرم سے سر جھکا لیا۔۔۔ اسے زمان کا بھابی جان کہنا بہت اچھا لگا تھا گویا اسے ندیم کی بیوی تسلیم کر لیا گیا تھا۔ یہ بڑی اچھی بات تھی وہ بھی یہی چاہتی تھی کہ ایسی ہی فضاء میں اس کا خیر مقدم ہو۔ زمان ندیم کو ایک طرف لے گیا۔ اس سے دو تین باتیں کیں اور پھر اس کے کاندھے پر ہاتھ مار کر کچھ کہا اور دونوں مسکراتے ہوئے نجمی کی طرف بڑھے۔ نجمی کو یہ رازداری اور ان کا عجیب انداز میں باہم مسکرانا اچھا نہ لگا۔ ندیم نے آ کر بتایا۔

"زمان کہہ رہا ہے کہ نکاح خواں صاحب رات بارہ بجے واپس جانے لگے تھے مگر میں انہیں چائے کی جینک سامنے رکھ کر اپنے کمرے میں چار گواہوں کے پاس بٹھا کر آیا ہوں۔"

نجمی کے دل میں جو ہلکا سا شبہہ پیدا ہوا تھا وہ دور ہو گیا۔ زمان کی گاڑی اسٹیشن کے باہر کھڑی تھی۔۔۔ کافی چمکیلی اور قیمتی کار لگتی تھی۔ زمان نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور بڑے ادب سے کہا۔

"بیٹھئے بھابی جان۔" پھر اس نے ندیم سے کہا۔

"ندیم تم بھابی جان کے ساتھ ہی پیچھے بیٹھ جاؤ۔" زمان خود آگے بیٹھ گیا اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور وہ کراچی کی کشادہ روشن مگر ویران ویران سڑک پر روانہ ہو گئی۔ نجمی کا کراچی میں کوئی رشتے دار نہیں تھا مگر وہ دو ایک بار کالج کی لڑکیوں کے ساتھ کراچی آ چکی تھی۔ اسے کراچی کی صرف کلفٹن اور بندر روڈ ہی یاد تھا یا پھر کیماڑی میں انہوں نے اسٹیمر میں بیٹھ کر سمندر کی سیر کی تھی اس کے سوا نجمی کو کراچی کی سڑکوں کا کچھ علم نہیں تھا۔

ندیم اس کے پاس پچھلی سیٹ پر بیٹھا اسے تھوڑی تھوڑی دیر بعد تسلی کے دو بول کہہ دیتا تھا۔۔۔ نجمی نے آہستہ سے کہا۔ "میرے ابو جان کو بہت صدمہ ہوا ہو گا۔"

ندیم نے اس کے ہاتھ کو محبت سے دباتے ہوئے کہا۔ "دو ایک دن کی بات

ہے نجمی۔۔۔ جب میاں بیوی بن کر ان کے پاس جائیں گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔ زمان نے سارا بندوبست کر رکھا ہے بس جاتے ہی ہمارا نکاح پڑھا دیا جائے گا۔"

زمان اگلی سیٹ پر بیٹھا گاڑی چلا رہا تھا۔۔۔ ذرا اونچی آواز میں پیچھے دیکھے بغیر بولا۔ "بھابی! ہم نے چھوہارے بھی منگوا رکھے ہیں۔" اور پھر خود ہی ہلکا سا قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"بھئی ہمارے پیارے دوست کی شادی ہو رہی ہے۔۔۔ اگرچہ شادی ذرا دوسرے حالات میں ہو رہی ہے لیکن کوئی بات نہیں۔۔۔ جب آپ لوگ لاہور جا کر کراچی آئیں گے تو میں اپنے ہوٹل میں شاندار دعوت کروں گا۔"

ندیم نے مسکرا کر نجمی کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔۔۔ دیکھا میرا دوست کتنا اچھا ہے۔۔۔ ایسے ہوتے ہیں جگری یار۔۔۔ نجمی نے شرما کر سر جھکا لیا اور پھر گردن گھما کر باہر دیکھنے لگی۔ گاڑی اونچی اونچی عمارتوں والی کسی سڑک پر سے گزر رہی تھی۔ ندیم نے نجمی کو اس سڑک کا نام بتایا اور بولا۔

"بس اب ہمارا ہوٹل قریب ہی ہے۔"

گاڑی ایک نسبتاً چھوٹی سڑک پر مڑ گئی۔۔۔ یہاں فاصلے فاصلے پر کوارٹر نما مکان بنے ہوئے تھے جن کے روشندانوں پر اندھیرا چھایا ہوا تھا صرف صحن کے اندر کے بلب روشن تھے۔ اس چھوٹی سڑک کے کونے پر جا کر گاڑی نے ایک اور موڑ کاٹا اور ایک دو منزلہ عمارت کے احاطے میں جا کر کھڑی ہو گئی۔

نجمی نے کھڑکی میں سے ایک نظر عمارت کو دیکھا اس کی وضع قطع پرانی طرز کی تھی مگر رنگ روغن خوب کیا ہوا تھا۔ سامنے والے برآمدے میں سے ایک آدمی گاڑی کے ہارن کی آواز پر آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر گاڑی کے پاس آ گیا۔ اس نے زمان کو سلام کیا۔ زمان نے اسے کہا اوپر والا کمرہ کھول دو۔۔۔ اور وہ لوگ کہاں ہیں؟ اس اونگھتے ہوئے چوکیدار قسم کے آدمی نے بتایا کہ اوپر بیٹھے ہیں صاحب جی

زمان نے کار کا دروازہ کھول کر نجمی سے کہا "آیئے بھابی جان"۔ پھر ندیم کی طرف مخاطب ہو کر مسکراتے ہوئے بولا۔

"مجھے ڈر تھا کہ کہیں نکاح خواں صاحب فرار نہ ہو گئے ہوں مگر چوکیدار نے بتایا ہے کہ وہ لوگ اوپر ہی بیٹھے ہیں۔ . . . خدایا تیرا شکر ہے۔ . . . اس نیک کام سے فارغ ہوتے ہی سجدہ شکر ادا کروں گا۔"

ندیم زمان کا شکریہ ادا کرنے لگا۔ . . زمان نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "ارے شکریہ کس بات کا ادا کر رہے ہو؟ دیکھو بھابی! ندیم کیسی اوپری اوپری باتیں کر رہا ہے۔ . . . بھئی یہ تو نیک کام ہے اور پھر تمہارے لئے تو جان بھی حاضر ہے۔ . . آؤ۔ . . اوپر چلتے ہیں۔"

زمان آگے آگے، ندیم اس کے پیچھے اور نجمی ندیم کے ساتھ ساتھ ہوٹل میں داخل ہو گئی۔ ہوٹل کی سیڑھیاں تنگ سی تھیں اور صرف دوسری منزل کی ڈیوڑھی میں، ایک مدہم سا بلب روشن تھا۔ زمان ان دونوں کو ایک کمرے میں لے آیا جہاں شاندار سجے ہوئے پلنگ کے چاروں طرف کاغذ کے پھولوں کے ہار لٹک رہے تھے۔ نجمی کا دل دھڑکنے لگا۔ ان دھڑکنوں میں خوشی کی لذت بھی تھی اور ایک خوف کا احساس بھی تھا۔ اپنے ابو کو، اپنی مرحوم ماں کو یاد کر کے نجمی کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے . . . . کاش وہ اپنے ہاتھوں سے نجمی کی شادی ندیم سے کرتے . . . خود اسے دلہن بنا کر رخصت کرتے۔

زمان نے نجمی سے کہا "بھابی! آپ تشریف لائیں . . . باتھ روم ساتھ ہی ہے منہ ہاتھ دھو کر تیار ہو جائیں . . . معافی چاہتا ہوں میری یہاں کوئی بہن نہیں تھی ورنہ وہی آپ کو دلہن بناتی۔"

پھر وہ ندیم کی طرف متوجہ ہو کر ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولا . . . "ندیم! یار تم یہاں کیا کر رہے ہو . . . چلو میرے ساتھ . . . پہلے نکاح کے چار بول تو پڑھا لو۔"

نجمی نے ندیم کو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور آہستہ سے بولی۔

"زمان بھائی جان سے کہہ کر کل کی گاڑی پر لاہور جانے کے لئے سیٹیں ریزرو کروالینا۔"

زمان نے ہنس کر کہا "ارے بھابی جان! آپ کیوں فکر کرتی ہیں کیا مجھے معلوم نہیں کہ آپ کا جلد سے جلد لاہور واپس جانا کتنا ضروری ہے۔ . . . یہ فکر آپ مجھ پر چھوڑ دیں . . . . صبح ہوتے ہی پہلا کام یہی کروں گا . . . آؤ ندیم . . . نکاح خواں اور گواہ کہیں پھر فرار نہ ہو جائیں۔"

زمان اور ندیم کے نکلتے ہی نجمی نے حجلہ عروسی کا دروازہ بند کر کے اندر سے چٹخنی لگا دی . . . . اس نے کاغذی پھولوں کے سہروں اور ہاروں سے سجے ہوئے پلنگ کو ایک نظر دیکھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

وہ پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی۔ سرہانے کی جانب تپائی پر ایک تھرماس اور دو گلاس پڑے تھے۔ کمرے کی فضا میں ولایتی پرفیوم کی دھیمی دھیمی مہک رچی ہوئی تھی۔ چھت سے لگا ہوا پنکھا آہستہ آہستہ چل رہا تھا جس کی ہوا سے سہرے کی لڑیاں اور پھولوں کے ہار ادھر اُدھر لہرا رہے تھے۔ دیوار کے ساتھ ایک طرف پرانی طرز کا سنگار میز لگا ہوا تھا جس پر بالوں میں پھیرنے والا برش اور کنگھی پڑی تھی۔ نجمی کے بڑے پرس میں ضروری سامان موجود تھا۔ مگر یہ پرس ابھی تک نجمی کی گود میں ہی پڑا تھا۔

اس نے پرس میں سے چھوٹا سا رومال نکال کر اپنی آنکھیں صاف کیں اور اپنا اداس چہرہ اٹھا کر لہراتی ہوئی کاغذی پھولوں کی لڑیوں کو دیکھا . . . کیا واقعی یہ اسی کا حجلہ عروسی تھا؟ کیا وہ اسی حجلہ عروسی کی دلہن تھی؟ کیا گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ فرمانبردار اور نیک دلہنوں کی طرح اپنا حجلہ عروسی سجائے؟

نجمی کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو گرنے لگے۔ اس کا ضمیر اسے ملامت کرنے لگا کہ وہ اپنے باپ کے اعتماد کا خون کر کے اپنے ہاتھوں پر شادی کی مہندی

رچانے آئی ہے... یہ کیسی شادی ہے کہ نہ اس کی ماں ہے نہ سہیلیاں ہیں، نہ ڈھولک پر کسی نے گیت گائے ہیں، نہ کسی ماموں نے کہارے سے اتارا ہے؟ ایک سیکنڈ کے اندر اندر اس کے ذہن میں کئی طرح کے خیالات، کئی طرح کی ملامتیں، کئی طرح کے تصورات ہلچل مچا کر گزر گئے۔ وہ ایک دم پلنگ پر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔۔ اس نے سنگار میز کے آئینے میں اپنی شکل دیکھی... اس کی شکل ایسی حالت میں بھی خوبصورت تھی اور اس پر ایک آہنی عزم کا پرتو تھا۔

نجمی نے اپنے ہونٹوں کو بھینچ لیا اور جیسے اس کے دل نے کہا "کیسی منگنی؟ کیسا تیل مہندی؟ کیا بر دکھاوا اور آرسی مصحف اور عروسی کا جوڑا اور شب عروسی اور حجلہ عروسی اور ایٹن اور کھارا اور مکلاوہ! اور ولیمہ؟ یہ سب شو بزنس ہے اگر دل میں مجبوری کا خنجر اتر گیا ہو... شادی تو دو دلوں کا ایک دوسرے کو پسند کرنا اور اقرار کرنا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے اور تم نے ندیم کو پسند کر لیا ہے تیرے ماں باپ نے تیرے سینے میں اپنے جبر کا، اپنے مفادات کا، اپنی لالچوں کا خنجر اتار دینا چاہا تھا۔ تو نے اپنے حق کے لئے بغاوت کی، سچ کے لئے بغاوت کی، نیچر کی ایک زندہ اور سب سے بڑی قدر کے لئے بغاوت کی ہے۔

تیری شادی حجلہ عروسی کی محتاج نہیں ہے حجلہ عروسی تیری شادی کا محتاج ہے...

اٹھ... اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جا اور باتھ روم میں چل کر منہ ہاتھ دھو، نئے کلر کی لپ سٹک لگا بالوں کو پہلے سے حسین ترین انداز میں سجا، آنکھوں کو قدرت کی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ آراستہ کر اور پھر نیچر کے فتنہ سامان مناظر کو اپنی آنکھوں کے سامنے اچھائیوں اور برائیوں کے تمام ضابطوں کو تنکوں کی طرح اڑاتے ہوئے دیکھ۔

نجمی کے چہرے پر اچانک وہ چمک آ گئی جو سورج کی پہلی کرن کے طلوع ہونے کے ساتھ ہی برف پوش چوٹیوں پر آتی ہے۔ اس نے اپنے پرس میں سے میک اپ کا مختصر سامان نکال کر سنگار میز پر رکھا اور منہ دھونے، تیار ہونے باتھ روم میں چلی گئی۔ چل اے غم نصیب، ہجر نصیب دلہن! آج تیری شادی کی رات ہے۔

ابھی زمان ندیم کو لے کر ساتھ والے کمرے میں داخل بھی نہیں ہوا تھا کہ نجمی ان تمام نفسیاتی اور روحانی ہیجان کے طوفانوں میں سے گزر گئی تھی اور باتھ روم میں منہ ہاتھ دھو رہی تھی۔ زمان نے دوسری منزل پر نجمی کے کمرے سے دو کمرے چھوڑ کر تیسرے کمرے کا دروازہ کھول دیا اور ندیم کو لے کر اندر داخل ہو گیا۔

کمرے میں صوفے پر تین آدمی بیٹھے تھے۔ انہوں نے اچکنیں پہن رکھی تھیں اور سروں پر شریفانہ ٹوپیاں تھیں... صاف لگ رہا تھا کہ وہ نکاح میں شریک ہونے کے لئے آئے ہیں... گول میز پر چھوہاروں کی پوٹلی پڑی تھی۔ زمان نے اندر داخل ہوتے ہی ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بھائی صاحب! نکاح خواں کہاں ہیں؟" ایک اچکن پوش صاحب نے جن کے منہ پر چیچک کے داغ تھے بڑی مایوسی کے عالم میں گردن ہلا کر کہا۔ "جناب وہ تو ایک گھنٹہ ہوا تھک ہار کر چلے گئے ہم نے انہیں بہت روکا مگر کہنے لگے کہ لڑکے والوں نے بڑی دیر کر دی ہے... میں ساری رات نہیں جاگ سکتا۔"

زمان اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا... ندیم بھی بہت پریشان ہو گیا۔ دوسرا اچکن پوش آدمی ٹوپی اتارتے ہوئے اٹھ کر بولا۔ "میرے محترم اب ہمیں بھی اجازت دیجئے... نکاح خواں کے بغیر ہمارا یہاں ٹھہرنا بیکار ہے... نکاح کی رسم اب کل پر ڈال دیجئے تو بہتر ہے۔"

تیسرا اچکن پوش بھی اٹھتے ہوئے بولا۔ "میرا بھی یہی خیال ہے... ویسے یہ نیک کام ہے اور جب لڑکی لڑکا دونوں بالغ ہیں اور ایک دوسرے سے شادی کرنے پر راضی ہیں تو ہم کل پھر حاضر ہو جائیں گے... اس وقت اجازت دیجئے۔"

اور وہ تینوں السلام علیکم کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔ زمان نے انہیں وہیں روک لیا اور نہایت اخلاق کے ساتھ بولا۔ میں آپ حضرات کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ آپ نے اتنی رات گئے تک انتظار کی زحمت اٹھائی دراصل گاڑی لیٹ ہو گئی تھی... ویسے نکاح خواں صاحب تھوڑی دیر مزید ٹھہر جاتے تو اچھا تھا۔"

چیچک رو اچکن پوش بولا۔ "بھائی زمان صاحب! اب دن نکلنے میں دیر ہی کون

رہ گئی ہے... آپ کل کسی وقت کا ٹائم رکھ لیں اور ہمیں فون پر اطلاع کر دیجیئے گا ہم حاضر ہو جائیں گے...... ہم بھی لڑکے لڑکیوں والے ہیں... خیر کے کام میں ضرور شریک ہوں گے۔ اور پھر شرع نے اس کی اجازت دے رکھی ہے کہ لڑکی کو دولہا پسند ہونا چاہیئے... خدا حافظ!"

ندیم بھی وہیں کھڑا یہ ساری باتیں سن رہا تھا... جب تینوں مہمان چلے گئے تو ندیم نے مضطرب ہو کر کہا۔ "زمان بھائی! اب کیا کریں؟ میں نے تو سوچ رکھا تھا کہ آج نکاح ہو جائے گا تو کل نو دس بجے کی گاڑی میں کراچی سے نکل جائیں گے تاکہ رات تو لاہور پہنچ جائیں۔"

زمان نے اپنے آپ کو ایک بیکار بوجھ کی طرح صوفے پر گرا دیا۔ جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگایا اور بولا۔ "ندیم میں تم سے بے حد شرمسار ہوں.... میں تو سوچ رہا ہوں کہ بھابی نجمی کے سامنے کیا منہ لے کر جاؤں گا... وہ میرے بارے میں کیا سوچے گی کہ ندیم جس دوست کی اتنی تعریف کر رہا تھا، اتنے مان کے ساتھ اسے یہاں لایا ہے۔ وہ ایک نکاح خواں کو بھی نہ بٹھا سکا۔"

ندیم بھی سخت پریشان اور مایوسی کے عالم میں تھا۔ زمان نے اپنی پریشان خیالی سے گھبرا کر تازہ سلگایا ہوا سگریٹ راکھدان میں مسل ڈالا اور اٹھ کر ٹہلنے لگا....

پھر اپنے آپ بولنے لگا۔

"میں نے بڑی مشکل سے ایک نکاح خواں صاحب کو راضی کیا تھا.. تمہیں شاید معلوم نہیں... اگرچہ یہ بیاہ ناجائز نہیں مگر پھر بھی آج کل حالات ایسے ہیں کہ ہر کوئی بہت محتاط ہو گیا ہے... یہ تینوں آدمی بھی شہر کے معززین میں سے تھے... یہ بھی میرے کہنے پر نکاح نامے پر دستخط کرنے آ گئے تھے... خیر... یہ تو کل بھی آ جائیں گے۔" پھر زمان نے میز کی دراز میں سے سادہ نکاح نامہ نکال کر ندیم کو دکھایا

"یہ دیکھو نکاح نامہ تو میں نے صبح تمہارا فون آتے ہی منگا کر رکھ لیا تھا۔"

نکاح نامہ ندیم کے ہاتھ میں تھا۔ اور وہ اسے حسرت آمیز نگاہوں سے دیکھ

رہا تھا۔ زمان کہنے لگا۔ "اب رات تو سمجھو گزر ہی گئی ہے ایسا کرتے ہیں کہ میں صبح آٹھ نو بجے خود جا کر نکاح خواں کو لے آؤں گا اور پھر سب ٹھیک ہو جائے گا ندیم بھائی! تمہیں جو تکلیف ہوئی ہے اس کے لئے مجھے معاف کر دینا۔ اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بھابی سے میں کیسے معافی مانگوں۔ تم میری طرف سے معافی مانگ لینا۔

اب تم جا کر آرام کرو۔ میں صبح آٹھ بجے تمہیں جگا دوں گا۔ بھابی کے ساتھ والا کمرہ خالی ہے۔ تم وہاں سو جانا۔ کیا خیال ہے۔"

ندیم نے جلدی سے کہا۔ "ٹھیک ہے زمان بھائی میں ساتھ والے کمرے میں ہی سو جاؤں گا۔"

زمان نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ "بھائی! میری طرف سے بھابی سے معافی ضرور مانگنا نہیں تو میرے ضمیر کو چین نہیں آئے گا۔"

ندیم نے زمان کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو پکڑ لیا اور بولا۔ "ایسی باتیں نہ کرو زمان بھائی تم میرے دوست ہو۔ اور پھر اس میں تمہارا کوئی قصور بھی تو نہیں ٹھیک ہے۔ میں نجمی کو ابھی سمجھا دیتا ہوں۔ اس کی پریشانی دور ہو جائے گی۔ تم بالکل فکر نہ کرو رات کو نکاح نہیں ہوا تو پھر کیا ہوا دن میں ہو جائے گا۔"

زمان نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "کیوں نہیں کیوں نہیں بھائی میں خود نکاح خواں کو لے کر آؤں گا۔ اس سے ساری بات ہو چکی ہے۔ اب تم جا کر آرام کرو ذرا ٹھہرو یہ سلیپنگ سوٹ لیتے جاؤ۔"

زمان نے الماری میں سے ایک سلیپنگ سوٹ نکال کر ندیم کو دیا۔ اور ندیم شب بخیر کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔ اس نے نجمی کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ نجمی نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ نجمی اسے دیکھ کر ٹھٹھک سی گئی۔ وہ پوری تو نہیں لیکن آدھی دلہن بن چکی تھی۔ لباس ریشمی تھا۔ بالوں کا جوڑا بنا تھا۔ پنسل سے بھنویں اور پلکیں کھنچی ہوئی تھیں۔ ہونٹوں پر سرخ لپ اسٹک کی تہہ جمی تھی جسم پرفیوم سے مہک رہا تھا۔ وہ ایک شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ ندیم کو دیکھ رہی تھی۔ اس

نے اپنی نظریں جھکالیں اور پلنگ کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے بولی۔
"تم نکاح نامے پر میرے دستخط کروانے آئے ہو ندیم؟" پھر خود ہی پلٹ کر ندیم کی طرف دیکھا اور بولی۔
"کیسی عجیب بات ہے۔ یہ فرض عام طور پر خاندان کے بزرگ انجام دیتے ہیں۔ لاؤ کہاں دستخط کرنے ہیں۔"

ندیم نے دروازہ بند کرتے ہوئے نجمی کو سارا ماجرا سنایا تو وہ دل کو تھام کر پلنگ پر بیٹھ گئی ندیم اسے بار بار تسلیاں دینے لگا کہ ایسی کوئی خاص بات نہیں ہوئی ہے۔ اصل میں رات زیادہ ہو گئی تھی اور نکاح خواں صاحب انتظار نہ کر سکے اور چلے گئے۔ بے چارے معززین تو ابھی تک ہمارے انتظار میں بیٹھے تھے۔ اب انہوں نے کل دن میں آنے کو کہا ہے۔

زمان تو اس قدر شرمندہ ہے کہ وہ بار بار کہہ رہا تھا کہ بھابی جان سے ہاتھ باندھ کر معافی مانگنا۔ تم فکر مت کرو نجمی۔ صبح نو بجے زمان خود جا کر نکاح خواں کو لے آئے گا اچھا اب تم تھوڑی دیر آرام کر لو ساڑھے تین بج رہے ہیں۔ میں ساتھ والے کمرے پر سو جاتا ہوں۔"

نجمی کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ جن سے اس کا کاجل بہہ رہا تھا۔ ندیم نے اسے ایک بار پھر بڑے پیار سے حوصلہ دیا اور کہا۔
"خدا کے لئے حوصلہ کرو نجمی یہ تو محض زیادہ رات ہو جانے کی وجہ سے ہوا ہے نکاح خواں کہیں ملک چھوڑ کر تو نہیں چلا گیا۔ اچھا اب تم آرام کرو۔ اور ہاں اسی طرح دلہن بنے رہنا۔ تم بہت ہی خوبصورت لگ رہی ہو۔ میں صبح خود آ کر تمہیں لے جاؤں گا۔ شب بخیر۔"

نجمی آنسو پونچھنے لگی۔ ندیم نے کمرے سے نکل کر دروازہ بند کر لیا اور باہر سے آواز دی۔
"اندر سے چٹخنی لگا لینا۔"

نجمی نے اٹھ کر چٹخنی لگائی اور پلنگ پر ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ پنکھا چل رہا تھا اور اس کی گردش سے کاغذی پھولوں کے سہرے کی لڑیاں لہرا رہی تھیں۔ یہ وہ حجلہ عروسی تھا جس کا خواب رنگین شرمندہ تعبیر نہ ہوا تھا۔ دوسری طرف ندیم ساتھ والے کمرے میں داخل ہو کر کپڑے تبدیل کرنے لگا۔ اس کمرے میں بھی عام ہوٹل کے کمروں کی طرح پلنگ بچھا ہوا تھا مگر یہ سادہ پلنگ تھا اور اس پر سہرے نہیں سجائے گئے تھے۔ وہ پلنگ پر لیٹ گیا۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔ سفر نے اسے سخت تھکا دیا تھا۔ لیٹتے ہی اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ بے خبر ہو کر سو گیا۔ اس کمرے سے آگے ایک کمرہ چھوڑ کر زمان اپنے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ میز پر چھوہاروں کی سینی اسی طرح پڑی تھی۔ وہ بار بار اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھ کر بازار کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں سے نیچے جھانک لیتا تھا۔ بازار دور تک سنسان پڑا تھا۔ زمان نے ابھی تھوڑی دیر پہلے نیچے جا کر کسی جگہ ٹیلی فون کیا تھا۔ اب وہ کسی کا انتظار کر رہا تھا۔ کوئی پندرہ منٹ بعد نیچے ایک بند ایمبولینس ویگن آ کر کھڑی ہو گئی۔ زمان نے اسے دیکھا تو پیچھے ہٹ کر کھڑکی بند کر دی۔

ایمبولینس ویگن کے اوپر سرخ بلب جھلملا رہا تھا۔ ڈرائیور نے اوپر کھڑکی بند ہوتے دیکھی تو سرخ بلب کا بٹن اوف کر دیا۔ زمان نے میز کا دراز کھولا اور اس میں سے نکاح نامے کا دوسرا یعنی فالتو فارم نکال کر اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور جیب سے قلم نکال لیا۔ اتنے میں کمرے میں وہی تین معززین اچکن پوش داخل ہوئے زمان نے ان کی طرف دیکھ کر انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود قلم اور نکاح نامہ لے کر کمرے سے نکل کر نجمی کے دروازے پر آ کر آہستہ سے دستک دی۔

نجمی ابھی تک جاگ رہی تھی۔ نیند اس کے اوپر منڈلا رہی تھی مگر اس پر طاری نہیں ہو رہی تھی۔ دوسری بار دستک ہوئی تو نجمی اٹھ کر دروازے کے پاس آ کر بولی۔ "کون ہے؟"

زمان نے آواز میں شفقت اور نرمی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "میں ہوں بھابی جان زمان۔" نجمی نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ زمان نے بے حد معذرت پیش کرتے ہوئے کہا۔ "سب مطئیاب ہو گیا ہے بھابی جان۔ نکاح خواں آگیا ہے وہ رجسٹر میں ضروری اندراج کر رہا ہے اتنی دیر میں آپ نکاح نامے پر دستخط کریں۔

ندیم غسل خانے میں ہے۔ وہ بھی تیار ہو کر وہیں پہنچ رہا ہے۔ بھابی میری وجہ سے آپ کو جو تکلیف ہوئی ہے اس کے لئے ایک بار پھر ہاتھ جوڑ کر آپ سے معافی مانگتا ہوں۔"

نجمی نے نکاح نامہ رکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے شرمندہ نہ کریں بھائی جان۔ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ کہاں کہاں دستخط کرنے ہیں مجھے۔"

زمان نے نجمی کو دستخط کرنے والی جگہ بتاتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو چین نہیں آرہا تھا۔ بس گاڑی پکڑی اور نکاح خواں کو سوتے ہوئے اٹھا کر لے آیا ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ آپ کو رات ہر حالت میں لاہور پہنچنا ہے۔"

نکاح نامے پر جہاں جہاں دلہن کے دستخط ہوتے ہیں وہاں وہاں زمان نے نجمی کے دستخط کروالئے اور نکاح نامہ لپیٹتے ہوئے بولا۔ "میں آپ کے لئے چائے بھجوار ہوں بس آپ جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر تھوڑا بہت تیار ہو جائیں۔ میرا مطلب ہے کہ دلہن بھابی کی منہ دکھائی تو ضرور ہوگی۔"

زمان بڑے محتاط انداز میں ہنستا ہوا کمرے سے نکل گیا ندیم کے کمرے کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے بند دروازے سے کان لگا دیئے۔ اندر سے ندیم کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز آرہی تھی۔

زمان تیز تیز قدم اٹھاتا اپنے کمرے میں آگیا۔ تینوں اچکن پوش معززین صوفوں پر جیسے بالکل تیار بیٹھے تھے۔ زمان نے ان میں سے ایک کو اشارہ کیا۔ وہ جلدی سے اٹھا میز پر رکھی تھرماس بوتل میں سے اس نے گرم گرم چائے نکال کر پیالی میں انڈیلی اور نجمی کے کمرے کی طرف چل دیا۔ دروازے پر دستک دے کر آہستہ سے کہا۔

"بیٹی چائے لے لو۔"

نجمی نے دروازہ کھول دیا۔ ایک شریف آدمی کو چائے کی پیالی لئے سامنے کھڑا دیکھا تو جلدی سے پیالی لے کر شکریہ ادا کیا اور دروازہ بند کر دیا۔ نجمی کو اس وقت چائے کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دل میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کر رہی تھی کہ جو نکاح رات کو نہ پڑھا جا سکا تھا وہ اب پڑھا دیا جائے گا۔ ویسے وہ حیران تھی کہ ندیم نے غسل خانے میں اتنی دیر کیوں لگا دی ہے۔ اس نے کھڑے کھڑے چائے کے دو تین گھونٹ لئے اور پھر پیالی میز پر رکھ کر غسل خانے کی طرف بڑھی۔ اچانک اسے چکر آگیا اور اس نے پلنگ کو پکڑ لیا۔

○
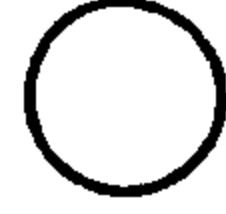
نجمی کو ایک اور چکر آیا اور اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھانے لگا۔ وہ پلنگ کو پکڑ کر وہیں بیٹھ گئی۔ پہلا خیال جو اسے آیا وہ یہ تھا کہ چائے میں کچھ ملا ہوا تھا۔ چائے زہریلی تھی۔ کسی نے اس میں کیا ملایا تھا؟ کیا چائے کی کیتلی میں کچھ گر گیا تھا؟

نجمی نے ندیم کو آواز دینے کی کوشش کی مگر اس کے حلق سے آواز نہ نکل سکی۔ وہ اٹھ کر دروازے کی طرف دوڑی اور وہیں پرانے قالین کے فرش پر گر پڑی۔

ساتھ والے کمرے میں ندیم رات بھر کا تھکا گہری نیند سو رہا تھا۔ کراچی شہر پر صبح کی اولین روشنی ابھرنے لگی تھی۔ سڑک پر سے ایک بس کے تیزی سے گزرنے کی آواز آئی۔ یہ آواز نجمی نہ سن سکی، جو اچکن پوش معزز آدمی نجمی کو چائے دے کر آیا تھا وہ زمان کے کمرے میں گھڑی دیکھ رہا تھا۔ دوسرے اچکن پوش ساتھی صوفے کے پاس جیسے تیار کھڑے تھے۔ زمان نے اپنی کلائی کی گھڑی پر ایک نظر ڈالی اور چپ چاپ دو اچکن پوش کی طرف دیکھ کر آہستہ سے کہا۔

"شیرے! ٹونی اور تم اسے کمرے سے نکال کر نیچے لے جاؤ گے۔"

پھر تیسرے اچکن پوش کی طرف متوجہ ہو کر کہا "وکی! تم ایمبولینس کے پاس رہو گے۔"

جلدی کرو تینوں اچکن پوش معزز کمرے میں سے نکل گئے۔ زمان بے چینی کے عالم میں کھڑکی کا تھوڑا سا پٹ کھول کر نیچے سڑک پر دیکھنے لگا۔ ایمبولینس ہوٹل کے آگے کھڑی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے دیکھا کہ تینوں معزز اچکن پوش یعنی شیرا، لوٹی اور وکی ایک بے ہوش عورت کو چادر میں لپیٹ کر اٹھائے ہوئے ایمبولینس کی طرف بڑھے وکی نے لپک کر ایمبولینس کا دروازہ کھول دیا۔ بے ہوش نجمی کو ایمبولینس میں ڈال کر دروازہ بند کر دیا گیا۔

شیرا اور ٹونی ایمبولینس کے اندر نجمی کے پاس ہی بیٹھ گئے۔ وکی اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ایمبولینس کی سرخ بتی نے دوبارہ جھلملانا شروع کر دیا اور پھر وہ اسٹارٹ ہو کر تیزی سے ہوٹل کے پورچ سے نکل کر سڑک پر روانہ ہو گئی۔

زمان نے جیسے اطمینان کا سانس لیا۔ کھڑکی بند کر کے جلدی سے کپڑے بدلے اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ دروازے کی چٹخنی اس نے لگا دی تھی۔ وہ جاگ رہا تھا۔ بتی اس نے بجھا دی تھی۔ روشندان میں سے دن کی روشنی کمرے میں آ رہی تھی۔ اس کی نظریں دیوار پر لگے کلاک پر تھیں۔ اس کی آنکھیں نیند کی وجہ سے جل رہی تھیں مگر نیند اس سے کوسوں دور تھی۔

اس نے ہوٹل کے نوکروں کو خاص طور پر ہدایت کر رکھی تھی کہ اوپر والی منزل کے ان تین کمروں میں کسی مہمان کو پریشان نہ کیا جائے۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ دن کافی نکل آیا تھا۔ وال کلاک نے دن کے پونے آٹھ بجائے تو دروازے پر زور زور سے دستک دینے کی آواز آئی۔ زمان دیر سے اسی آواز کا انتظار کر رہا تھا۔ پہلے تو وہ چپ چاپ لیٹا رہا۔ تیسری بار دستک کی آواز بلند ہوئی تو اس نے جیسے نیند بھری آواز میں پوچھا۔

"کون ہے؟" باہر سے ندیم کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

"دروازہ کھولو زمان! میں ہوں ندیم۔" زمان نے جلدی سے دروازہ کھول دیا اور بناوٹی جمائی لیتے ہوئے بولا۔

"کیا بات ہے ندیم؟ تم گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟"

ندیم جلدی سے اندر آ گیا۔ "نجمی اپنے کمرے میں نہیں ہے۔"

"کیا؟" زمان نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ "اپنے کمرے میں نہیں ہے بھابی؟ تو باتھ روم میں ہو گی۔"

ندیم نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ "وہ باتھ روم میں بھی نہیں ہے۔"

زمان نے انتہائی پریشانی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "باتھ روم میں بھی نہیں ہے؟ تو کہیں بھابی سیر کرنے نہ نکل گئی ہو۔"

ذہنی ہیجان کی وجہ سے ندیم اٹھ کھڑا ہوا۔ کھڑکی کھول کر نیچے جھانکا اور بولا۔ "نہیں نہیں۔ وہ سیر کرنے نہیں جا سکتی۔ وہ تو سخت تھکی ہوئی تھی اور پھر صبح صبح تو وہ سوئی تھی اس وقت سیر کو کیسے جا سکتی ہے؟"

زمان نے ندیم کی طرف بے بسی کے عالم میں دیکھا اور کہا "زمان! خدا کے لئے نجمی کو کہیں تلاش کرو۔ وہ اگر سیر کے لئے بھی گئی ہے تو کہیں کھو نہ جائے اسے کراچی کی سڑکوں کا کچھ پتہ نہیں ہے۔"

زمان جلدی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ "میرے ساتھ بھابی کے کمرے میں آؤ۔"

حجلۂ عروسی اسی طرح سجا ہوا تھا۔ چھت کا پنکھا چل رہا تھا اور دلہن غائب تھی کاغذی سہروں کی لڑیاں پنکھے کی ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ زمان کمال کی اداکاری کر رہا تھا۔ وہ باتھ روم میں گیا۔ وہاں سے نکلا تو پلنگ کے نیچے جھک کر دیکھنے لگا۔ بند کھڑکی کو کھول کر نیچے دیکھا۔ قالین کے فرش پر جھک گیا پھر ندیم کی طرف دیکھا اور بولا۔

"چٹخنی اندر سے کھلی ہے اس کا مطلب ہے بھابی اپنی مرضی سے باہر گئی ہے۔ وہ ضرور سیر کرنے نکل گئی ہو گی۔ میرے ساتھ آؤ۔"

دونوں ہوٹل کے نیچے برآمدے میں آ گئے۔ زمان کو دیکھ کر نوکر اور چوکیدار

چوکس ہو گئے۔ زمان نے ان سے پوچھا کہ انہوں نے کسی خاتون کو ہوٹل سے باہر جاتے تو نہیں دیکھا؟ سب نے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ سچے تھے، جس وقت زمان کے اچکن پوش ساتھی بے ہوش نجمی کو وہاں سے نکال کر لے گئے تھے اس وقت نوکر اور چوکیدار سو رہے تھے۔ زمان نے ندیم سے کہا۔

"گاڑی لے کر چلتے ہیں، تم گھبراؤ نہیں میرے دوست، بھابی یہیں کہیں ہو گی، وہ ضرور مل جائے گی۔"

زمان نے گاڑی نکالی، ندیم کو ساتھ بٹھایا اور ہوٹل کے ارد گرد کی سڑکوں پر چکر لگانے کے لئے چل پڑا۔ ساری سڑکیں دیکھ لیں۔ کچھ فاصلے پر ایک پارک تھا۔ اس کا کونہ کونہ چھان مارا مگر نجمی کا کچھ پتہ نہ چلا۔ ندیم کی پریشانی دیکھی نہیں جاتی تھی۔ زمان اس سے زیادہ پریشانی ظاہر کر رہا تھا۔

اس نے ندیم سے کہا "میرا خیال ہے ہمیں تھانے میں رپورٹ درج کرا دینی چاہیئے"

ندیم فوراً بولا۔

"نہیں نہیں! زمان اس سے بڑی بدنامی ہو گی۔ ہو سکتا ہے نجمی کے ماں باپ نے لاہور میں اس کے فرار کو سب سے چھپایا ہوا ور یہ کہا ہو کہ نجمی اپنی خالہ یا کسی دوسرے رشتے دار کے ہاں پنڈی، پشاور گئی ہے۔ پولیس میں رپورٹ درج کرائی تو پولیس اس سے پہلے مجھے پکڑ لے گی کہ میں اسے بھگا کر کیوں لایا تھا۔ پھر ہو سکتا ہے پولیس لاہور نجمی کے گھر بھی جائے۔"

زمان اور ندیم گاڑی کی طرف جا رہے تھے۔ زمان کہنے لگا "ایک بار پھر سوچ لو ندیم پولیس کی مدد سے ہم نجمی کو برآمد کرنے میں کامیاب ہو بھی سکتے ہیں۔"

"نہیں نہیں زمان۔ پولیس کی بات بیچ میں نہ لاؤ۔" ندیم نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "اس سے میری گرفتاری یقینی ہے اور تم جانتے ہو کہ میری نیت نیک تھی۔ میں تو نجمی سے بیاہ کرنے اسے یہاں لایا تھا۔ مگر پولیس اعتبار نہیں کرے گی ہمارے دونوں خاندانوں کی مزید بدنامی ہو گی۔" زمان گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔

"آخر بھابی کہاں جا سکتی ہے؟ اسے کمرے سے نکلنے کی ضرورت کیا تھی؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ سیر کرتے کرتے دور نکل گئی ہو راستہ بھول گئی ہو اسے ہوٹل کے نام کا علم ہی ہے وہ جس ٹیکسی یا رکشہ ڈرائیور سے ہمارے ہوٹل کا نام لے گی وہ اسے یہاں پہنچا دے گا۔"

گاڑی واپس ہوٹل کی طرف جا رہی تھی زمان کہہ رہا تھا "ندیم میرے دوست! مجھے معاف کر دینا۔ میں تمہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔"

ندیم نے اداس تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ "اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں میرے دوست! میری تقدیر میں یہی لکھا تھا۔" اور ندیم ایک ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گیا۔ زمان کہنے لگا۔ "رات جب تم بھابی کو چھوڑ کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگے تھے تو بھابی نے کچھ کہا تھا تمہیں؟" ندیم کا چہرہ اتر گیا تھا ہونٹ بار بار خشک ہو رہے تھے۔ اس نے بائیں ہاتھ سے اپنے ماتھے کو دباتے ہوئے کہا۔

"نجمی کچھ پریشان تھی مگر یہ پریشانی ظاہر ہے قدرتی بات تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ آرام سے سو جائے۔ صبح نکاح خواں نرو۔ آ جائے گا پھر میں نے اسے باہر آ کر کہا کہ اندر سے چٹخنی لگا لو۔ مجھے اندر سے چٹخنی لگانے کی آواز آئی اور میں نے اپنے کمرے میں آ کر کپڑے بدلے اور لیٹتے ہی سو گیا۔ کاش میں جاگتا رہتا۔ نجمی کے پاس ہی رہتا۔"

ندیم نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ زمان اس کی دلجوئی کرنے لگا۔ "ندیم! تم تو حوصلہ کرو میرے دوست۔ میں تمہارے ساتھ ہوں میں مر نہیں گیا۔ کراچی شہر کا بچہ بچہ مجھے جانتا ہے میں نجمی کو دوپہر ہونے سے پہلے پہلے تلاش کر لوں گا۔ تم فکر مت کرو۔"

ندیم نے کوئی جواب نہ دیا۔ آہستہ سے آہ بھری اور سامنے سڑک پر نظریں جما دیں۔ "میں تو سوچ رہا ہوں کہ واپس لاہور کیا منہ لے کر جاؤں گا۔ نجمی سے مجھے جو محبت ہے اور اس کے اچانک غائب ہو جانے سے مجھے جو صدمہ ہوا ہے وہ اپنی جگہ پر لیکن اگر لاہور میں نجمی کے ماں باپ نے میرے خلاف رپورٹ درج کرا دی تو میرا سارا مستقبل تباہ ہو جائے گا۔ میں اپنی تعلیم بھی مکمل نہ کر سکوں گا۔"

زمان نے تشفی آمیز لہجہ میں کہا۔ "تم ایسا کیوں سوچ رہے ہو ندیم؟ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ نجمی اگر اس شہر میں ہے تو ہم اسے ضرور ڈھونڈھ نکالیں گے۔ تم یقین کرو چاہے نہ کرو مگر میرا دل کہتا ہے کہ نجمی سیر کے خیال سے باہر نکلی ہے اور راستہ بھول گئی ہے۔ تم دیکھ لینا ہم ہوٹل پہنچیں گے تو بھابی آ چکی ہو گی۔"

جب وہ ہوٹل پہنچے تو نجمی نہیں آئی ہوئی تھی۔ زمان ندیم کو اپنے کمرے میں لے آیا۔ "تم کچھ ناشتہ کر لو۔ رات کو بھی تم نے کچھ نہیں کھایا تھا ندیم۔ میں۔۔۔ میں نکاح خواں کو فون کرتا ہوں۔ اگر وہ آ گیا تو ہم اسے کیا جواب دیں گے۔"

ندیم بولا۔ "ہاں اسے منع کر دو۔ میں نہیں چاہتا کہ یہاں کسی کو نجمی کے گم ہو جانے کا علم ہو۔"

"میں تمہارے لئے ناشتہ منگواتا ہوں۔" زمان نے نیچے ناشتے کے لئے فون کر دیا۔ ندیم نے نفی میں ہاتھ ذرا سا ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں دوست کچھ کھانے پینے کو جی نہیں چاہتا یا اللہ! میرے گناہ معاف کر دے مجھے ایک بار نجمی ملا دے۔ میں اسے لے کر سیدھا لاہور چلا جاؤں گا۔ میں اس کے ماں باپ کی رضامندی سے شادی کروں گا۔"

زمان نے ٹیلی فون پر ایک غلط نمبر گھمایا اور ریسیور کان کے ساتھ لگا دیا۔ دوسری طرف سے کسی کی آواز نہیں آ رہی تھی لیکن زمان نے کہا۔

"ہیلو! کون صاحب؟ اچھا شاہ صاحب بول رہے ہیں۔ السلام علیکم۔ بات یہ ہے شاہ صاحب کہ دلہن کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ جی ہاں جی ہاں آپ دو ایک دن ٹھہر جایئے گا۔ جی ہاں شکریہ میں آپ کو فون کر دونگا۔ اور شاہ جی مجھے امید ہے کہ آپ یہ بات اپنے تک محدود رکھیں گے۔ بڑی مہربانی ہے۔ ارے شاہ جی آپ پر ہمیں پورا بھروسہ ہے اور پھر یہ تو ایک جائز نکاح تھا۔ اللہ مالک ہے میں ایک دو دن میں آپ کو فون کر کے دن اور تاریخ بتا دوں گا۔ شکریہ بہت بہت شکریہ۔ خدا حافظ۔"

زمان نے فون بند کر کے سانس بھرا اور بولا۔ "ہمارے مہربان شاہ صاحب تھے۔۔۔ نکاح خواں۔۔۔ وہ تو یہاں آنے کی تیاری کر رہے تھے۔"

ندیم نے سر لٹکا لیا اور بولا۔ "اب یہاں کیا رہ گیا ہے۔"

زمان نے ایک بار پھر ندیم کو انتہائی مخلصانہ الفاظ میں تسلی دی کہ وہ ہمت نہ ہارے اور نجمی بہت جلد واپس آ جائے گی۔ پھر ریسیور اٹھا کر کہنے لگا۔ "میں ان معزز گواہوں کو بھی آنے سے منع کر دوں جنہوں نے نکاح نامے میں دستخط کرنے تھے وہ بھی آ رہے ہوں گے۔" اور زمان نے ندیم کے سامنے ایک جھوٹ موٹ کا نمبر ملا کر پھر وہی اداکاری کی اور ٹیلیفون پر کہنے لگا۔

"شیخ صاحب معافی چاہتا ہوں۔ بس بچی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ خدا کو یہی منظور تھا۔ آپ کو بڑی زحمت ہوئی ہے۔ میں انشاءاللہ دو ایک روز میں آپ کو وقت اور تاریخ بتا دوں گا۔ جی ہاں ویسے ایک زحمت میری خاطر کیجئے گا۔ بٹ صاحب اور ملک صاحب کو بھی بتا دیجئے گا۔ میرے پاس ان کے ٹیلیفون نمبر نہیں ہیں بہت بہت شکریہ۔"

ٹیلی فون رکھتے ہوئے زمان نے ندیم سے کہا۔ "یہ لوگ شہر کے بڑے معزز لوگ ہیں صرف میری خاطر نکاح نامے پر دستخط کرنے کو تیار ہو گئے تھے تم نے پھر چہرہ لٹکا لیا؟"

زمان ندیم کے پاس آ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "ندیم! بھابی کو ڈھونڈ لانے کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ وہ میرے ہوٹل میں آ کر گم ہوئی ہے۔ میں جب تک اسے ڈھونڈھ نہیں لوں گا میرے ضمیر کو چین نہیں آئے گا یقین کرو میرے دوست! میں اپنی جان لڑا دوں گا لیکن بھابی کو جہاں کہیں بھی وہ ہو گی تلاش کر کے تیری خدمت میں پیش کر دوں گا۔"

ندیم نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔ "میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ وہ اپنے کمرے سے نکلی کیوں؟ اگر نکلی تو کدھر چلی گئی۔ وہ پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ ہوٹل کا نام بھی اسے

معلوم ہے وہ اگر اپنی مرضی سے گئی ہے تو اسے اب تک واپس آ جانا چاہیئے تھا۔"

زمان سمجھ گیا تھا کہ ندیم کے دل میں کیا ہے۔ فوراً بولا۔ "تو تمہارا کیا خیال ہے کہ بھابی کو کسی نے اغوا کر لیا ہے؟ نہیں نہیں ندیم یہ ناممکن ہے۔ میرے ہوٹل میں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہاں سے کبھی کوئی تنکا تک غائب نہیں ہوا پھر بھابی کو کوئی کیسے اغوا کر سکتا تھا؟ اگر خدا نخواستہ ایسی بات ہوتی تو ہم ساتھ والے کمرے میں ہی تھے۔ وہ شور مچا سکتی تھی۔ دن نکل آیا تھا۔ ہم اس کی مدد کو پہنچ سکتے تھے۔ نہیں نہیں میں یہ بات ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ بھابی کو کسی نے اغوا کیا ہے۔"

پھر کچھ سوچ کر کہنے لگا۔ "کہیں ایسا تو نہیں کہ بھابی لاہور چلی گئی ہو؟ میرا مطلب ہے کہ اس کو اچانک خیال آ گیا ہو کہ اس نے گھر سے بھاگ کر بھیانک غلطی کی ہے اور وہ بتائے بغیر ریلوے اسٹیشن کی طرف نکل گئی ہو؟"

اس کے ساتھ ہی زمان ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ "جلدی چلو۔ ہم ریلوے اسٹیشن چل کر دیکھتے ہیں ہو سکتا ہے بھابی وہیں پر ہو۔" وہ کار میں بیٹھ کر بڑی تیزی سے ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہوئے۔ سٹی اسٹیشن پر زیادہ رش نہیں تھا۔ لاہور جانے والی ٹرین کا ابھی وقت نہیں ہوا تھا۔

زمان اور ندیم نے ریلوے اسٹیشن کا چپہ چپہ چھان مارا نجمی وہاں ہوتی تو انہیں ملتی زمان نے کہا۔ "چھاؤنی کے اسٹیشن پر چل کر دیکھتے ہیں۔" کراچی چھاؤنی کے اسٹیشن پر نجمی کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ وہ ناامید ہو کر واپس ہوٹل آ گئے۔ ندیم نے زمان سے درخواست کی کہ خدا کے لئے نجمی کے کمرے میں جو پھول کے سہرے لگے ہیں وہ اتروا دو۔ کیونکہ حجلۂ عروسی کی سجاوٹ ندیم سے دیکھی نہیں جاتی تھی اس کی آنکھوں میں بار بار آنسو آ جاتے تھے اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ ندیم کو نجمی سے بے حد محبت تھی۔

زمان نے سارے سہرے اور کاغذی پھولوں کی لڑیاں اتار دیں۔ ندیم کونے میں سوگوار کھڑا حسرت بھری نظروں سے پلنگ کو تک رہا تھا۔ زمان سجاوٹ اتارتے ہوئے بولا۔ "تم بہت جلدی ہار دیتے ہو ندیم۔ ہو سکتا ہے کل بھابی آ جائے اور کمرہ نہیں پھر سجانا پڑے۔"

ندیم یہ کہہ کر باہر نکل گیا کہ میں یہ سب کچھ نہیں دیکھ سکتا۔ ندیم کے جانے کے بعد زمان نے غور سے کمرے کا جائزہ لیا۔ وہ کپ جس میں نجمی کو بے ہوش کرنے والی انتہائی زود اثر دوائی پلائی گئی تھی وہاں سے ہٹا دی گئی تھی۔ چیک روا چکن پوش شیرا نجمی کے بے ہوش ہونے کے بعد کپ اور پلیٹ وہاں سے اٹھا کر لے گیا تھا۔ سنگھار میز پر نجمی کا پرس پڑا رہ گیا تھا جس کی تلاشی لینے کے بعد ندیم نے اسے اپنی اٹیچی کیس میں رکھ لیا تھا۔

زمان نے سارے کاغذی پھولوں کی لڑیاں اور سہرے ایک کپڑے میں لپیٹ کر الماری کے پیچھے رکھ دیئے پھر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ ندیم اس کے کمرے میں بیٹھا ہوگا مگر وہ وہاں نہیں تھا۔ زمان کو کچھ تشویش ہوئی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں ندیم پولیس میں رپورٹ درج کرانے کا فیصلہ نہ کر لے۔ زمان نیچے ہوٹل کے برآمدے میں آ گیا۔ زمان ہوٹل کا منیجر تھا۔ یہ ایک درمیانے درجے کا ہوٹل تھا۔

اس نے دیکھا کہ ندیم ہوٹل کے سامنے سڑک پر ٹہل رہا تھا۔ وہ گہری محویت کے عالم میں تھا زمان نے ندیم کو ساتھ لیا گاڑی نکالی۔ اور ایک بار پھر نجمی کی تلاش کی مہم پر نکل کھڑا ہوا۔ وہ ندیم کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ نجمی کی گمشدگی پر وہ اس سے زیادہ پریشان اور غمزدہ ہے۔ وہ گاڑی میں ندیم کو لئے لئے پھرتا رہا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے تک اس نے کراچی کی کتنی ہی سڑکیں چھان ماریں۔ وہ ایئرپورٹ بھی گئے۔ لاہور جو فلائٹ گئی تھی اس کے مسافروں کی فہرست بھی دیکھی۔

اگرچہ ندیم کو معلوم تھا کہ نجمی اپنا پرس کمرے میں رکھ گئی تھی اور اس کے پاس کوئی خاص رقم نہیں ہوگی پھر بھی وہ بے نیل و مرام واپس ہوٹل میں آ گئے۔ زمان تو کمرے میں آتے ہی سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ جیب سے رومال نکال کر آنکھوں پر رکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "ندیم! میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گا اگر بھابی نہ ملی تو میں خودکشی کر لوں گا۔"

ندیم اگرچہ خود غم سے نڈھال تھا مگر اپنے دوست کی ایسی حالت دیکھ کر الٹا۔۔

تسلیاں دینے لگا۔ "زمان میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ تم نے جو کچھ کیا ہماری بھلائی کے لئے ہی کیا۔"

زمان نے اپنے ماتھے پر زور سے ہاتھ مارا اور بولا۔ "مجھے کیا خبر تھی یہ بھلائی ہماری تباہی کا باعث بن جائے گی۔" پھر چھت کی طرف ہاتھ جوڑ دیئے اور رقت کے ساتھ بولا۔

"میرے مولا! میری بھابی کو واپس لا دے۔ میری بھابی کو واپس لا دے مجھ گناہ گار کے گناہ معاف کر دے۔"

ندیم زمان کے کاندھے دبانے لگا۔ "زمان! تم نے بھی حوصلہ ہار دیا تو مجھے حوصلہ کون دے گا؟"

زمان رومال سے مگرمچھ کے آنسو صاف کرنے لگا۔ پھر باتھ روم میں جا کر منہ پر چھینٹے مارے اور ندیم کی طرف دیکھ کر کہا۔ "خدا کے لئے اب تھوڑا بہت کچھ کھا لو۔"

زمان نے کچھ ناشتہ منگوایا جسے ندیم زہر مار کرنے لگا۔ زمان بڑی رغبت سے کھا رہا تھا مگر منہ بنا کر بولا "خدا کی قسم یہ لقمے زہر لگ رہے ہیں ہائے۔ اس وقت مجھے اپنے دوست کی شادی ہی دعوت کرنی تھی۔"

اور زمان نے اپنے اوپر ایک بار پھر رقت طاری کر لی۔ دوپہر کے بعد ندیم اپنے طور پر نجمی کی تلاش میں نکل گیا۔ شام تک وہ کراچی کی سڑکوں، پارکوں اور باغوں میں مارا مارا پھرتا رہا مگر نجمی بھلا اسے کہاں مل سکتی تھی۔ سورج غروب ہو چکا تھا کہ وہ تھکا ہارا شکست خوردہ واپس ہوٹل میں آ گیا اس نے زمان سے کہا۔

"میں سوچتا ہوں کہ واپس لاہور جا کر معلوم کروں کہیں نجمی سچ مچ اپنے گھر نہ چلی گئی ہو۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔"

زمان کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا اس نے پہلے تو اس خیال کی مخالفت کی پھر کہنے لگا۔ "تم بھی ٹھیک کہہ رہے ہو میرا دل کہتا ہے کہ بھابی گھبرا کر لاہور ہی چلی گئی ہے۔ کیا میں تمہارے ساتھ چلوں۔"

ندیم نے کہا۔ "نہیں نہیں تمہارا یہاں رہنا ہی ٹھیک ہو سکتا ہے نجمی واپس اسی جگہ آ جائے۔ میں اکیلا ہی لاہور جاؤں گا۔"

زمان نے سگریٹ نکال کر جلایا اور بولا۔ "لیکن تمہیں میرے ساتھ ایک وعدہ کرنا ہو گا اور وہ یہ کہ جاتے ہی مجھے فون کرو گے اور پھر میرے ساتھ برابر رابطہ رکھو گے۔"

ندیم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کراچی میں رہے تو وہاں رہ کر کیا کرے اس نے گھبرا کر لاہور جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لاہور اس کی طرف منہ پھاڑے ہوئے تھا۔ وہاں اسے کئی لوگوں کے کئی قسم کے سوالوں کے جواب دینے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ لاہور والوں نے اس کے خلاف اغوا کا مقدمہ درج کرا دیا ہو اور وہ لاہور جاتے ہی گرفتار کر لیا جائے۔ اس کے باوجود ندیم نجمی کے بارے میں اس قدر پریشان اور غمزدہ تھا کہ محض اس امید پر اس نے لاہور جانے کا فیصلہ کر لیا کہ شاید نجمی اپنے ماں باپ کے گھر واپس چلی گئی ہو۔ جب اس نے فیصلہ کر لیا تو بے چین ہو گیا۔ "فون کر کے پتہ کرو لاہور کی گاڑی کس وقت چھوٹتی ہے۔"

زمان نے فوراً انکوائری کا نمبر ملایا معلوم ہوا گاڑی ساڑھے آٹھ بجے لاہور روانہ ہو گی۔ ندیم نے زمان سے کہا کہ وہ اس کے لئے ایک ٹکٹ منگوا دے۔ زمان نے فوراً اپنے آدمی کو پیسے دے کر ریلوے ریزرویشن آفس کی طرف روانہ کر دیا سیکنڈ کلاس میں ندیم کو سیٹ مل گئی زمان اسٹیشن پر ندیم کے ساتھ آیا۔

گاڑی چلنے لگی تو زمان نے ندیم کو گلے لگا لیا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا۔ "ندیم میرے دوست! مجھے معاف کر دینا مجھے معاف کر دینا۔"

ٹرین پلیٹ فارم سے کھسک رہی تھی۔ زمان نے تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے ندیم سے کہا۔ "جاتے ہی مجھے فون کرنا میرا دل کہتا ہے کہ بھابی لاہور میں ہو گی۔ جاتے ہی فون کرنا مجھے تمہارے فون کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔"

ٹرین پلیٹ فارم سے نکل گئی۔ زمان نے پیکٹ میں سے نیا سگریٹ نکال کر

سلگایا دیا سلائی بجھا کر دور پھینکی اور گاڑی کی طرف بڑھا۔ سیدھا اپنے ہوٹل میں آگیا کمرے میں آکر اس نے ریسیور اٹھایا اور ایک خاص نمبر ملانے لگا۔ "وہ مال گودام میں رکھوا دیا ہے۔"

دوسری طرف سے چیچک رو شبیر کی آواز آئی "بالکل ٹھیک طرح سے رکھوا دیا ہے کچھ مال خراب تھا اسے الگ کر دیا گیا ہے اب اسے ایکسپورٹ کرنے کے بارے میں کیا آرڈر ہیں؟"

زمان نے آہستہ سے کہا "ابھی انتظار کرو۔" اور فون بند کر دیا۔

ندیم کا لاہور کی طرف واپسی کا سفر بڑا کرب انگیز تھا اسے طرح طرح کے بھیانک خدشات نے گھیر رکھا تھا کبھی وہ اپنے ہاتھ میں ہتھکڑیاں لگی ہوئی دیکھتا اور کبھی اپنے گھر والوں کو پریشانی کے عالم میں حوالات کے باہر بیٹھے ہوئے دیکھتا کبھی دیکھتا کہ پولیس اس پر تشدد کر رہی ہے اور نجمی کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہی ہے۔

تھوڑی دیر کے لئے وہ یہ بھول گیا کہ نجمی کس حال میں ہو گی اب اسے یہ فکر لگی تھی کہ لاہور جا کر اس کا کیا حال ہو گا اپنے گھر والوں کے بارے میں بھی پریشانی تھی کہ اگر نجمی کے باپ یا اس کی سوتیلی ماں نے تھانے میں رپورٹ درج کرا دی ہو گی تو پولیس نے ندیم کے والد صاحب کو بھی ضرور تھانے بلایا ہو گا انہیں مجبور کیا ہو گا کہ وہ بتائیں کہ ان کا بیٹا کہاں ہے۔

ندیم نے لاہور روانہ ہوتے وقت اپنے گھر خط لکھ دیا تھا کہ وہ ایک ضروری کام سے پشاور جا رہا ہے دو ایک دن میں واپس آجائے گا ممکن ہے والد صاحب نے وہ خط پولیس کو دکھا دیا ہو اور پولیس اس کی تلاش میں پشاور روانہ ہو گئی ہو انہی خیالات میں الجھا ہوا ندیم لاہور کی طرف بڑھتا گیا جوں جوں لاہور قریب آ رہا تھا ندیم کا دل گھٹ رہا تھا آخر شام کے جھٹپٹے میں ٹرین لاہور کے پلیٹ فارم نمبر ۴ میں داخل ہو گئی ندیم نے اپنا چہرہ دوسرے مسافروں کے پیچھے چھپا لیا ٹرین رکی تو وہ ڈرتا ڈرتا مسافروں کی اوٹ لیتا ڈبے سے نکل کر گیٹ کی طرف چل پڑا کوئی پولیس کا سپاہی

نظر آتا تو وہ یہی سمجھتا کہ وہ اس کی تلاش میں وہاں آیا ہے۔ یونہی چھپتا چھپاتا ندیم رکشے میں بیٹھ کر اپنے مکان کی طرف روانہ ہو گیا ڈرتے ڈرتے مکان میں داخل ہوا اس کی والدہ نے دیکھا تو اس کو بڑھ کر گلے لگایا اور پھر ڈانٹنے لگیں۔ "ایسی بھی کیا مصیبت پڑ گئی تھی تمہیں کہ ہمیں بتا بھی نہ سکے کہ پشاور جا رہا ہوں۔"

دوسرے کمرے سے والد صاحب بھی نکل آئے "آ گئے ہو خیر سے؟ تمہیں شرم آنی چاہیئے سمجھے تم؟"

ندیم نے سر جھکا دیا وہ کہنے ہی والا تھا کہ اباجی میں نجمی سے محبت کرتا ہوں اس سے شادی کرنا چاہتا تھا کہ والد صاحب بولے "غضب خدا کا اپنے کسی دوست کو بھی بتا کر نہیں گئے بس ہمیں ایک خط لکھ دیا کہ میں ضروری کام سے پشاور جا رہا ہوں۔"

ندیم کے سر سے جیسے بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔ اس نے فوراً کہا۔ "ابوجان اصل میں میرے ایک دوست پر اچانک ایک مصیبت آن پڑی تھی بس اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر فوراً پشاور روانہ ہو گیا۔"

اس گھر میں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ نجمی کو بھگا کر کراچی لے گیا تھا اس کا مطلب تھا کہ نجمی کے گھر والوں نے معاملے کو وہیں دبا دیا تھا انہوں نے نجمی کے گھر سے بھاگ جانے کی خبر نہیں ہونے دی تھی پولیس میں ندیم کے خلاف رپورٹ درج نہیں کرائی تھی۔ ندیم اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔

اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی پھانسی کی سزا معاف ہو گئی ہو اور عدالت نے اسے باعزت بری کر دیا ہو کیونکہ اگر نجمی کے گھر والوں نے یہ بات کسی کو بتائی ہوتی یا تھانے میں ندیم کے خلاف مقدمہ درج کرایا ہوتا تو یہ ناممکن تھا کہ ندیم کے ماں باپ کو اس کی خبر نہ ہوتی انسان بھی کتنا خود غرض ہو جاتا ہے اس وقت ندیم کو اپنے بچ جانے کی بے حد خوشی ہو رہی تھی اور نجمی کے غم کو وہ تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی بالکل فراموش کر بیٹھا تھا اسے اگر خطرہ تھا تو وہ اسے نجمی کی سہیلی شبانہ سے تھا کیونکہ شبانہ نجمی کی رازدار تھی اسے نجمی اور ندیم کے معاشقے کا علم تھا وہ تمام حالات سے واقف تھی اگر نجمی کے

ماں باپ نے شبانہ کو بھی یہی بتایا ہے کہ نجمی کو اچانک اپنے رشتے داروں کے پاس جانا پڑ گیا ہے تب تو ایسی تشویش کی بات نہیں ہے لیکن اگر شبانہ کو شک پڑ گیا ہے کہ نجمی ندیم کے ساتھ گھر سے فرار ہو گئی ہے تو وہ ندیم کو لاہور میں دیکھ کر نہ صرف حیران ہو گی بلکہ اس سے پوچھ گچھ کرنے کی کوشش کرے گی کہ وہ نجمی کو کہاں چھوڑ آیا ہے۔

ندیم نے اپنے سر کو جھٹک دیا اور غسل کرنے کے بعد اس نے کھانا کھایا اور اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر لیٹ کر پڑھنے لگا۔ ندیم کے والد نے خط ملتے ہی کالج میں اس کی چھٹی کی درخواست بھجوا دی تھی صبح ندیم کو یونیورسٹی جانا تھا وہاں شبانہ سے اس کا آمنا سامنا ہونا یقینی بات تھی ندیم دیر تک انہی خیالوں میں الجھا رہا پھر اس نے ٹیبل لیمپ بجھا دیا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا اب اسے نجمی کا خیال آ گیا کہ وہ کہاں ہو گی؟ کس حال میں ہو گی؟

ندیم نے آنکھیں کھول دیں کمرے میں اندھیرا تھا وہ سوچنے لگا نجمی کہاں جا سکتی ہے وہ کہاں چلی گئی ہے کیا وہ اپنی مرضی سے گئی ہے؟ اگر اپنی مرضی سے گئی ہوتی تو ضرور لاہور میں آتی اچانک ندیم کو احساس ہوا کہ ابھی تک یہ بات تو ثابت ہی نہیں ہوئی کہ نجمی اپنے گھر واپس بھی آئی ہے کہ نہیں بہرحال ایک بات واضح ہو کر سامنے آ گئی تھی کہ نجمی کے ماں باپ نے معاملہ دبا دیا ہے اور پولیس تک نوبت نہیں پہنچی باقی اگر نجمی واقعی اپنے گھر واپس آ گئی ہے تو صبح شبانہ سے مل کر پتہ چل جائے گا اسی ادھیڑبن میں ندیم کو نیند آ گئی اسے صبح نجمی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے بعد زمان کو بھی کراچی فون کرنا تھا ندیم صبح یونیورسٹی جانے کے لئے جلدی تیار ہو گیا وہ خود شبانہ کو فون نہیں کرنا چاہتا تھا پہلے اس کا یہی خیال تھا کہ وہ شبانہ سے خود نہیں ملے گا اور کسی ذریعے سے نجمی کے بارے میں اس کا ردعمل معلوم کرے گا لیکن اب اس نے خود شبانہ سے ملنے کا فیصلہ کیا تھا اپنے طور پر وہ یہی ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ جیسے اسے نجمی کے بارے میں کچھ علم نہیں ہے۔

کیمپس کے لان میں طلباء اور طالبات ٹولیوں کی صورت میں بیٹھے باتیں کر رہے

تھے ان میں شبانہ نہیں تھی ندیم کینٹین میں آ گیا شبانہ یہاں بھی نہیں تھی وہ کینٹین سے نکل کر پرنسپل آفس کی طرف جا رہا تھا کہ برآمدے میں سامنے سے شبانہ آتی دکھائی دی ندیم کا دل زور سے دھڑکا پھر اس نے خود کو سنبھالا اور مسکراتے ہوئے شبانہ کی طرف بڑھا وہ بڑے غور سے شبانہ کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ندیم کو دیکھ کر شبانہ کے چہرے پر وہ ردعمل ظاہر نہیں ہوا تھا جو نجمی کے گھر سے بھاگ جانے کی صورت میں ظاہر ہونا چاہیئے تھا اس کا مطلب تھا کہ شبانہ کو بھی نجمی کے فرار کا علم نہیں ہے۔

"شبانہ میں پشاور گیا ہوا تھا رات کو آیا ہوں پھر شبانہ کو ایک طرف لے جا کر رازداری سے کہنے لگا کیا نجمی کہیں باہر گئی ہوئی ہے میں اس کے گھر تو نہیں جا سکا لیکن مجھے اس کی ایک رشتہ دار عورت نے بتایا ہے کہ وہ گھر پر نہیں ہے اور بہاولپور گئی ہوئی ہے۔

شبانہ نے فکرمندانہ انداز میں کہا۔" مجھے بھی یہی پتہ چلا ہے کہ وہ بہاولپور گئی ہوئی ہے مگر تعجب کی بات ہے کہ نجمی نے مجھ سے کوئی ذکر نہیں کیا اور اس کے والد کی طبیعت بھی خراب ہے۔"

اب اس بات کی تصدیق ہو گئی تھی کہ نجمی کے ماں باپ نے نجمی کے فرار کو دبا دیا ہے اور رشتہ داروں میں یہی مشہور کیا ہے کہ نجمی بہاولپور اپنی ماسی کے ہاں گئی ہوئی ہے نجمی کے والد کی علالت کا سن کر ندیم کو تشویش ہوئی یہ ایک قدرتی بات تھی باپ کے لئے یہ ایک بہت بڑے صدمے کی بات تھی۔

شبانہ کہہ رہی تھی "جب مجھے معلوم ہوا کہ تم بھی لاہور میں نہیں ہو تو میں تو یہی سمجھی کہ تم دونوں کہیں اکٹھے بھاگ گئے ہو۔"

ندیم نے اپنے چہرے کو سنجیدہ بنایا اور بولا۔" شبانہ بہن میں ایسا غلط قدم کبھی نہیں اٹھا سکتا اور ایسا وقت آ بھی جاتا تو یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ تم سے مشورہ نہ کرتے۔"

شبانہ نے کہا "اسی لئے تو میں حیران تھی اب تمہیں دیکھا تو یقین آگیا کہ نجمی واقعی بیمار پڑ گئی ہے لیکن اس نے مجھ سے اس کا ذکر کیوں نہیں کیا؟" ہو سکتا ہے کہ اسے جلدی میں جانا پڑ گیا ہو۔ ندیم نے رومال سے منہ صاف کرتے ہوئے کہا۔ اتنا سا جھوٹ بولنے پر ہی اسے پسینہ آگیا تھا اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ نجمی کے بارے میں غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے اسے مجرمانہ احساس ہو رہا تھا۔

وہ کلاس میں جانے کا بہانہ بنا کر شبانہ سے جلد ہی جدا ہو گیا برآمدے کا موڑ مڑتے ہوئے اس نے یونہی بظاہر بے نیازی سے پیچھے دیکھا شبانہ ابھی تک برآمدے میں کھڑی ندیم کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ ندیم کو دو طرح کی پریشانی نے گھیر لیا۔ ایک تو یہ کہ شبانہ اس کی طرف مشتبہ انداز میں کیوں تک رہی تھی اور دوسری یہ کہ ندیم نے اس کی طرف پلٹ کر دیکھا تھا وہ کیا سوچ رہی ہو گی؟

ندیم کے دل میں خیال آیا کہ وہ شبانہ کو سب کچھ بتا دے پھر جب اسے اپنے سامنے سوالات کی سلاخیں نظر آئیں تو اس نے جلدی سے یہ خیال دل سے نکال دیا وہ بوجھل دل کے ساتھ اپنے کیمپس کی طرف چل دیا۔

-- -- -- --

شبانہ بہت کچھ سوچتی ہوئی کلاس روم میں داخل ہو گئی۔ کلاس روم میں نجمی کی شکل دکھائی نہ دی تو شبانہ اداس ہو گئی۔ اداسی شبانہ کو پسند تھی اداسی میں اسے محسوس ہوتا کہ وہ کسی ویران باغ میں سے گزر رہی ہے۔ خزاں کی ہوا میں درختوں کے سوکھے پتے اس کے اوپر گر رہے ہیں، گھاس پر زرد پتوں کا فرش بچھا ہے۔

شبانہ کو اپنے اوپر خزاں کی اداس شہزادی کا گمان ہوتا جو گزری محبتوں کے خواب اپنی پلکوں میں چھپائے زرد پتوں کی سسکیوں میں بہار کی وادیوں کی تلاش میں جا رہی ہو۔ اداسی کی ان ہی زرد پتوں کی لہر شبانہ کو راحیل کے پاس لے گئی تھی۔ راحیل، جس کا کوئی نام نہیں تھا، کوئی بہار نہیں تھی، کوئی خزاں نہیں تھی جو بارشوں میں جنگلوں کا سفر کرتا اور برفباری میں آتشدان کے پاس بیٹھ کر پیالی میں خوشبو دار چائے انڈیلتے ہوئے ورڈز ورتھ کی نظمیں پڑھتا دن کی روشنی میں وہ کہیں دکھائی نہ دیتا اور مہر بہ لب سنسان راستوں کے اندھیرے میں سایہ بن کر ڈھل جاتا یہ وہ جذباتی مسائل تھے جن میں شبانہ الجھی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود اسے نجمی سے بڑا پیار تھا وہ ایک ہی اس کی سہیلی تھی وہ اس کے بارے میں پریشان تھی۔

جب وہ نجمی کے گھر اس کی بیمار پرسی کرنے گئی تو نجمی وہاں موجود نہیں تھی۔ کالج میں اس کی بیماری کی چھٹی کی درخواست آئی تھی۔ نجمی کے والد دوسرے کمرے میں بیمار پڑے تھے اور ڈاکٹر نے اسے کسی سے ملنے کو منع کر رکھا تھا۔ شبانہ نے

نجمی کی والدہ سے نجمی کے بارے میں پوچھا تو پہلے وہ کچھ نہ بولی۔۔۔ پھر بتایا کہ نجمی کو اپنی ماسی کے ہاں بہاولپور جانا پڑ گیا ہے شبانہ کو احساس ہوا کہ اس سے کچھ چھپایا جا رہا ہے مگر وہ ان لوگوں کے ذاتی اور گھریلو معاملات میں دخل نہیں دے سکتی تھی وہ اس امر پر حیران ضرور تھی کہ نجمی کے ابو بیمار پڑے ہیں اور نجمی بہاولپور میں بیٹھی ہے جب شبانہ واپس جانے لگی تو نجمی کی سوتیلی ماں نے اسے کہا کہ وہ نجمی کی طرف سے دس پندرہ دنوں کی چھٹی کی درخواست کالج میں دیدے۔۔ شاید نجمی کو بہاولپور میں زیادہ دن لگ جائیں۔

شبانہ بہت اچھا جی کہہ کر واپس آ گئی تھی۔۔۔ پھر جب شبانہ کے علم میں یہ بات آئی کہ ندیم بھی لاہور میں نہیں ہے اور اس کی چھٹی کی بھی درخواست آ گئی ہے تو اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونے لگے۔۔۔ اگرچہ ندیم کو دیکھ کر اور اس سے باتیں کر کے شبانہ کے دل سے کچھ وسوسے دور ہو گئے تھے تاہم ندیم کا انداز پراسرار اور اکھڑا اکھڑا سا تھا جس سے شبانہ کو مزید شک ہونے لگا تھا۔۔۔ مگر خاموش رہی۔۔۔ وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ نجمی بہاولپور سے اسے خط لکھتی ہے یا نہیں۔ اب ہم وقت کی کتاب کے کچھ اوراق پیچھے کی طرف پلٹتے ہیں اور ان لمحات کو ایک بار پھر واپس لاتے ہیں جب کراچی شہر کی سڑکوں پر مشرق سے ابھرنے والے سورج کی اولین دھندلی روشنی کا پھیکا سا غبار پھیل رہا تھا اور ندیم اپنے دوست زمان کے ہوٹل کے ایک کمرے میں بے خبر سو رہا تھا۔

اور دوسرے کمرے میں بدنصیب دلہن نجمی کو تین آدمی چادر میں لپیٹ کر ہوٹل کی عقبی سیڑھیاں اتر کر باہر کھڑی ایمبولینس گاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ نجمی کو ایمبولینس میں ڈالنے کے بعد ویگن تیزی سے نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔ نجمی بے ہوش تھی۔۔۔۔ دو اچکن پوش آدمی نجمی کے پاس بیٹھے تھے ایک اچکن پوش آگے ڈرائیور کی سیٹ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ یہ لوگ آپس میں کوئی بات نہیں کر رہے تھے بالکل خاموش تھے پتھر کی مورتیوں کی طرح بیٹھے تھے ان میں ایک وکی تھا،

اور ایک جیجک روشیرا تھا۔ اچکنیں انہوں نے اس لئے پہن رکھی تھیں کہ وہ بدنصیب دلہن کے نکاح میں بطور گواہ شرکت کرنے کے لئے آئے تھے اور اب اس غمزدہ بے ہوش دلہن کو اغوا کر کے لئے جا رہے تھے۔ سورج نکلنے سے پہلے پہلے ایمبولینس ویگن شہر سے باہر ایک ایسے ویران علاقے میں پہنچ چکی تھی جہاں دور ایک طرف سمندر کا کنارہ تھا اور ایک جانب فاصلے پر شہر کی عمارتوں کی آخری منزلیں سورج کی روشنی میں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

ویگن آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ زمین ریتلی اور سخت تھی ایک غیر ہموار راستہ اونچے نیچے چھوٹے چھوٹے پتھریلے ٹیلوں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔۔ پھر شہر کی عمارتیں مغربی افق میں چھپ گئیں اور زیادہ ویران اور سنسان علاقہ شروع ہو گیا کبھی ویگن کسی ٹیلے کی اوٹ سے باہر نکلتی تو دائیں جانب دور سمندر کی ایک جھلک نظر آ جاتی۔ ویگن کی چھت پر جو ایمبولینس کی نشانی یعنی سرخ بتی لگی تھی اس نے شہر سے باہر نکلتے ہی جھلملانا بند کر دیا تھا۔

راستے سے ہٹ کر دور ایک جگہ کچھ درخت دکھائی دیئے۔۔۔ ویگن ان درختوں کی طرف مڑ گئی۔ یہ درخت زیادہ گھنے نہیں تھے ان کے نیچے ایک لمبی بیرک سی بنی ہوئی تھی جس کی ڈھلانی چھت کے تختے جگہ جگہ سے اکھڑے ہوئے تھے۔ بیرک کے آگے ایک برآمدہ تھا جس کا فرش گرد آلود تھا۔ صحن میں ایک جیپ کا صرف ڈھانچہ ہی کھڑا تھا۔ کونے میں دیوار کے ساتھ لکڑی کے خالی کھوکھوں کا ڈھیر لگا تھا۔ یہاں بظاہر کچھ بھی نہیں تھا مگر ایک چوکیدار برآمدے کے سامنے بندوق لئے اسٹول پر بیٹھا پہرہ دے رہا تھا۔

ویگن کو بیرک کے احاطے کی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ جلدی سے اٹھا اور احاطے کی ٹوٹی ہوئی کچی دیوار میں بنے جنگلے کی طرف بڑھا۔ ویگن احاطے میں تیزی سے داخل ہو کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ تینوں آدمی یعنی وکی، لٹونی اور شیرا جلدی سے ویگن میں سے باہر نکل آئے۔ جیجک روشیرے نے چوکیدار سے کہا۔ "چاچا! مال آیا ہے۔۔ کونے والی کوٹھڑی کھول دو۔"

چوکیدار بیرک کی کونے والی کوٹھڑی کی طرف دوڑا۔۔۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے اس نے جیب سے چابی بھی نکال لی تھی۔ کوٹھڑی کا تالا کھول کر اس نے دروازے کا ایک پٹ کھول دیا اور خود پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ وکی، ٹونی اور جیک روشیرا بے ہوش نجمی کو اٹھائے چلے آ رہے تھے۔ کمرے میں صرف ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی انہوں نے نجمی کو چارپائی پر ڈال دیا۔

جیک روشیرے نے ٹونی کو اشارہ کیا ٹونی بیرک کے دوسرے کمرے میں گیا جو کاٹھ کباڑ سے بھرا ہوا تھا وہاں سے وہ ایک زنجیر نکال کر لے آیا اس زنجیر کے دونوں سروں پر ایک ایک ہتھکڑی لگی تھی۔ شیرے نے ایک ہتھکڑی بے ہوش نجمی کے پاؤں میں ڈال کر تالا لگا دیا اور دوسری ہتھکڑی چارپائی کے پائے کے ساتھ لگا کر مقفل کر دی۔ یہ زنجیر اتنی لمبی تھی کہ آدمی کمرے میں آسانی سے چل پھر سکتا تھا۔

کمرے میں صرف ایک چھوٹا سا روشندان تھا جس پر لوہے کی سلاخیں لگی تھیں اس کمرے میں ایک مختصر سا غسل خانہ بھی تھا جس میں کوئی روشندان یا کھڑکی نہیں تھی گویا یہ خاص طور پر اغوا شدہ لوگوں کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر تینوں آدمی کمرے سے باہر آ گئے۔ انہوں نے دروازہ بند کر کے تالا لگایا۔۔ چابی چوکیدار کے حوالے کی اور پھر شیرے نے چوکیدار کو ایک طرف لے جا کر کچھ ضروری ہدایات دیں اور یہ تینوں آدمی ویگن میں بیٹھ کر جدھر سے آئے تھے اُدھر ہی چلے گئے۔

چوکیدار سیاہ فام مضبوط تن و توش کا آدمی تھا۔ شیرے، ٹونی اور وکی کے جانے کے بعد اس نے جیب سے بیڑی نکال کر سلگائی اور برآمدے کے آگے درخت کی چھاؤں میں رکھے اسٹول پر بیٹھ گیا۔ زمان کے کارندے وکی، ٹونی اور شیرا نجمی کو ویران مقام پر واقع بیرک میں بند کرنے کے بعد ایک گمنام جگہ پر جا کر اپنے باس یعنی زمان کی ٹیلی فون کال کا انتظار کرنے لگے۔

اس کے بعد ندیم کے ساتھ جو کچھ بیتی اور زمان نے اس کے ساتھ جو ڈرامہ کیا وہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ اسی رات کو ندیم پریشان حالی میں لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔

تو واپس ہوٹل میں آ کر زمان نے شیرے کو خفیہ جگہ پر ٹیلیفون کیا اور پوچھا کہ مال رکھوا دیا ہے گودام میں؟ جب شیرے نے اسے بتایا کہ مال رکھوا دیا گیا ہے تو زمان نے اسے کہا کہ انتظار کرو اور فون بند کر دیا اس کے بعد زمان نے ایک اور جگہ فون کیا اور بولا۔

"ہیلو سیٹھ کیا حال ہے؟ میں نے اس لئے فون کیا ہے کہ مال آ گیا ہے۔۔۔ میں اسے بہت جلد ایکسپورٹ کر دینا چاہتا ہوں کیونکہ گودام میں اتنی جگہ نہیں ہے ... نہیں سیٹھ یہ بات نہیں ہے۔۔۔ اصل میں خطرہ ہے مال پڑا پڑا خراب نہ ہو جائے .... او کے۔۔۔ میں دو دن انتظار کر لوں گا۔۔۔ مجھے معلوم ہے سیٹھ مال کہاں پہنچانا ہے.... ہم تو جائز کاروبار کرتے ہیں اور پوری دیانت داری کے ساتھ۔۔۔ او کے ... خدا حافظ!"

اس وقت رات کے دس بج رہے تھے زمان نے کار نکالی اور اس خفیہ اڈے کی طرف چل پڑا جہاں اس کے تینوں کارندے اس کا انتظار کر رہے تھے جاتے ہی اس نے شیرے سے کہا۔ "اسے زنجیر ڈال دی تھی؟" شیرا بولا۔

"بالکل ڈال دی تھی استاد اور چوکیدار کو بھی سمجھا دیا تھا۔" زمان سگریٹ سلگا کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔۔۔ پھر اس نے لیمپ کی روشنی میں ایک ایک کر کے تینوں کارندوں کو غور سے دیکھا اور بولا۔

"یہ مال بڑا قیمتی ہے۔۔۔ اس کی بہت قیمت پڑے گی۔۔۔ ایجنٹ سے میں نے بات کر لی ہے۔۔۔ دو دن کے بعد ہمیں مال اس کے حوالے کر دینا ہو گا۔۔ لیکن اس وقت میں اس عہد کو دہرانا چاہتا ہوں جو میں نے تم سے لے رکھا ہے اور جس کی خلاف ورزی کا انجام تم تینوں کو اچھی طرح معلوم ہے۔۔۔ وکی! تم بولو۔" وکی نے کہا "ہم اس لڑکی پر بری نیت سے ہاتھ نہیں ڈالیں گے۔"

زمان نے ٹونی کی طرف دیکھ کر کہا "ٹونی! تم اپنا عہد دہراؤ۔" ٹونی نے کہا "ہم لڑکی کو کسی کی امانت سمجھ کر اپنے پاس رکھیں گے.... اس کی عزت کی حفاظت کریں گے۔"

اب زمان نے چیک روشیرے کی طرف دیکھا شیرے نے کہا۔ "اگرچہ نکاح نامے کی رو سے وہ میری منکوحہ بیوی بن چکی ہے مگر وہ میرے لئے حرام ہے"۔ زمان نے جیب سے چھوٹا سا جرمن آٹومیٹک پستول نکال لیا اور اس کی چمکیلی نالی پر انگلی پھیرتے ہوئے بولا۔ "تم لوگ اچھی طرح جانتے ہو کہ اس پستول میں سے نکلی ہوئی گولی نے راجو کو کیوں ہلاک کیا تھا... اس لئے کہ اس نے میرے کاروباری اصولوں کو اور اپنے عہد کو توڑتے ہوئے میرے لائے ہوئے مال پر، میری امانت پر ہاتھ ڈالا تھا... یہ میرا شروع ہی سے اصول رہا ہے کہ جو عورت ایکسپورٹ ہونے کے لئے یہاں لائی جاتی ہے میں اس کی حفاظت کرتا ہوں جب تک کہ وہ ایکسپورٹ نہیں ہو جاتی.... راجو نے اس اصول کو توڑنا چاہا تھا اور میں نے اسے قتل کر دیا۔"

اب زمان نے شیرے کی طرف دیکھا اور بولا۔ "اس بار جو لڑکی لائی گئی ہے اس کا نکاح تجھ سے کروایا گیا ہے۔ یہ جعلی نکاح ہے اس پر سوائے تمہارے اور لڑکی کے باقی سب دستخط نقلی ہیں... مگر اسے کوئی نقلی ثابت نہیں کر سکتا تم خوب جانتے ہو کہ ایسا کیوں کیا گیا ہے... محض اس لئے کہ اس لڑکی پر ہمارا حق بنا رہے اور اگر کبھی ایسی صورتحال پیدا ہو جائے تو تم نکاح نامہ دکھا کر اسے اپنی بیوی ظاہر کر سکو.... اس کے سوا تمہارا اس لڑکی سے کوئی تعلق نہ ہے، نہ رہے گا... مجھے یقین ہے کہ تم میری بات سمجھ گئے ہو گے۔"

شیرے نے سر کو اثبات میں ہلاتے ہوئے کہا۔ "استاد! یہ کوئی کہنے کی بات ہے.... ہم سب سمجھتے ہیں میری طرف سے تمہیں کبھی شکایت کا موقع نہیں ملے گا"۔ زمان نے مسکراتے ہوئے پستول پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔ "شکایت کا موقع تو اس پستول کی گولی کسی کو بھی نہیں دیتی میرے دوست!"

زمان اٹھ کھڑا ہوا "آج دس تاریخ ہے... تیرا تاریخ کی آدھی رات کو لانچ مقررہ مقام پر پہنچ جائے گی ہمیں مال اسی رات ایجنٹ کے حوالے کر دینا ہو گا.... مال کی حفاظت کی ذمہ داری اب تم پر عائد ہوتی ہے... تم میں سے ہر ایک باری

باری بیرک میں ڈیوٹی دے گا۔"

زمان چلا گیا۔ دکی، لوٹی اور شیرا وہیں بیٹھے رہے۔ شیرے نے کہا کہ "آج کی باقی رات بیرک میں پہرے کی ڈیوٹی میں دوں گا۔" دکی، لوٹی کو نیند آ رہی تھی وہ بڑے خوش ہوئے کہ اس وقت وہ رات کو پہرہ دینے کی ڈیوٹی سے بچ گئے ہیں۔ شیرے نے جیپ نکالی اور شہر سے دور سنگلاخ ٹیلوں والی اس ویران بیرک کی طرف روانہ ہو گیا جہاں نجمی بے بسی کے عالم میں قید تھی۔ صبح جب یہ لوگ اسے بیرک میں بند کر کے چلے گئے اور چوہدرا۔ باہر برآمدے میں اسٹول ڈال کر بیٹھ گیا تو اس وقت دن کافی نکل آیا تھا۔

نجمی کو ہوش آ گیا اس کا سر ابھی تک بھاری تھا... پہلے تو وہ یہ سمجھی کہ وہ اپنے ہوٹل والے حجلۂ عروسی میں ہی ہے لیکن بہت جلد اسے محسوس ہو گیا کہ وہ کھری چارپائی پر پڑی ہے اور چھت کے ساتھ پنکھا بھی نہیں چل رہا۔ روشندان میں سے دن کی روشنی کمرے میں آ رہی تھی۔ نجمی جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی اس کے اٹھتے ہی اس کے پاؤں کی زنجیر جھنجھنا اٹھی۔

نجمی نے اپنے پاؤں میں بندھی ہوئی زنجیر دیکھی تو اس کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکل گئی وہ چارپائی سے اتری تو اسے چکر سا آ گیا۔ وہ وہیں بیٹھ گئی دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے کمرے کا جائزہ لینے لگی کہ وہ کہاں آ گئی ہے اور اس کے پاؤں میں زنجیر کس نے ڈال دی ہے؟ وہ پڑھی لکھی لڑکی تھی اس قسم کے واقعات اخباروں اور رسالوں میں پڑھ چکی تھی فوراً سمجھ گئی کہ اس کے ساتھ دھوکا ہوا ہے اور کوئی اسے اغوا کر کے یہاں لے آیا ہے۔ اسے جو چائے دی گئی تھی اس میں بے ہوشی کی دوائی تھی... یہ کام اسی چیک رواچکن پوش کا ہے جس نے اسے چائے لا کر دی تھی... مگر وہ تو ندیم کے دوست زمان کا آدمی تھا وہ یہ بھیانک حرکت کیسے کر سکتا تھا؟ ندیم کہاں ہو گا؟ کیا ندیم کو معلوم ہے کہ مجھے اغوا کیا گیا ہے؟ نجمی کے دل میں پریشان خیالوں کے طوفان امڈ رہے تھے وہ اٹھی تو پاؤں کی زنجیر بج اٹھی اس نے

دیکھا کہ زنجیر کا دوسرا سرا چارپائی کے پائے کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ نجمی کی آنکھوں کے
سامنے اندھیرا چھا گیا یہ کیا ہو گیا ہے؟ وہ کہاں آ گئی ہے؟ اب اس کے ساتھ کیا ہو گا؟
نجمی نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا اور بے اختیار رونے لگی۔

ندیم، شبانہ اور اپنے ابو کے چہرے اس کی آنکھوں کے سامنے آ گئے اب اسے
اپنی سوتیلی ماں بھی یاد آ رہی تھی۔ نجمی کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی وہ دیر تک اپنی قسمت
پر بلکہ اپنی حماقت پر آنسو بہاتی رہی۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے گھر
سے قدم باہر نکال کر کتنی خوفناک غلطی کی تھی۔ وہ روتے روتے ندیم کو پکارنے لگی۔

"ندیم تم کہاں ہو؟ تم میری مدد کو کیوں نہیں آتے؟ پھر اس نے ہاتھ جوڑ کر خدا
کے حضور گڑگڑا کر اپنے گناہ کی معافی مانگی اور کہا۔

"میرے خدا! مجھے ایک بار یہاں سے نکال دے پھر میں ایسی غلطی کبھی نہیں کروں
گی۔۔۔ میرے گناہوں کو بخش دے۔۔۔ میری غلطیوں کو معاف کر دے۔" روتے روتے
نجمی کی چیخیں نکل گئیں ان چیخوں کی آواز باہر بیٹھے ہوئے چوکیدار تک باقاعدہ پہنچ رہی تھی
مگر یہ اس کے لئے کوئی نئی آواز نہیں تھی جو بھی عورت اس بیرک میں قید کی جاتی تھی
وہ رونی ضرور تھی۔

یہ چوکیدار بھی زمان، ٹونی، وکی اور شیرے کی طرح نارمل انسانی احساسات
اور جذبات والا آدمی نہیں تھا اس نے بھی زمان، ٹونی، وکی اور شیرے کی طرح
اپنے ضمیر کو یہ کہہ کر وقتی طور پر افیون دے رکھی تھی کہ یہ تو ایک کاروبار ہے جو
عورتیں یہاں لائی جاتی ہیں ان کا کوئی نہیں ہوتا بے یار و مددگار ہوتی ہیں۔ انہیں
ایکسپورٹ کر دیا جاتا ہے اور پھر وہ نئے ماحول میں پہنچ کر سب کچھ بھول جاتی ہیں
اور ہنسی خوشی زندگی بسر کرنا شروع کر دیتی ہیں ایک طرح سے تو یہ ان کی امداد
ہی ہوتی ہے۔ چوکیدار بھی نجمی کے رونے کی آواز سن کر اپنے دل میں کہہ رہا تھا
"احمق لڑکی اب رو رہی ہے۔۔۔ کچھ روز بعد نئے ماحول میں، نئے گھر میں ہنسد
یار ہنس کھیل رہی ہو گی۔"

چنانچہ نجمی بند کمرے میں کبھی ندیم، کبھی اپنے ابو جان اور کبھی اپنی پیاری سہیلی
شبانہ کو یاد کر کے روتی رہی اور باہر چوکیدار بڑے اطمینان سے بیڑی پیتا رہا۔۔۔
پھر وہ اٹھ کر بیرک کے کونے والے چھوٹے سے باورچی خانے میں چلا گیا یہاں
ضرورت کے مطابق آٹا، چاول، گھی، چینی اور دالیں وغیرہ ڈبوں میں موجود تھیں
چوکیدار کھچڑی تیار کرنے لگا۔ کھچڑی تیار کر کے وہ ایک تھالی میں ڈال کر پانی کے
کٹورے کے ساتھ نجمی کے پاس لے گیا۔۔۔ نجمی نے چوکیدار کو دروازہ کھول کر اندر آتے
دیکھا تو اس کے پاؤں پر گر کر بے اختیار رونے لگی۔

"خدا کے لئے میرے حال پر رحم کرو۔۔۔ میں شریف ماں باپ کی بیٹی ہوں۔۔۔
مجھے یہاں سے آزاد کر دو۔" چوکیدار ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور بولا۔

"شریف ماں باپ کی بیٹیاں گھر سے نہیں بھاگا کرتیں یہ کھچڑی کھا لو۔۔۔ نہیں کھاؤ
گی تو یہاں تمہاری اماں تمہیں آ کر نہیں کھلائے گی۔" یہ کہہ کر چوکیدار نکل گیا اور اس نے
دروازے پر تالا لگا دیا۔ نجمی آنسو پونچھتی ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ چوکیدار کا جملہ تیر بن کر
اس کے دل میں پیوست ہو گیا تھا۔

اس نے ٹھیک ہی تو کہا تھا شریف ماں باپ کی بیٹی گھر سے نہیں بھاگتی وہ مر
جاتی ہے مگر ماں باپ کی عزت کو خاک میں ملا کر گھر سے باہر قدم نہیں نکالتی اور نجمی تو
گھر سے بھاگ کر آئی تھی۔۔۔ اس نے تو اپنے شریف النفس باپ کی عزت کا بھی خیال
نہیں کیا۔ ماں سوتیلی سہی آخر اس کے باپ کی بیوی تھی اور باپ چاہے اس کی طرف سے
کتنا ہی بے بس اور مجبور کیوں نہ ہو آخر اس کا باپ تھا وہ اس کی عزت تھی اس کی آبرو
تھی۔ ہرنی جب پیاس بجھانے کے لئے اس تالاب کا رخ کرتی ہے جہاں شیر پانی پینے
آتے ہوں تو اس کا انجام ظاہر ہے۔ نجمی کو کبھی یقین نہیں آ سکتا تھا کہ اسے ندیم نے زمان
کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے تو کیا زمان نے اسے یہاں قید کر رکھا ہے؟ کیا وہ اسے
بردہ فروشوں کے حوالے کرنا چاہتا ہے؟

زمان تو ندیم کا بڑا مخلص دوست تھا اور بھابی بھابی کہتے اس کی زبان نہیں تھکتی

تھی۔۔۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ یہ سب کچھ بھول کر اپنے دوست کے اعتماد کے سینے میں خنجر گھونپ دیتا۔۔۔ نہیں۔۔۔ نجمی نے سوچا یہ سب کچھ اس آدمی نے اپنے طور پر کیا ہے جو اس کے لئے چائے لے کر آیا تھا اس نے ایک گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کو دیکھا اور اس کی نیت خراب ہو گئی۔

نجمی نے رونے دھونے کی بجائے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے وہاں سے کسی طرح فرار ہونے کی ترکیبوں پر غور کرنا شروع کر دیا۔ وہ کوئی ان پڑھ لڑکی نہیں تھی۔ اس نے اپنے آپ کو بہت جلد سنبھالا دیا حالات کی سنگینی کو قبول کیا اور سوچنے لگی کہ وہاں سے کیسے فرار ہو سکتی ہے۔ چوکیدار کی زبان سے اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ ابھی تک کراچی کے علاقے میں ہی ہے اور اسے ملک سے باہر نہیں لے جایا گیا اس نے کمرے کا اب ایک دوسری نظر سے جائزہ لیا۔ کمرے میں چھت کے پاس ایک ہی روشندان تھا جس میں لوہے کی سلاخیں لگی تھیں یہاں سے فرار ہونا ناممکن تھا باقی اس کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔

چوکیدار نے دروازے کو باہر سے تالا لگا دیا تھا۔ نجمی نے کھچڑی کی تھالی کی طرف دیکھا اسے بھوک لگ رہی تھی مگر کھانے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن اسے وہاں سے فرار ہونا تھا اور وہ اپنے جسم کی طاقت ہر حالت میں بحال رکھنا چاہتی تھی۔ اس نے تھوڑی سی کھچڑی کھائی۔۔۔ پانی پیا اور چارپائی پر جا کر بیٹھ کر سوچنے لگی کہ وہ وہاں سے کیسے بھاگ سکتی ہے۔ اپنے ماں باپ کے گھر سے اسے بھاگنا نہیں چاہیئے تھا مگر وہ کتنی آسانی سے بھاگ آئی تھی اور یہاں سے وہ ہر حالت میں اپنی عزت بچا کر بھاگ جانا چاہتی تھی لیکن وہاں سے بھاگنا اسے ناممکن نظر آ رہا تھا۔ اس کے پاؤں میں جو زنجیر بندھی تھی وہ غسل خانے میں نجمی کے ساتھ ساتھ گئی۔ منہ ہاتھ دھونے سے نجمی کا ذہن تیزی سے غور و فکر کرنے لگا۔ وہ چارپائی پر بیٹھ گئی اور اپنے آپ سے بولی میں اپنی عزت کی خاطر جان قربان کر دوں گی۔۔۔ میں یہاں سے بھاگ کر سیدھی اپنے گھر جاؤں گی۔

اپنے پیارے ابو کے پاس جاؤں گی۔۔۔۔ مجھے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔

ں نے باہر کان لگا دیئے۔۔۔۔ باہر سے سوائے کبھی کبھی کسی پرندے کے بولنے کے
دسری کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد چوکیدار برتن لینے آیا تو بندوق اب
بی اس کے ہاتھ میں تھی۔ نجمی نے اس کی طرف دیکھ کر عاجزی سے کہا۔ "انکل مجھے معاف
ر دو۔۔۔ مجھ سے غلطی ہو گئی کہ میں ندیم کے ساتھ گھر سے بھاگی۔۔۔۔ مجھے خدا کے لئے
معاف کر دو اور یہاں سے باہر جانے دو۔"

چوکیدار نے غصے میں کہا۔ "خبردار جو مجھے انکل کہا اب جو کیا ہے اسے بھگت
یہاں کوئی تیری مدد نہیں کر سکتا۔" اور چوکیدار خالی برتن لے کر باہر نکل گیا۔ دن
زرتا چلا گیا۔ روشندان سے جو دن کی روشنی آ رہی تھی جب وہ پھیکی پڑنے لگی تو
ی سمجھ گئی کہ باہر سورج غروب ہو رہا ہے۔ بند دروازے کی درازوں پر بھی باہر
جانب ٹین کی پتریاں جڑ دی گئی تھیں۔۔۔ پھر کمرے میں اندھیرا ہونے لگا۔ کمرے
ں بجلی نہیں تھی۔

چوکیدار ایک بار پھر اندر آیا اور طاق میں لالٹین جلا کر واپس چلا گیا۔ نجمی اس سے
تھ جوڑ کر پوچھتی ہی رہ گئی کہ اسے وہاں کیوں لایا گیا ہے ندیم کہاں ہے؟ زمان صاحب
ہاں ہیں؟ مجھے ان کے پاس لے چلو۔۔۔ مگر چوکیدار جیسے گونگا بہرہ بن گیا تھا۔ لالٹین اندر
ھ کر وہ چلا گیا اور باہر سے ایک بار پھر تالا لگا دیا گیا۔ رات کو نجمی کو وہی کھچڑی کھا
ر دی گئی۔۔۔۔

اب تو چوکیدار نے چپ سادھ لی تھی اور نجمی کی طرف پھٹی پھٹی نوکھا جانے
والی نظروں سے دیکھتا۔ نجمی انتہائی مایوسی کے عالم میں چارپائی پر بیٹھ گئی۔۔۔ پھر
اس نے غسل خانے میں جا کر وضو کیا اور نماز پڑھی۔ نماز پڑھنے کے بعد جب وہ ہاتھ
پھیلا کر خدا سے دعا مانگنے لگی تو اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ وہ
ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔۔۔ گڑگڑا کر خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتی
گئی اور روئے جاتی تھی۔ جب اس کے دل کو تھوڑی سی تسکین ہوئی تو اس نے

ہاتھ آنسو بھرے چہرے پر پھیرا اور چھت کی طرف منہ اٹھا کر کہا۔ "میرے اللہ! میری مدد فرما۔۔۔ میرے گناہ معاف کر دے میں توبہ کرتی ہوں۔۔۔ تو توبہ قبول کرنے والا ہے آئندہ ایسی غلطی، ایسا گناہ کبھی نہیں کروں گی۔"

نماز پڑھنے اور خدا کے حضور اپنے گناہوں کی معافی مانگنے سے نجمی کے دل کو تسکین بھی ملی اور نئی طاقت بھی ملی۔۔۔ وہ حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گئی تھی۔۔۔ اس نے کھچڑی کھائی۔۔۔ پانی پیا اور پلنگ پر لیٹ کر سوچنے لگی کہ وہاں سے فرار ہونے کے لئے وہ کون سی حکمتِ عملی اختیار کرے۔۔۔ بظاہر اسے کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور پھر اسے نیند آ گئی کسی نے سچ کہا ہے کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔

نجمی کو بھی سولی پر نیند آ گئی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب زمان ندیم کو لاہور جانے والی ٹرین میں سوار کروا کر سیدھا اپنے ہوٹل آیا تھا اور وہاں سے اپنے آدمیوں کو فون کرنے کے بعد خفیہ ٹھکانے پر جا کر شیرو، وکی اور لٹوتی کو ضروری ہدایات دے رہا تھا اور پھر جب آدھی رات کے بعد جیک روشیرا خاص طور پر اس رات چوکی پر پہرے کی ڈیوٹی ادا کرنے بیرک کی طرف جیپ پر سوار چلا آ رہا تھا تو نجمی اس وقت بھی سو رہی تھی جیک روشیرا رات کے اندھیرے میں سنگلاخ چٹانوں میں جیپ چلاتا خفیہ کمین گاہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

اس وقت شیرے کا ذہن کیا سوچ رہا تھا یہ سوائے اس کے دوسرا کوئی نہیں جانتا تھا۔ جب سے شیرے نے ہوٹل میں نجمی کو دیکھا تھا اس کے دل میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی اور پھر جب زمان نے نکاح نامہ پر شیرے کو دستخط کرنے کے لئے کہا تو اس کے دل میں ایک نئے منصوبے نے جنم لے لیا۔ شیرے کو نجمی سے محبت ہو گئی تھی اس سے پہلے جب بھی زمان اس کی جھوٹ موٹ کی شادی کسی عورت سے کرواتا اور پھر اس عورت کو باہر ایکسپورٹ کر دیتا اور شیرے سے نکاح نامہ لے کر اپنے پاس رکھ لیتا تھا تو شیرے کے دل میں کبھی ایسا خیال نہیں آیا تھا جو اب اس کے

دل میں کروٹیں لے رہا تھا۔ نجمی سے زیادہ خوبصورت لڑکی اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ زمان کے ساتھ مل کر وہ جو عورتیں دوسرے ملک میں ایکسپورٹ کرتا رہا تھا وہ عام طور پر دیہاتی اور ان پڑھ ہوا کرتی تھیں اور شکل و صورت بھی ان کی واجبی ہوتی تھی مگر نجمی ان سب سے مختلف تھی وہ نہ صرف یہ کہ بے انتہا خوبصورت تھی بلکہ پڑھی لکھی بھی تھی یہی وجہ ہے کہ زمان نے اس کی بھاری قیمت ڈالی تھی۔۔۔ مگر شیرے کے ذہن میں ایک دوسرا ہی پروگرام تھا۔ نکاح نامہ ابھی اس کے پاس ہی تھا اس وقت بھی نکاح نامہ شیرے کی جیکٹ میں تھا۔ جیپ ساحل سمندر سے دور اونچے نیچے سنگین ٹیلوں کے درمیان سے گزر رہی تھی چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی آسمان پر ستارے اس طرح نکلے ہوئے تھے جیسے راکھ میں سے کہیں کہیں ادھ بجھے انگارے جھانک رہے ہوں۔ بھرا ہوا پستول شیرے کے کاندھے سے گولیوں کی پیٹی کے ساتھ لٹک رہا تھا۔ اس نے جیپ کی ہیڈ لائٹس بجھا رکھی تھیں۔

جب وہ خفیہ بیرک کے قریب پہنچا تو جیپ کی آواز سن کر چوکیدار ہوشیار ہو گیا وہ سمجھ گیا کہ ان کی ٹولی کا کوئی آدمی رات کے پہرے کے لئے آ رہا ہے جب یہاں کوئی عورت رکھی جاتی تھی تو چوکیدار کے علاوہ بھی زمان کا خاص ایک آدمی وہاں آ کر رات کو پہرہ دیتا تھا پھر بھی چوکیدار ہوشیار ہو کر بیرک کی دیوار کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ بندوق کا رُخ جیپ کی طرف تھا اور وہ آنکھیں پھاڑے اندھیرے میں جیپ کے ہیولے کو آگے بڑھتے دیکھ رہا تھا۔ جیپ احاطے میں داخل ہو کر ایک طرف رُک گئی۔ چوکیدار نے اپنی جیپ کو پہچان لیا تھا پھر جب شیرا جیپ سے باہر نکلا تو چوکیدار قریب آ کر بولا۔ "جب اتنی رات گزر گئی تھی تو تم نے کیوں تکلیف کی شیرے؟ میں تو یہاں موجود ہی تھا۔"

شیرے نے پستول والی پیٹی کاندھے کے اُوپر کرتے ہوئے کہا "تم زمان کو نہیں جانتے کیا؟ وہ اصول کا آدمی ہے عجیب عجیب اصول بنا رکھے ہیں اس نے۔۔۔ بہرحال سب ٹھیک ہے نا؟

"بالکل ٹھیک ہے... لڑکی کو دن میں دو بار کھچڑی بھی کھلا دی تھی۔" شاباش! یہ بہت ضروری تھا... لڑکی نے شور تو نہیں مچایا؟" شبیرے نے برآمدے کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔ چوکیدار بولا۔ "شور تو نہیں مچایا مگر روتی بہت رہی ہے اب تو گہری نیند سو رہی ہے۔"

شبیرا برآمدے میں پاؤں سیڑھی پر رکھ کر بیٹھ گیا۔ جیب سے اعلیٰ قسم کے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ چوکیدار کو دیا ایک خود سلگایا۔ ہولسٹر میں سے پستول نکال کر اپنے پاس رکھ لیا اور کہنے لگا۔ "اب تو جا کر اپنی کوٹھری میں آرام کر میں پہرہ دینے کے لئے آگیا ہوں۔"

پہلے بھی جب رات کو زمان کے ساتھیوں میں سے کوئی پہرہ دینے آجاتا تھا تو چوکیدار کو مزے سے سو جانے کا موقع مل جاتا تھا۔ شبیرے کو دیکھ کر وہ اس لئے بھی خوش ہوا تھا کہ اب وہ باقی رات آرام سے بے فکری کی نیند سو سکے گا۔ اس نے شبیرے کو سلام کیا اور سگریٹ کا کش لگاتا رات کے اندھیرے میں اپنی کوٹھری کی طرف چل پڑا اس کی کوٹھری بیرک کے کونے میں کچن کے پاس ہی تھی۔ جانے سے پہلے وہ اس کوٹھری کی چابی حسب معمول شبیرے کو دے گیا تھا جس میں نجمی قید تھی۔

چوکیدار جب اپنی کوٹھری میں چلا گیا تو شبیرے نے طویل سانس لے کر آسمان کی طرف دیکھا چھدرے درختوں میں سے آسمان پر بجھے بجھے سے ستارے نظر آرہے تھے چاروں طرف موت ایسا سناٹا طاری تھا۔ شبیرے نے گردن گھما کر ایک نظر نجمی والے کمرے پر ڈالی۔ اس کے دل میں عجیب قسم کے جذبات پیدا ہونے لگے۔ وہ خاموشی سے سگریٹ پیتا رہا اور اندھیرے میں پارک کے احاطے میں بند جنگلے کی طرف ٹکٹکی باندھے تکتا رہا۔ اندھیرے میں جنگلے کا ایک خاکہ سا ہی نظر آرہا تھا۔ شبیرا اس انتظار میں تھا کہ چوکیدار گہری نیند سو جائے۔

ایک سگریٹ ختم ہوا تو اس نے دوسرا سگریٹ جلا لیا۔ شبیرے کے دل میں ہزاروں وسوسے اور اندیشے پیدا ہو رہے تھے اسے معلوم تھا کہ اس نے جس

منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا ہے اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ زمان کے ہاتھ بڑے لمبے تھے ملک میں شاید ہی کوئی شہر ایسا تھا جہاں اس کے سفاک ایجنٹ موجود نہ ہوں یہ وہ لوگ تھے جن کا کام ہی ماں باپ سے ناراض، نکھٹو اور ظالم شوہروں اور ساس کے ظلم سے تنگ آئی ہوئی عورتوں کو اپنی پھیپھے کٹنیوں کے ذریعے ورغلا کر اغوا کر کے زمان کے خفیہ ٹھکانے پر پہنچانا تھا۔ یہ قاتل قسم کے لوگ تھے اور انسانی جان کی ان کے سامنے کوئی قیمت نہیں تھی۔ خود زمان دو آدمیوں کے خون سے ہاتھ رنگ چکا تھا اور ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے قانون کی گرفت سے آزاد پھر رہا تھا اگر شبیرا اپنے پروگرام پر عمل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر ہر شہر میں اس کی زندگی خطرے میں تھی یہی وجہ تھی کہ اس نے ایک ایسی ترکیب سوچ رکھی تھی کہ زمان کے فرشتے بھی اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے تھے۔ شبیرا چوتھا سگریٹ پی رہا تھا۔

اس نے سگریٹ کو زمین پر پھینک کر پاؤں سے مسلا اور اٹھ کر چوکیدار کی کوٹھری کی طرف آگیا۔ کوٹھری کے اندر اندھیرا تھا۔ شبیرے نے بند دروازے کے ساتھ کان لگایا اندر سے چوکیدار کے خراٹوں کی آواز آئی وہ پستول والی بیلٹ کو کاندھے پر اوپر کرتا لمبے لمبے ڈگ بھرتا نجمی کی کوٹھری کے پاس آکر رک گیا اس نے جیب سے چابی نکال کر تالا کھولا پھر آہستہ سے کمرے میں داخل ہو گیا اور دروازہ فوراً بند کر دیا۔ دروازہ بند کرنے کی آواز سے نجمی ہڑبڑا کر جاگ پڑی۔ شبیرے نے جلدی سے کہا۔

"یقین کرو میں کسی بری نیت سے نہیں آیا میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔" کمرے کے طاق میں لالٹین کی لو دھیمی کر دی گئی تھی۔ فضا میں مٹی کے تیل کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ نجمی کے چہرے پر گھبراہٹ تھی سمٹ کر چارپائی کے کونے میں بیٹھ گئی۔ اس کے پاؤں کے ساتھ بندھی ہوئی آدھی زنجیر چارپائی سے نیچے لٹک رہی تھی۔ نجمی نے اس دھیمی روشنی میں بھی چیچک رو شبیرے کو پہچان لیا تھا۔ یہی وہ شخص تھا جو اس کے لئے بے ہوشی کی دوائی والی چائے لایا تھا۔

نجمی کے دل میں اس کے خلاف نفرت کا ہیجان سا امڈ پڑا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اس کا منہ نوچ لے مگر وہ بے بسی کے عالم میں شدید حقارت کے ساتھ اسے دیکھتی رہی آخر اس سے نہ رہا گیا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"تم نے مجھ سے کس جنم کا بدلہ لیا ہے تم ہی نے مجھے بے ہوشی والی چائے پلائی تھی آخر میں نے تم لوگوں کا کیا بگاڑا ہے۔ ندیم کہاں ہے۔ زمان بھائی کہاں ہے؟ یہ لوگ میری مدد کیوں نہیں کرتے۔" شبیر اپڑی احتیاط اور وضع داری کے ساتھ آگے بڑھ کر چارپائی کی پائنتی بیٹھ گیا۔ نجمی نے نفرت سے اپنے پاؤں مزید پیچھے کھینچ لئے۔

"چلے جاؤ یہاں سے نہیں تو میں شور مچا دوں گی تم میرے قاتل ہو، میرے دشمن ہو، ندیم نہیں ہے تو مجھے میرے بھائی زمان کے پاس لے چلو۔ میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں۔" شبیر نے کہا۔

"جس کو تم اپنا بھائی کہہ رہی ہو اسی زمان کے حکم پر میں نے تمہیں بے ہوشی والی چائے پلائی تھی۔" نجمی غصّے سے بولی۔

"تم جھوٹ بولتے ہو زمان کبھی ایسا نہیں کر سکتا مجھے بتاؤ ندیم کہاں ہے؟ مجھے اس کے پاس لے چلو۔" شبیر نے نجمی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے ایک بات بتاؤ زمان نے تم سے نکاح نامے پر دستخط کرائے تھے نال تو پھر اس نے ندیم کے ساتھ تمہارا نکاح کیوں نہیں پڑھوایا۔" نجمی نے تلخ لہجے میں کہا۔

"اس لئے کہ نکاح سے پہلے تم مجھے اغواء کر کے یہاں لے آئے ہو۔" شبیر نے کہا "میں زمان ہی کے اشارے پر تمہیں یہاں لایا ہوں مگر میں اکیلا اس جرم میں شامل نہیں ہوں میرے ساتھ زمان بھی اس جرم میں برابر کا شریک ہے جب کہ وہ ہمارا سردار ہے۔ لیڈر ہے اور یہ دیکھو۔"

شبیرے نے جیب سے نکاح نامہ نکال کر نجمی کو دکھایا "یہ دیکھو۔ اس نکاح نامے کے ذریعے تمہارا اور میرا بیاہ بھی کر دیا گیا ہے یہ وہی نکاح نامہ ہے جس پر زمان نے دھوکے سے تمہارے دستخط کروائے تھے شرعی طور پر اب تم میری بیوی ہو گئی ہو۔۔۔"

نجمی غصّے سے پھٹ پڑی۔

"یہ جھوٹا نکاح نامہ ہے میں اس نکاح کو نہیں مانتی یہاں سے نکل جاؤ، نکل جاؤ۔"

اور نجمی چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر زار و قطار رونے لگ پڑی۔ شبیرے نے دروازہ کھول کر باہر دیکھا۔ چوکیدار وہاں نہیں تھا۔ اس نے دروازہ بند کر دیا اور قریب آ کر زمین پر بیٹھ گیا اور بولا۔

"نجمی میں تمہاری مدد کرنے آیا ہوں میں اپنی زندگی داؤ پر لگا رہا ہوں کیونکہ تمہاری مدد کرنے کا مطلب اپنی موت کو آواز دینا ہے لیکن میں تمہیں بچانے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔" نجمی دوپٹے سے آنسو پونچھنے لگی پھر اس نے آنسوؤں بھری آواز میں کہا۔ "تم مجھے گڑھے سے نکال کر کنوئیں میں گرا دو گے آخر تمہیں میری مدد کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

شبیرا بولا۔۔۔ "یہ میں تمہیں بعد میں بتا دوں گا لیکن اس وقت میری بات دھیان سے سنو پرسوں یہ لوگ تمہیں یہاں سے اسمگل کر کے ایک ایسے ملک میں پہنچا دیں گے جہاں۔۔۔ رہ کر بڑی بدقسمتی کی زندگی بسر کرو گی تم وہیں بوڑھی ہو جاؤ گی اور تمہارا کوئی پوچھنے والا نہیں ہوگا تم وہاں سے فرار بھی نہیں ہو سکو گی اگر تم اپنی زندگی کو تباہ ہونے سے بچانا چاہتی ہو تو جیسا میں کہتا ہوں ویسا کرو اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔"

"تم۔۔ تم کیا چاہتے ہو؟" نجمی نے قدرے توقف کے بعد پوچھا نجمی کو تھوڑا بہت رضامند دیکھ کر شبیرے کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اس نے نکاح نامہ تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا تھا وہ کہنے لگا۔

"میں تمہیں یہاں سے نکال کر یہاں سے بہت دور ایک ایسے شہر میں لے چلوں گا جہاں تم آزادی اور سکھ چین سے رہ سکو گی اگرچہ اس نکاح نامہ کی رو سے تم قانونی طور پر میری بیوی ہو مگر میں تمہاری مرضی کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا بولو! کیا تم میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو؟"

نجمی نے سوچا کہ اس شخص کی وساطت سے کم از کم اس قید سے تو چھٹکارا حاصل کرنا چاہیئے یہاں سے نکلنے کے بعد وہ اس جیک رو سے بھی نجات حاصل کرے گی

یہ جس شہر میں بھی اسے لے کر جائے وہاں وہ پولیس کو خبر کر سکے گی شور مچا دے گی لوگوں کو اکٹھا کرے گی اس نے شبیرے سے کہا "میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔" شبیرے کے چیچک کے داغ ایک انوکھی مسرت کے ساتھ پھیل گئے وہ جلدی سے اُٹھ کر دروازے کی طرف گیا۔

○

شبیرا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ اس نے دروازہ بند کر کے تالا لگایا اور برآمدے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس وقت رات کے دو بجنے والے تھے۔ چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ وہ پہرہ دینے کے انداز میں ٹہلتا ہوا چوکیدار کی کوٹھری تک گیا۔ کوٹھری کا دروازہ بند تھا۔ چوکیدار گہری نیند سو رہا تھا اس کی طرف سے تسلی کر لینے کے بعد شبیرا تیز تیز چلتا نجمی کے کمرے میں واپس آ گیا۔

نجمی چارپائی کے کونے میں سر جھکائے بیٹھی گہری سوچ میں گم تھی۔ اسے امید کی ایک کرن دکھائی دی تھی۔ اس شخص کے ذریعے نہ صرف وہ وہاں سے فرار ہو سکتی تھی بلکہ اپنی زندگی کو تباہی کے دلدل میں گرنے سے بچا سکتی تھی۔ شبیرا دروازے کو چٹخنی لگا کر اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

"میں تمہاری خاطر بہت بڑا خطرہ مول لے رہا ہوں۔ اگر زمان کے کانوں میں ذرا سی بھی بھنک پڑ گئی کہ میں نے تمہیں یہاں سے نکال لے جانے کا منصوبہ بنایا ہے تو وہ ایک سیکنڈ ضائع کئے بغیر مجھے مروا دے گا تم سوچ رہی ہو گی کہ آخر میں اپنی زندگی داؤ پر کیوں لگا رہا ہوں۔ اس کی وجہ صاف صاف لفظوں میں یہ ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تمہیں اپنی بیوی بنا کر باقی زندگی شریف لوگوں کی طرح بسر کر دوں۔"

نجمی نے حقارت سے کہا "میں۔ میں تمہاری بیوی نہیں ہوں ہرگز نہیں ہوں۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔"

شبیرے نے کہا۔ "نجمی! تمہیں ابھی اس کا اندازہ نہیں ہے کہ تمہارے ساتھ ابھی کیا ہونے والا ہے۔ زمان تم ایسی کتنی ہی عورتوں کی زندگیاں برباد کر چکا ہے انہیں اغوا کر کے دوسرے ملک میں فروخت کر دیا گیا ہے اور آج تک ان کا کچھ پتہ نہیں چل سکا کہ وہ کس حالت میں ہیں اور کیسی عذاب کی زندگی گزار رہی ہیں۔ تمہیں بھی دوسرے ملک میں بیچ دیا جائے گا۔ سوچ لو کہ وہاں تمہاری حیثیت کیا ہو گی۔ پھر تم پچھتاؤ گی کہ تم نے شبیرے کی بات نہ مان کر کس قدر غلطی کی تھی۔"

نجمی نے سر جھکایا ہوا تھا۔ وہ بہت کچھ سوچ رہی تھی۔ وہ اس شخص کی بیوی بن کر زندگی گزارنے سے موت کو ترجیح دیتی تھی لیکن اس نے سوچا کہ اس وقت یہاں سے فرار ہونا بڑا اہم ہے۔ بعد میں دیکھا جائے گا۔ پھر بھی اس نے شبیرے سے کہا۔ "میں ایک شرط پر تمہارے ساتھ جانے کو تیار ہوں۔"

"وہ شرط کونسی ہے؟ مجھے بتاؤ۔" شبیرے نے سانس بھرتے ہوئے کہا۔

نجمی بولی "شرط یہ ہے کہ تمہیں مجھ سے بیاہ کرنے کے لئے میری مرضی حاصل کرنی ہو گی۔ اس نکاح نامے پر میں نے ندیم سے شادی کرنے کے لئے دستخط کئے تھے۔" شبیرے نے بھی سوچا کہ جب یہ اس کے ساتھ چلنے پر تیار ہو گئی ہے تو شادی پر بھی راضی ہو جائے گی۔ وہ اسے اپنے سے الگ تو ہونے نہیں دے گا۔ آخر اسے اس کے پاس ہی رہنا ہے۔ اس نے کہا۔

"مجھے منظور ہے۔" نجمی نے ایک دم سے ندیم کے بارے میں پوچھا کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟ شبیرے نے ہاتھ جھٹک کر کہا۔

"جو مرد عورت کی حفاظت نہیں کر سکتا وہ بھی کوئی اس قابل ہے کہ تم اسے یاد کرو وہ بزدل تھا تمہارے اغوا کا سُن کر زمان سے کہنے لگا کہ خدا کے لئے پولیس کو خبر نہ کرنا اور کان لپیٹ کر لاہور بھاگ گیا۔"

نجمی نے سوال کیا۔ "کیا ندیم کو معلوم ہو گیا تھا کہ مجھے اس کے دوست زمان نے اغوا کروایا ہے؟"

شبیرے نے کہا۔ "زمان نے ایسا چکر چلایا کہ تمہارے بارے میں یہ مشہور کر دیا کہ تم اپنی مرضی سے کہیں چلی گئی ہو اور خود کو ندیم کے آگے بے قصور اور معصوم ظاہر کر کے پیش کیا تم اس مکار شخص سے واقف نہیں ہو۔ وہ کئی عورتوں کی زندگیاں تباہ کر چکا ہے۔ مگر وہ قانون کے ہاتھ سے بچ نہ سکے گا۔ خیر ان باتوں کو چھوڑو۔ میں جو کہتا ہوں اسے غور سے سنو۔"

پھر شبیرے نے نجمی کو بتایا کہ وہ کل رات اسے وہاں سے نکال کر لے جائے گا۔ آدھی رات کے وقت پہرہ دینے کے بہانے وہاں آئے گا اور اس کو لے کر وہاں سے فرار ہو جائے گا۔ "میں خود تمہارے ساتھ اس گناہ کی دلدل سے فرار ہو جاؤں گا۔ میں اس زندگی سے تنگ آ گیا ہوں۔ تمہاری صورت دیکھی تو میرے دل میں نیکی کا خیال پیدا ہو گیا۔ میں نے تمہیں دیکھتے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ تمہیں تباہی کے غار میں نہیں گرنے دوں گا مجھے چوکیدار کا خطرہ ہے کہ وہ نہ آ جائے۔

اگر اس نے مجھے تم سے باتیں کرتے دیکھ لیا تو فوراً لیڈر زمان کو خبر کر دے گا اور وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد جو باہر جاتا تھا تو چوکیدار کو دیکھنے ہی جاتا تھا کہ اپنی کوٹھڑی میں سو رہا ہے؟ ایک بات کا خاص خیال رکھنا میرے اور تمہارے درمیان جو باتیں ہوئی ہیں اس کا کسی تیسرے کو علم نہیں ہونا چاہیئے تم میری بات کو سمجھ رہی ہو نا؟"

نجمی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ شبیرا مسکرایا۔ شاباش! تم بڑی اعلیٰ ضمیر کی لڑکی ہو تم نے سچ مچ میری زندگی بدل کر رکھ دی ہے۔ ورنہ میں جانے کب تک گناہ کی اس دلدل میں پھنسا رہتا۔ اچھا اب میں جاتا ہوں۔ کل میری پہرے کی ڈیوٹی بھی ہے۔ مگر میں تمہارے پاس اس وقت آؤں گا جب چوکیدار سو گیا ہو گا۔"

اتنا کہہ کر شبیرا جلدی سے باہر نکل گیا۔ باہر آتے ہی اس نے دروازہ بند کر کے تالا لگایا اور برآمدے سے اتر کر سامنے چل پھر کر پہرہ دینے لگا۔ وہ اپنے ذہن میں بہت سی باتیں سوچ رہا تھا۔ کل یہاں آنے سے پہلے اسے کتنے ہی ضروری

کام کرنے تھے اپنے بہت سے رازدار دوستوں سے ان کی خفیہ جگہوں پر جا کر ملنا تھا شبیرے کو یقین تھا کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اسے بڑی خوشی ہو رہی تھی کہ ایک انتہائی حسین لڑکی اس کی بیوی بننے والی تھی اس نے دل میں سوچ لیا تھا کہ وہ ایک بار نجمی کو لے کر نکل گیا تو پھر دنیا کی کوئی طاقت نجمی کو اس سے الگ نہیں کر سکے گی۔ نجمی اگر خود بھی چاہے گی تو شبیرے کو نہ چھوڑ سکے گی۔ دوسری بار نکاح پڑھوانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نکاح نامے کے ذریعے نجمی اس کی بیوی بن چکی تھی۔

شبیرے نے سر کو ہلکا سا جھٹک کر خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ اس گروہ کی زندگی سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا حاصل کر لے گا اور اپنی خوبصورت بیوی کے ساتھ نئے شہر میں نئی جگہ پر نئی زندگی شروع کر سکے گا۔ وہ برآمدے میں سیڑھیوں میں بیٹھ گیا۔ جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور اس کے کش لگاتے ہوئے کل اپنے پراسرار دوستوں سے ملنے کے بارے میں غور کرنے لگا۔

چند قدموں کے فاصلے پر کمرے کے اندر نجمی بھی جاگ رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کل رات وہ اس جہنم سے نکل جائے گی۔ ندیم کے بارے میں شبیرے نے اسے جو کچھ بتایا تھا اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ زمان کے دوست کش کردار کے بارے میں اسے یقین آ گیا تھا۔ مگر ندیم اسے چھوڑ کر بھاگ گیا ہو گا اس پر یقین کرنے کو اس کا دل نہیں مانتا تھا۔ ندیم ضرور ابھی تک کراچی میں ہی ہو گا اور اس کی تلاش میں پولیس کے ساتھ سرگرداں ہو گا۔

وہ یہاں سے نکلتے ہی شبیرے کے چنگل سے بھی نکل بھاگے گی اور کسی نہ کسی طرح ندیم تک پہنچ جائے گی وہ پڑھی لکھی لڑکی ہے کسی کوٹھی میں گھس کر وہاں کے لوگوں کو اپنا حال زار بتا کر ان سے تعاون کی درخواست کرے گی وہ وہاں سے انسپکٹر جنرل پولیس کو فون کر دے گی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس کے بارے میں پولیس کو خبر تک نہیں کی گئی۔ ندیم کو ایسا کرنا چاہیئے تھا مگر اس نے بھی ڈر کے مارے اور اپنی گرفتاری کے خوف سے ایسا نہیں کیا۔ بہرحال ایک بات کا اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔

کہ وہ کل رات شیرے کے ساتھ وہاں سے فرار ہوجائے گی اور اس کے بعد اس کی پہلی کوشش یہ ہوگی کہ ذرا سا موقع ملتے ہی وہ شیرے کے جال سے بھی نکل بھاگے

باہر شیرا اٹھ کر ٹہلنے لگا تھا۔ رات کے دو بجکر پندرہ منٹ ہوگئے تھے۔ شیرے نے اپنی کلائی کی گھڑی کو آستین سے رگڑ کر صاف کیا اور ایک اور سگریٹ سلگا لیا جب چار بجے تو پو پھوٹ رہی تھی مشرق کی جانب افق پر نیلی روشنی کا غبار پھیلنے لگا تھا۔ شیرا اب واپس اپنی بیٹھک پر جاکر سوجانا چاہتا تھا تاکہ وہ بارہ بجے دن تک پوری نیند کرلے اور پھر اپنا کام شروع کردے اس نے چوکیدار کو جاکر جگایا اور کہا۔ "چل بھئی صبح ہوگئی ہے اب تو ڈیوٹی سنبھال میں جارہا ہوں۔"

چوکیدار آنکھیں ملتا کوٹھری سے باہر نکل آیا۔ "شیرے بھائی ابھی تو دن نہیں نکلا" شیرے نے اسے جھڑک کر کہا۔

"تیرا دن کب نکلنا ہے؟ دیکھ کتنی روشنی ہوگئی ہے۔ سن اس عورت کو ناشتہ کرا دینا اور اچھی طرح خبر گیری کرنا۔ وہ بھاگ گئی تو تیری خیر نہیں۔"

چوکیدار نے جمائی لے کر کہا۔ "پہلے یہاں سے کبھی کوئی بھاگی ہے کیا؟ تم بے فکر ہوکر جاؤ اور آرام کرو۔" شیرے نے جیپ باہر نکالی اور اپنی بیٹھک کی طرف روانہ ہوگیا۔ سارا راستہ وہ اپنے پروگرام پر غور کرتا رہا۔

اس کا پروگرام بڑا خطرناک تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ساری رات جاگتے رہنے کے باوجود شیرے کی نیند غائب تھی اور اپنے منصوبے کے ایک ایک پہلو پر سوچ بچار کر رہا تھا۔ اس کے دوست اس کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ یہ سارے لوگ ناجائز کاروبار میں ملوث تھے۔ وہ بدمعاش قسم کے لوگ تھے مگر ان کی دوستیاں بڑی پکی تھیں۔ وہ اپنی بات کے دھنی تھے اور دوستوں کی خاطر جان قربان کرنے پر بھی تیار ہوجاتے تھے شیرے نے کافی سوچنے کے بعد ان میں سے ایک دوست ماکھن کا انتخاب کرلیا تھا۔ ماکھن شیرے کا پرانا دوست تھا۔ کئی باتوں میں اس کا رازدار بھی تھا بڑا دلیر نڈر اور دوستوں کا دوست، یاروں کا یار تھا۔

شیرا اس پر بھرپور اعتماد کرسکتا تھا اور ماکھن ہی واحد آدمی تھا جو اس مصیبت میں شیرے کے کام آسکتا تھا۔ جیپ کراچی شہر کی سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔ شہر صبح کی روشنی کے ساتھ بیدار ہو رہا تھا۔ شیرا شہر کی مختلف سڑکوں پر سے ہوتا ہوا ایک گنجان آبادی میں آگیا۔ یہاں اس کا مکان تھا جہاں وہ اکیلا رہتا تھا۔ اس کے اکیلا رہنے پر کسی کو اس لئے اعتراض نہیں تھا کہ شیرا محلے میں بے حد شریف بن کر رہتا تھا۔ صبح گھر سے نکلتا اور کہیں رات کو یا رات گئے واپس آتا تھا۔ ہر ایک سے جھک کر بڑے اخلاق سے ملتا تھا۔

جیپ گلی میں کھڑی کرکے وہ اپنی بیٹھک میں آکر چارپائی پر پڑ گیا پھر ایسا سویا کہ جب آنکھ کھلی تو دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ اٹھ کر جلدی جلدی منہ ہاتھ دھویا محلے کے ریستوران میں جاکر ناشتہ کیا اور پھر مکان کو تالا لگا کر جیپ میں سوار ہوکر سیدھا زمان کے ہوٹل میں آگیا۔

زمان کاؤنٹر پر بیٹھا رجسٹر میں کچھ لکھ رہا تھا۔ شیرا خاموشی سے کرسی کھینچ کر قریب بیٹھ گیا اور نوکر سے چائے لانے کو کہا۔ زمان اپنے کام میں لگا رہا۔ پھر رجسٹر کو بند کرکے دراز میں رکھتے ہوئے بولا۔

"مال کی کیا پوزیشن ہے" شیرے نے زمان کی طرف دیکھے بغیر کہا "ٹھیک ہے استاد بالکل ٹھیک ہے۔ صبح ناشتہ بھی کرا دیا تھا۔" زمان نے ایک جگہ فون کیا اور آہستہ آہستہ بات کرنے لگا۔ شیرے کو معلوم تھا کہ زمان کہاں فون کر رہا ہے۔ زمان دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا۔

"کل کی بجائے اگر آج رات ہی لانچ کا انتظام ہوجائے تو اچھا ہے۔" شیرا جیسے سناٹے میں آگیا۔ اگر لانچ کا آج رات انتظام ہوگیا تو اس کا سارا پروگرام تہس نہس ہو جائے گا وہ کرسی پر بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔ پھر انگلیاں چٹخانی شروع کردیں۔ نوکر چائے کا کپ لے آیا۔ شیرے نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ نوکر نے اس کے پاس ہی کاؤنٹر پر کپ رکھا اور چلا گیا ہوٹل میں کھانے کا وقت ہو رہا تھا اس لئے

وفی مدد وقت تھی شیرا زمان کو روک بھی نہیں سکتا تھا وہ مالک تھا لیڈر تھا۔ سارا دھندا بھی اس کا تھا۔ شیرے و ٹونا وغیرہ ٹونی کو تو ہر ماہ تنخواہ کے عوض کچھ رقم مل جاتی تھی۔ زمان فون پر کہہ رہا تھا۔ "بیا ہا! آج رات بندوبست نہیں ہو سکتا؟" تو پھر ٹھیک ہے کل رات ہی سہی مگر لانچ کو وقت پر وہاں موجود ہونا چاہیئے پولیس کی نظروں سے بچنا بڑا مشکل کام ہے لیکن تم پروا نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔" شیرے کی جان میں جان آ گئی اس کا منصوبہ تباہ ہوتے ہوتے بچ گیا تھا۔

اب اس نے کاؤنٹر پر سے کپ اٹھایا اور آہستہ آہستہ چائے کے گھونٹ نگلنے لگا۔ اس نے ساتھ ہی سگریٹ بھی سلگا لیا۔ وہ خوش تھا کہ اس کے سر سے ایک بہت بڑی بلا ٹل گئی تھی۔ زمان نے ٹیلی فون بند کر دیا اور شیرے سے کہنے لگا "آج رات ہی مال کو ڈسپوز کر دیا جاتا تو اچھا تھا مگر ان لوگوں کے بھی اپنے اوقات ہوتے ہیں ایجنٹ نہیں مانا۔"

پھر کاؤنٹر پر شیرے کی طرف ذرا آگے کو جھک کر بولا۔ "پچاس ہزار پر سودا طے ہوا ہے۔ بس تھوڑی دیر میں ان کا آدمی آ کر دے جائے گا باقی کی رقم تم مال کو لانچ میں سوار کرانے سے پہلے وصول کر لینا۔ وہ مال کو دیکھ کر باقی کی رقم ادا کرنا چاہتے ہیں۔ کوئی بات نہیں دیکھیں گے تو بڑے خوش ہوں گے۔ ارے وہ تو بچی کے دو لاکھ سے کم وصول نہیں کریں گے اس بار بھی مال لے کر تم ہی جاؤ گے۔"

شیرے نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے کہا "کوئی بات نہیں لیڈر تمہارے لئے تو اپنی جان بھی حاضر ہے۔" زمان نے شیرے کی طرف گھور کر دیکھا اور کہا "کیا بات ہے زیادہ وفاداری کیوں جتا رہے ہو؟" شیرے کے حلق میں جیسے پھانس سی اٹک گئی جلدی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

"بس استاد! کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ تیرے لئے میرے دل میں جو محبت ہے اسے بیان کروں۔ تمہارے ہم پر احسان بھی تو بہت ہیں ورنہ اس وقت ہم جیل کی ہوا کھا رہے ہوتے۔" زمان نے دراز میں سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور بولا۔

"پیارے ہم تو اصول کے آدمی ہیں جب تک ہمارا آدمی اصول کے مطابق کام کرتا رہے گا ہم بھی اس پر اپنی جان چھڑکیں گے۔ اصول کے خلاف چلا تو پھر اس کی جان کی خیر نہیں۔" ٹیلی فون کی گھنٹی بول پڑی۔ زمان نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا پھر آواز کو ایک دم فکرمند بناتے ہوئے بولا۔

"ندیم بھائی تم ہو؟ ہاں ہاں۔ میں سمجھ گیا۔ کیا؟ وہ لاہور میں بھی نہیں ہے؟ میرے خدا۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو پھر وہ شخص کہاں چلا گیا؟ ندیم! میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ میں تمہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں رہا۔ نہیں نہیں تم چاہے کچھ کہو مگر میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ میں تو اب بھی تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ تمہیں پولیس کو خبر کر دینی۔۔۔۔ کیا؟ ہوں۔ ہوں اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ویسے میرے آدمی صبح سے شام تک اسے ڈھونڈتے میں لگے ہوئے ہیں۔ شہر کا کوئی ایسا کونہ نہیں جو انہوں نے نہ چھان مارا ہو۔ اب میں کچھ لوگوں کو حیدر آباد دوڑا رہا ہوں۔

نہیں نہیں ندیم بھائی۔ یہ تو میرا فرض ہے آخر مجھے بھی ایک روز قبر میں جانا ہے میں خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا۔۔۔ ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں تمہیں فون نہیں کر دوں گا۔ تم ہی کال کر کے پتہ کر لینا۔ خدا حافظ۔" زمان نے ریسیور رکھتے ہوئے شیرے کی طرف آنکھیں سکیڑ کر دیکھا۔ شیرے نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔ زمان بولا۔

"تم سمجھ گئے ہو گے ایسا احمق لڑکا بھی میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ ویسے ہمیں بیٹھے بٹھائے عمدہ مال ہاتھ لگ گیا۔ ٹونی کو میں نے بیرک پر پہرہ دینے کے لئے بھیج دیا ہے۔ رات کو کون جائے گا وہاں۔ شیرے نے ایک لمحے توقف کے بغیر کہا۔

"میں ہی جاؤں گا رات کی ڈیوٹی سے سب ہی کتراتے ہیں۔" اس پر زمان نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"اگر یہ بات ہے تو پھر آج رات میں خود پہرہ دوں گا۔" شیرے کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اس نے تو ویسے ہی یہ بات کہہ دی تھی فوراً بولا۔

"نہیں استاد تمہیں تکلیف اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔ آخر ہم کس لئے ہیں۔ میں

ہی یہ ڈیوٹی دوں گا۔" زمان نے مزید فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"اس میں تکلیف کی کونسی بات ہے؟ یہ تو تمہارا فرض ہے کیا میں تمہیں تنخواہ کے علاوہ سودے میں سے کمیشن نہیں دیتا؟ جتنی میں تم لوگوں کو کمیشن دیتا ہوں کوئی اور دے سکتا ہے؟" شیرا تو منہ سے بات نکال کر پھنس گیا تھا کہنے لگا۔

"تم تو ناراض ہو گئے استاد۔ ایسی بات نہیں ہے۔ میں نے ویسے ہی بات کی تھی۔ میں خوشی سے رات کو پہرہ دوں گا۔" زمان نے ایک دم شیرے کو ڈانٹ دیا۔ "بس بس۔ میں تم سب کو جانتا ہوں تم سب ہڈ حرام ہو گئے ہو۔ اب سارے کام میں خود ہی کیا کروں گا۔ آج رات بیرک پر میں خود پہرہ دوں گا۔" یہ کہہ کر زمان اٹھ کر ہوٹل کے اندر چلا گیا۔

شیرے کو کئی قسم کی پریشانیوں نے گھیر لیا۔ زمان نے اس کا سارا پروگرام الٹ پلٹ کر کے رکھ دیا تھا کسی نے سچ کہا ہے کہ انسان کو فالتو بات زبان سے نہیں نکالنی چاہیئے۔ شیرا اپنے آپ کو کوسنے لگا کہ اسے کیا ضرورت تھی ایسی بات کہنے کی۔ مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ زمان کی طبیعت سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ اب اسے دنیا کی کوئی طاقت رات کو پہرہ دینے سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ شیرا بھی اس کا شاگرد تھا۔

وہ بھی نجمی کو اس رات بیرک سے نکال کر لے جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔ یہ اس کی زندگی کا سب ۔ ۔ اہم موڑ تھا۔ وہ ایک زندگی کو چھوڑ کر دوسری نئی زندگی شروع کرنے والا تھا۔ نجمی ۔یسی لڑکی اسے دوبارہ کبھی نہیں مل سکتی تھی۔ دنیا میں کسی نجمی کا باپ نجمی اس کے حوالے کرنے کو تیار نہیں ہو سکتا تھا۔ کسی نجمی کا باپ یہ یقین کرنے کو تیار نہیں ہو سکتا تھا کہ شیرا اس کی بیٹی سے شادی کے بعد شریفانہ زندگی شروع کر دے گا۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ شیرا اس سنہری موقع کو ہاتھ سے جانے دیتا؟

زمان کے جانے کے بعد وہ سگریٹ پھینکتا ہوا اٹھا اور ہوٹل سے نکل کر باہر

اپنی جیپ کے پاس آگیا۔ اس نے اپنے منصوبے پر اسی طرح عمل شروع کر دیا جیسا کہ اس نے سوچ رکھا تھا۔ شیرے نے جیپ کا رُخ اپنے جگری دوست ماکھن کے ڈیرے کی طرف موڑ دیا دن کے بارہ بجنے والے تھے۔ شیرے کی جیپ ہائی وے پر آتے ہی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

شیرے کے ذہن نے ہائی وے پر آتے آتے اسے ایک ایسی ترکیب عطا کر دی تھی کہ جس پر عمل کرنے سے سانپ بھی مر جاتا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹتی تھی۔ شیرا اپنے لیڈر زمان کو ہلاک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جو گڑ کھانے سے مر جائے اسے زہر دینے کی ضرورت نہیں تھی ترکیب اچھی تھی اس پر عمل کیا جا سکتا تھا۔ ہاں اگر یہ ترکیب کسی وجہ سے فیل ہو جاتی ہے تو شیرے نے سوچ رکھا تھا کہ وہ اپنی نئی زندگی کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے والے کے قتل سے بھی گریز نہیں کرے گا۔

ماکھن کے ڈیرے پر وہ ڈیڑھ گھنٹے کے بعد پہنچا۔ ماکھن نے اٹھ کر شیرے کو گلے لگایا۔ اس کی بانہہ میں بانہہ ڈال کر اندر لے گیا اپنے آدمیوں کو کھانا لانے کا حکم دیا۔ دونوں دوستوں نے کھانا کھایا پھر ماکھن نے شیرے سے پوچھا۔

"اب بتا سائیں کیسے تکلیف کی میرے ڈیرے پر آنے کی۔" شیرے نے ماکھن کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا اور کہا کہ یہ اس کی زندگی کا آخری سنہری موقع ہے اس کے بعد شاید ایسا موقع پھر کبھی نہیں آئے گا۔ ماکھن نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ سائیں موقع تو زندگانی میں آتے ہی رہتے ہیں ہاں اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو میں تمہاری خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ تم جیسے کہو گے ویسے ہی ہو گا۔ شیرے نے ماکھن کا ہاتھ شدت جذبات سے تھام لیا اور بولا۔

"ماکھن سائیں! میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔" ماکھن نے کہا۔ "کیسی بات کرتے ہو شیرے۔ ارے تم ہمارے دوست ہو اور دوست کے لئے تو ہماری جان بھی حاضر ہے۔ یہ تو کوئی بات ہی نہیں ہے یہ کام تو ہم پیسے لے کر ایرے غیرے کے لئے کر دیتے ہیں تمہارے لئے نہیں کریں گے بھلا؟ تم ایسا

کرنا کہ رات کو اپنی عورت کو لے کر میرے ڈیرے پر آجانا۔ میں تمہیں اسی جگہ ملوں گا مگر تمہاری یہ عورت شور وغیرہ تو نہیں مچائے گی نا؟"

"ارے نہیں ماکھن سائیں۔" شیرے نے کہا۔

"وہ تو میرے ساتھ چلنے کو بالکل تیار ہے۔ یہ دیکھو ہماری تو شادی بھی ہو چکی ہے۔" اور شیرے نے ماکھن کو نکاح نامہ نکال کر دکھایا۔ ماکھن بولا۔

"مجھے تمہاری زبان پر اعتبار ہے سائیں۔ مگر تم کہہ رہے تھے نا کہ یہ نکاح عورت کی مرضی کے بغیر ہوا ہے۔" شیرے نے فوراً کہا۔

"مگر اب وہ میرے ساتھ چلنے پر راضی ہے۔ ماکھن نے ہنس کر کہا۔

"راضی ہے تو پھر جھگڑا کس بات کا ہے تم فکر نہ کرو بس اسے لے کر رات کو یہاں آجاؤ۔ میں خود تمہیں ساتھ لے کر چلوں گا۔" شیرے نے کان میں دیا سلائی چلاتے ہوئے کہا۔

"آگے دینے کے لئے کتنے روپوں کی ضرورت ہو گی؟" ماکھن نے شیرے کے کاندھے کو ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہوش کرو سائیں شیرے ہوش کرو۔ تم اپنے یار ماکھن کے ساتھ جا رہے ہو۔ تم سے کون مائی کا لال پیسہ لے گا تم اپنے لئے جتنی چاہے رقم لے آنا میرے لئے کسی پیسے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" شیرا چار بجے تک ماکھن کے پاس ہی رہا۔ اس نے اس دوران ساری تفصیلات طے کر لیں اور پھر دونوں دوست بغلگیر ہو کر ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ شیرا جیپ میں بیٹھ کر واپس شہر کی طرف چل پڑا۔ اب اسے اپنی دوسری اسکیم پر عمل کرنے کی تیاریاں شروع کرنی تھیں۔

وہ سیدھا ہوٹل میں آ گیا۔ ہوٹل میں زمان نے شیرے وکی اور لڈی کو ایک کمرہ دے رکھا تھا جہاں وہ ضرورت کے وقت رات کو بھی سو جاتے تھے اور دن کے وقت بھی موجود رہتے تھے۔ اس کی ایک ایک چابی تینوں کے پاس رہتی تھی۔ زمان کاؤنٹر پر نہیں تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ کھانا کھانے کے بعد اپنے کمرے میں آرام

کر رہا ہے۔ یہ ہوٹل اصل میں زمان ہی کی ملکیت تھی لیکن اس نے یہ مشہور کر رکھا تھا کہ ہوٹل کا مالک اس کا ایک دوست ہے جو دبئی میں رہتا ہے اور وہ اس کا منیجر ہے۔

شیرا تیسری منزل پر واقع اپنے مشترکہ کمرے میں آ گیا۔ اس کمرے میں شیرے کا ایک ٹرنک پڑا تھا جس میں وہ اپنی ضرورت کی چیزیں رکھا کرتا تھا۔ اس نے جیب سے چابی نکال کر ٹرنک کا تالا کھولا اور اس میں سے ایک کیپسول ڈبی میں سے نکال کر ہتھیلی پر رکھا اور مسکرانے لگا۔ پھر اس نے کیپسول کو کھول کر اس کا زرد رنگ کا سفوف کاغذ پر ڈال دیا اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔ ایسے ہی ایک کیپسول کا آدھے سے بھی کم سفوف شیرے نے نجمی کی چائے کی پیالی میں ڈالا تھا جس کے دو گھونٹ پینے کے بعد وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی تھی۔

شیرے نے سفوف کو دوبارہ کیپسول میں بند کر دیا اس کو اپنی جیکٹ کی اندر والی جیب میں سنبھال کر رکھا اور ٹرنک کو تالا لگا کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ وہ اس منظر کو اپنی آنکھوں کے سامنے لے آیا جو آج رات خفیہ کمین گاہ والی بیرک میں پیش آنے والا تھا۔ شیرے نے بھرا ہوا پستول بھی اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔ اسے پہلے بے ہوشی کا زرد اثر سفوف اور اگر ضرورت پڑی تو پھر پستول کو استعمال کرنا تھا۔ صرف ایک بات کی اسے الجھن سی لگی تھی کہ کہیں نجمی نے اپنا ارادہ تبدیل نہ کر دیا ہو۔

پھر وہ سوچنے لگا کہ یہ لڑکی زنجیر سے بندھی قید میں پڑی ہے اسے معلوم ہے کہ وہ بردہ فروشوں کے ہاتھوں بکنے والی ہے پھر وہ کیسے شیرے کے ساتھ جانے کا ارادہ بدل لے گی! پھر بھی شیرا کچھ دیر پہلے نجمی سے مل لینا چاہتا تھا مگر صورتحال ایسی پیدا ہو گئی تھی کہ اب وہ عین وقت پر ہی اس کے پاس جا سکتا تھا اسی ادھیڑبن میں وقت گزرتا گیا۔

شیرے کو نیند بالکل نہیں آ رہی تھی۔ باہر دن ڈھلنے لگا تو شیرے نے [illegible] غسل کیا اپنے ٹرنک میں پڑی تمام چیزوں کا جائزہ لیا۔ اس میں سے اس نے [illegible] ایک کنگھی اٹھا کر اپنی جیب میں رکھی اور ٹرنک کو تالا لگا دیا۔ پھر اپنی جیب [illegible]

جیبوں کو چیک کیا۔ بھرا ہوا پستول اور کیپسول موجود تھا۔ اس کے بٹوے میں صرف سوا سو روپے تھے۔ اسے مزید روپوں کی ضرورت تھی جس کے لئے اسے کراچی ہی میں اپنے ایک اور بزرگ دوست کے پاس جانا تھا کمرے کو تالا لگا کر شیرا جیپ میں بیٹھا اور اپنے بزرگ دوست کی دکان کی طرف چل پڑا۔ اس بزرگ دوست کی، عینکوں کی دکان تھی۔ شیرا اس کے پاس پیسے رکھوا دیا کرتا تھا۔ اس کے پاس شیرے کی چھ ہزار روپے کی رقم جمع تھی۔ وہ اس نے اپنے دوست سے لے کر رومال میں باندھ کر جیب میں رکھی اور واپس ہوٹل میں ہی آ گیا۔

شام ہو رہی تھی۔ زمان ابھی تک اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا۔ شیرے کو بے چینی لگی تھی آج کی رات اس کی زندگی کی بڑی اہم رات تھی۔ اس رات نے شیرے کی زندگی کا پلٹ کر رکھ دینی تھی۔ وہ پچھتا بھی رہا تھا کہ اس نے منہ سے ایسی بات کیوں نکالی کہ جس کے جواب میں زمان کو خود رات کی ڈیوٹی دینے کے لئے تیار ہونا پڑا شیرا ہوٹل کے کاؤنٹر کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ اگرچہ یہ ہوٹل ناموزوں جگہ پر تھا پھر بھی یہاں مسافر آتے جاتے رہتے تھے۔ اس وقت بھی ایک مسافر اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ شیرے کو پتہ تھا کہ زمان رات کے نو بجے سے پہلے خفیہ بیرک میں پہرہ دینے کے لئے نہیں جائے گا۔ وہ چائے کا کپ منگوا کر پینے لگا۔

جب رات ہو گئی تو زمان سیڑھیوں پر نظر آیا۔ اس نے نیلی جین اور اسی رنگ کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ وہ رات کی ڈیوٹی دینے کے لئے تیار ہو کر آیا تھا۔ شیرے نے ایک بار پھر اپنی قسمت آزمانی چاہی۔ زمان کاؤنٹر پر آ کر بیٹھا تو شیرے نے ہنس کر کہا۔

"استاد کیا تم واقعی رات کی ڈیوٹی دو گے؟ میں تو یونہی مذاق کر رہا تھا۔"

زمان نے سگریٹ کیس میں سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور بولا۔

"میرا تمہارا مذاق بالکل نہیں ہے شیرے تم میرے ماتحت ہو اور میں تمہارا

باس ہوں۔ ٹھیک ہے نا؟"

"ٹھیک ہے باس۔" شیرے نے فوراً جواب دیا "تو پھر کان کھول کر سن لو۔ آج اور آج کے بعد تم بیرک پر کبھی رات کی ڈیوٹی نہیں دو گے۔"

شیرے نے دل میں کہا۔ پیارے آج کے بعد ایسا وقت کبھی نہیں آئے گا۔ تم خوش قسمت ہو کہ میں نے صرف تمہیں بے ہوش کرنے کا ہی فیصلہ کیا ہے ورنہ یہ تمہاری آخری شام ہوتی۔ یہ شیرے کے دل کے خیالات تھے۔ اس نے اوپر سے کہا۔

"ٹھیک ہے باس۔ جیسا تم کہو گے ویسا ہی ہو گا۔" رات پورے نو بجے زمان اپنی جیپ میں بیٹھ کر اس خفیہ بیرک کی طرف روانہ ہو گیا جہاں نجمی قید تھی۔ شیرا برابر اس کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس نے زمان کو اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے جیپ میں بیٹھ کر جاتے دیکھ لیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد شیرا نیچے اتر آیا۔

اس نے کھانا منگوا کر کھایا پھر سگریٹ کے دو نئے پیکٹ منگوا کر جیبوں میں رکھ لئے اسے معلوم تھا کہ اسے کیسا سفر درپیش ہے اور کہاں سے کہاں تک اسے سگریٹ تو کیا شاید پانی بھی نہیں ملے گی۔ جوں جوں رات گہری ہوتی جا رہی تھی اس کی بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ دس بجے ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ پہلے اس نے سوچا کہ کسی سینما ہال میں جا کر بیٹھ جائے اور گیارہ بجے تک فلم دیکھتا رہے۔ لیکن پھر اس نے کراچی کی سڑکوں پر چکر لگانے کا فیصلہ کیا اور جیپ نکال کر سڑک پر آ گیا۔ گیارہ بجے تک وہ کراچی کی جگمگاتی سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا رہا۔ ساڑھے گیارہ بجے اس نے ایک پٹرول پمپ سے جیپ کی ٹینکی پٹرول سے فل کرائی اور جیپ کو خفیہ کمین گاہ کو جانے والی سڑک پر ڈال دیا۔

ٹھیک اس وقت لاہور کی ایک تنگ و تاریک گلی کے مکان کی نشست میں ندیم پلنگ پر لیٹا جاگ رہا تھا۔ لاہور میں ہلکی ہلکی سردی شروع ہو گئی تھی۔ وہ نجمی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اسے نیند آنی بھی نہیں چاہیئے تھی۔ وہ اپنی محبت کی آبرو کا تحفظ نہ کر سکا تھا اور آبرو کے بغیر محبت ایک لاش ہے

جسے بہت جلد خاک میں مل جانا ہوتا ہے۔ ندیم ٹکٹکی باندھے چھت کو تک رہا تھا۔ اسی شہر کے مضافات میں نہر کے کنارے ایک خوشنما قدیم وضع کی کوٹھی "کینال لاج" کی ایک خواب گاہ میں شبانہ اپنے پلنگ سے ٹیک لگائے بیٹھی کھڑکی میں سے باہر سفیدے کے درختوں کو دیکھ رہی تھی جن کے اندھیری رات میں اسے خاکے ہی دکھائی دے رہے تھے۔

وہ نجمی کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ بہاول پور جانے کے بعد اس نے ابھی تک اسے کوئی خط نہیں لکھا تھا۔ کوئی فون بھی نہیں کیا تھا۔ شبانہ کو یہ سارا معاملہ پراسرار لگ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی زندگی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ راحیل سے ملے اسے کتنے ہی دن گزر گئے تھے۔ اس کے خوابوں کا فلائنگ ڈچ مین غروب ہوتے سورج کے ساتھ ہی ان دیکھی دنیاؤں میں چلا جاتا تھا۔ پھر سورج کئی بار طلوع ہوتا مگر راحیل کا چہرہ نظر نہیں آتا تھا۔

شبانہ کا چھوٹا بھائی عامر امریکہ میں تھا۔ شبانہ کے منگیتر ظفر نے اسے مزید تعلیم کے لئے سان فرانسسکو کے کسی کالج میں داخل کرا دیا تھا۔ ظفر کے احسانات اس فیملی پر بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ شبانہ کو محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے اردگرد مکڑی کا جالا بنا جا رہا ہے اور بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب وہ اس جالے میں اس طرح الجھ جائے گی کہ اس سے نجات حاصل کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ بڑی بہن غزالہ اور شفیق ماں اب اس کے پاس نہیں تھیں بڑے بھائی عقیل کی بیوی ایک سیدھی سادی لاہور کی عورت تھی جو شبانہ کے جذباتی مسائل کو سمجھنے سے قاصر تھی۔

عقیل والد صاحب کے ساتھ ٹھیکیداری کے جھمیلوں میں سارا دن الجھا رہتا تھا۔ شبانہ یونیورسٹی سے واپس آتی تو سوائے کتابوں میں غرق ہو جانے کے اس کے پاس دوسرا کوئی چارہ کار نہیں ہوتا تھا۔ پہلے وہ نجمی کے ساتھ شام کا وقت گزار لیتی تھی۔ اب وہ بھی لاہور میں نہیں تھی۔ شبانہ نے سوچا کہ وہ کل نجمی کے گھر جا کر اس کا بہاولپور والا ایڈریس لائے گی تاکہ اسے خط لکھ سکے۔ نہر کنارے ایک کار گزر گئی۔ شبانہ

دور تک اس کی آواز سنتی رہی۔ پھر اس نے پلنگ کے پاس ہی تپائی پر رکھے ہوئے ٹیپ ریکارڈر کا بٹن دبا دیا۔ خواب گاہ میں شیخ غلام فرید کی کافی کے بول ابھرے۔

کدی ساتول موڑ مہاراں

شبانہ کا ساتول کون تھا؟ کیا کبھی وہ اپنی ڈاچی کی مہار موڑ کر اس کے گھر آئے گا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ شبانہ رو رو کر عمر گزار دے گی؟

وے میں رو رو عمر گزاراں
ساتول موڑ مہاراں

کراچی کی جگمگاتی روشنیاں بہت پیچھے رہ گئی تھیں۔ شیرے کی جیپ ہائی وے پر بھاگی جا رہی تھی نجمی کے ساتھ شادی کا نکاح نامہ، سگریٹ، بھرا ہوا پستول، تقریباً چھ ہزار روپے اور بے ہوشی کا سفوف یہ تمام چیزیں شیرے کی کھدر کی صدری میں تھیں جو اس نے قمیض کے نیچے پہن رکھی تھی۔ راستے میں سگریٹ اور پستول اس نے نکال کر اپنی قمیض کے اوپر پہنی ہوئی واسکٹ کی جیبوں میں رکھ لئے۔ اگرچہ نکاح نامے پر دھوکے سے نجمی کے دستخط کروائے گئے تھے مگر شیرا نجمی کے ساتھ ایک نئی اور شریفانہ زندگی شروع کرنا چاہتا تھا۔

شیرے کے باس اور عیار بردہ فروش اسمگلر زمان نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت نجمی کا بیاہ شیرے سے کرایا تھا بیاہ کیا کرایا تھا۔ دھوکے سے نجمی کے دستخط نکاح نامے پر کروا لئے اور پھر معمول کے مطابق شیرے نے بھی نکاح نامے پر دستخط کر دیئے تھے یہ محض پیش بندی کے لئے تھا کہ نجمی کو بیرون ملک فروخت کر دینے کے بعد اگر معاملہ گڑبڑ ہو گیا اور قانونی صورتحال پیدا ہو گئی تو نجمی کو شیرے کی بیوی ثابت کیا جا سکے لیکن شیرے نے اس بار فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس گناہ اور بدمعاشی کی زندگی سے توبہ کر کے اسی عورت کے ساتھ شرافت اور نیکی سے زندگی بسر کرے گا جس کے ساتھ اس کا نکاح ہو چکا ہے۔

شیرے نے نجمی کے سامنے اپنے دل کا حال کھول کر بیان کر دیا تھا۔ نجمی لاہور

کے متوسط گھرانے کی پڑھی لکھی خوبصورت لڑکی تھی۔ وہ اپنے بزدل محبوب ندیم کی باتوں میں آ کر گھر سے بھاگنے کا ایک غلط اور خطرناک قدم اٹھا کر مصیبتوں کے گرداب میں پھنس چکی تھی اب وہ کسی نہ کسی طرح وہاں سے نکل کر واپس اپنے گھر فرار ہونا چاہتی تھی۔ جب شیرے نے اسے بتایا کہ زمان اسے دوسرے ملک میں فروخت کرنے والا ہے جہاں وہ ایک موم بتی کی طرح پگھل پگھل کر مر جائے گی اور کوئی اس کی خبر لینے والا نہیں ہوگا اور اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ اب جبکہ ان دونوں کا نکاح بھی ہو چکا ہے تو وہ اس کے ساتھ شریفانہ زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو نجمی نے حامی بھر لی۔

وہ شیرے کے ساتھ کسی طور بھی زندگی بسر نہیں کر سکتی تھی مگر شیرے کی شکل میں اسے وہاں سے فرار کا موقع مل رہا تھا اس نے دل میں یہی سوچ رکھا تھا کہ شیرا جب اسے زمان کے خونی پنجے سے نکال کر کسی دوسری جگہ لے جائے گا تو وہ وہاں سے کسی نہ کسی طرح بھاگ کر لاہور اپنے ماں باپ کے پاس پہنچ جائے گی۔

شیرے کی جیپ ہائی وے سے بائیں جانب ایک ویرانے میں مڑ گئی آسمان پر تارے نکلے ہوئے تھے۔ شہر کی روشنیاں شیرے کے عقب میں زرد اور بھورے پتھروں کے ٹیلوں کے پیچھے گم ہو چکی تھیں۔ کلر زدہ میدان میں جگہ جگہ خشک جھاڑیاں اُگی تھیں۔ جیپ ریتیلی مٹی اڑاتی اپنی منزل یعنی زمان کی خفیہ بیرک کی طرف بڑھ رہی تھی اس بیرک میں اس سے پہلے کتنی لڑکیاں قید رہ کر بیرون ملک فروخت کر دی گئی تھیں۔ اس گھناؤنے جرم میں شیرا زمان کے ساتھ برابر کا شریک رہا تھا۔

آج اسے اپنے گناہوں اور جرائم پر ندامت ہو رہی تھی اور دل میں خدا سے التجائیں کر رہا تھا کہ وہ اس کے گناہ معاف کر دے اس لئے کہ شیرے نے پوری نیک نیتی سے نجمی کے ساتھ گھریلو زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ شیرے کو اس حقیقت کا علم تھا کہ نجمی ایک دم سے اس کے ساتھ رہنے پر تیار نہیں ہو جائے گی ہو سکتا ہے کہ نجمی نے زمان کے چنگل سے نکلنے کے لئے شیرے کے ساتھ بھاگنے کا فیصلہ کیا ہو لیکن شیرے نے بھی پورا پورا انتظام کر لیا تھا وہ نجمی کو ساتھ لے کر ایک ایسے ملک میں

جانے کا منصوبہ تیار کر چکا تھا جہاں نجمی شبیرے سے الگ ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ دور سے بیرک کے قریب درختوں کے سیاہ جھنڈ نظر آئے شبیرے نے جیپ کی رفتار کم کر دی۔ جب وہ بیرک کے درختوں والے کچے احاطے میں داخل ہوا تو زمان اور چوکیدار رائفلیں تان کر برآمدے کے ستونوں کے پیچھے چھپ گئے۔ زمان نے شبیرے کی جیپ کو پہچان لیا وہ اس کے قریب آ گیا۔

"تم اس وقت یہاں کیوں آئے ہو؟" کوٹھڑی کے اندر قید نجمی نے جیپ کی آواز سن لی تھی وہ سمجھ گئی تھی کہ وعدے کے مطابق شبیرا سے وہاں سے نکال لے جانے کے لئے پہنچ گیا ہے وہ بند دروازے کی درز میں سے باہر دیکھنے لگی۔ برآمدے کے ساتھ لالٹین لٹک رہی تھی اس کی روشنی میں نجمی نے جیپ کے قریب زمان اور شبیرے کو باتیں کرتے اور پھر آہستہ آہستہ چل کر برآمدے کی طرف آتے دیکھا شبیرا زمان سے کہہ رہا تھا۔

"باس! میں کبھی نہ آتا۔۔۔ مگر میرا دل بار بار مجھے ملامت کر رہا تھا کہ میں نے اپنی جگہ تمہیں بھجوا کر زیادتی کی ہے اس لئے جیپ لے کر چلا آیا۔"

زمان برآمدے کی سیڑھیوں میں بیٹھ گیا شبیرا بھی اس کے پاس ہی سیڑھیوں میں بیٹھ گیا وہ عقابی نظروں سے اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ چوکیدار اپنی کوٹھڑی کی طرف چلا گیا تھا۔ رات سنسان تھی۔ لالٹین کی روشنی صرف برآمدے تک ہی محدود تھی۔ درختوں کے نیچے جو جھاڑیاں تھیں ان میں سے جھینگروں اور کسی سانپ کے بولنے کی مسلسل آواز آ رہی تھی وقفے وقفے سے بلند ہوتی سیٹی کی آواز سانپ کی تھی جسے شبیرا خوب پہچانتا تھا۔ زمان نے سگریٹ نکال کر سلگا لیا اور شبیرے کی طرف جھک کر آہستہ سے کہنے لگا۔

"لانچ کل رات تیار ہو گی تم اسے لے کر شروع رات ہی یہاں سے نکل جانا اور باقی رقم گن کر وصول کرنا یہ تسلی کر لینا کہ کرنسی نقلی نہ ہو۔" شبیرے نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے کہا۔

"تم فکر نہ کرو استاد! سب ٹھیک ہو گا۔" شبیرا چوری چوری چوکیدار کی طرف بھی دیکھتا جاتا تھا آج رات ہر حالت میں شبیرے کو نجمی کو ساتھ لے کر اپنے جگری دوست کے پاس وہاں سے کئی میل دور اس کے ٹھکانے پر پہنچنا تھا وہ اس کا انتظار کر رہا ہو گا۔ شبیرے کے پاس وقت بہت کم تھا اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"باس! میں چائے بنا کر لاتا ہوں۔" زمان نے کوئی اعتراض نہ کیا اسے بھی اپنی نیند کو کچلنے کے لئے چائے کی شدید طلب محسوس ہو رہی تھی۔ شبیرے کو باورچی خانے کی طرف جاتے دیکھ کر زمان نے کہا۔

"چوکیدار کو کہو وہ چائے بنا دے گا۔" شبیرے نے پلٹ کر کہا۔

"اسے کہاں چائے بنانی آتی ہے استاد! میں خود بنا کر لاتا ہوں۔" شبیرا جلدی سے باورچی خانے میں داخل ہو گیا اس نے آگ جلا کر کیتلی میں پانی رکھا۔ اس میں پتی ڈالی، دودھ ڈالا، چینی ڈالی اور چمچہ ہلانے لگا۔ چائے تیار ہو گئی تو شبیرے نے اسے تین پیالیوں میں ڈالا پھر دو پیالیوں میں بے ہوشی کا سفوف ڈال دیا۔ یہ بڑی جلدی اثر کرنے والا سفوف تھا اب شبیرے کو ایک ہی خطرہ تھا کہ کہیں پیالی نہ بدل جائے یا استاد زمان شبہ ہونے کی صورت میں اسے اپنی پیالی میں سے چائے پینے کے لئے نہ کہہ دے۔

شبیرے نے باورچی خانے سے نکلتے ہی ایک پیالی چوکیدار کو دے دی جو باہر ایک پتھر پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ سادہ پیالی بائیں ہاتھ میں اور سفوف والی پیالی دائیں ہاتھ میں لئے وہ ہنسی مذاق کے موڈ میں زمان کو ہوٹل کے ایک نوکر کی کوئی دلچسپ بات سناتا زمان کے پاس آ گیا اور اس کی طرف بڑی بے نیازی سے پیالی بڑھا کر بولا۔

"باس! ہوٹل میں بھی ایک نوکر ایسا ہے جس کی ہر حرکت پر ہنسی آتی ہے بیوقوف ضرور ہے مگر کام بڑی محنت اور دیانت سے کرتا ہے۔" شبیرا اوپر اوپر سے بڑے لائٹ موڈ میں بات کر رہا تھا مگر اندر سے اس کا دل دھڑک رہا تھا کہ کہیں زمان

کو شک نہ پڑ جائے کہ پیالی میں شیرے نے کچھ ملا تو نہیں دیا۔ زمان نے سگریٹ پاؤں تلے مسلنے کے بعد پیالی ہاتھ میں لے لی اور ہونٹوں کے قریب لے گیا شیرے نے اپنے بے ضرر پیالے میں سے گھونٹ بھرا اس نے گردن کو ذرا سا گھما کر پیچھے نیم اندھیرے میں بیٹھے چوکیدار کو دیکھا اگر وہ کم بخت پہلے بے ہوش ہو گیا تو سارا معاملہ الٹ سکتا تھا مگر چوکیدار ابھی تک بے ہوش نہیں ہوا تھا۔

شیرا اپنے منصوبے پر عمل درآمد کا ایسا پختہ عزم کر چکا تھا کہ بے ہوش نہ ہونے کی صورت میں وہ زمان اور چوکیدار کو گولی سے اڑانے کا ارادہ کئے ہوئے تھا زمان نے چائے کا ایک گھونٹ پی لیا۔

شیرے نے اپنی جیب میں اس طرح ہاتھ ڈالا جیسے کچھ تلاش کر رہا ہو پھر بولا "میں اپنا لائٹر چولہے کے پاس ہی بھول آیا ہوں ابھی لاتا ہوں استاد۔" وہ اس وقت زمان کے سامنے نہیں رہنا چاہتا تھا۔ زمان بڑا کائیاں آدمی تھا بے ہوشی کے ذرا سے احساس کے ساتھ ہی وہ معاملے کی تہہ تک پہنچ سکتا تھا اور پھر بندوق اس کے پاس ہی تھی وہ شیرے کو گولی سے اڑا سکتا تھا۔

شیرا تیز تیز قدم اٹھاتا باورچی خانے کی طرف چلنے لگا چوکیدار جہاں بیٹھا تھا وہاں کچھ اندھیرا تھا شیرا اس کے قریب سے گزرا تو اس نے دیکھا کہ چائے کی پیالی اس کے ہاتھ سے گر چکی تھی اور وہ بے ہوش ہو کر باورچی خانے کی دیوار کے ساتھ لگ گیا تھا۔ شیرا تیزی سے باورچی خانے میں گھس گیا اندر آتے ہی اس نے قمیض کے اندر والی صدری سے بھرا ہوا پستول نکال لیا اور کھڑکی میں گھات لگا کر زمان کی طرف تکنے لگا۔

زمان چائے کا شاید تیسرا چوتھا گھونٹ پی رہا تھا اچانک وہ اٹھا پیالی اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ اس نے بندوق کا رخ کچن کی طرف کرنے کی کوشش کی مگر وہ ایسا نہ کر سکا پھر اس نے بندوق چلانے کی بھی کوشش کی مگر اس میں کامیاب نہ ہوا بے ہوشی کا سفوف اپنا کام کر چکا تھا۔ زمان لڑکھڑایا اور پھر زمین پر گر پڑا۔

شیرے نے پستول اسی طرح ہاتھ میں رکھا اور دوسری طرف درختوں کے پیچھے سے چلتا ہوا زمان سے کوئی دس قدم دور کھڑا ہو گیا اسے شک تھا کہ کہیں زمان کوئی چال نہ چل رہا ہو پھر وہ دبے پاؤں اس کے سر کی طرف سے قریب آیا اور لپک کر بندوق اٹھا کر پرے پھینک دی۔ اس نے زمان کو ہلا جلا کر دیکھا زمان بے ہوش ہو چکا تھا۔

شیرا بھاگ کر چوکیدار کے پاس گیا۔ نجمی بند کوٹھری کے دروازے سے لگی یہ سارا تماشہ دیکھ رہی تھی کہ شیرے کے ساتھ یہاں سے بھاگ کر وہ پہلے موقع پر ہی فرار ہو جائے گی۔

شیرے نے چوکیدار اور زمان کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر ان کے ہاتھ پاؤں رسی سے جکڑ دیئے اور لپک کر نجمی کی کوٹھڑی کا دروازہ کھول دیا۔ نجمی پیچھے ہٹ گئی اندر اندھیرا تھا شیرے کو نجمی کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں جو اندھیری رات میں چیتے کی طرح چمک رہی تھیں۔

"راستہ صاف ہے میرے ساتھ چلو۔۔ آ جاؤ۔۔۔۔ ڈرو نہیں۔۔۔ میں تمہارا خاوند ہوں کوئی غیر نہیں ہوں۔" نجمی نے چارپائی پر گرا ہوا دوپٹہ اٹھا کر سر پر ڈالا اور شیرے کے پیچھے پیچھے کوٹھڑی سے نکل کر جیپ کی طرف چلی۔ شیرے نے واسکٹ کی جیب میں سے نائیلون کی رسی نکالتے ہوئے کہا۔

"میری نیت پر شک نہ کرنا نجمی۔۔۔ لیکن میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا۔۔ میں اپنی زندگی کا آخری داؤ لگا رہا ہوں۔" نجمی خاموش تھی وہ سوچ رہی تھی کہ یہ شخص اسے کہاں لے جائے گا اور وہ کہاں اور کس مقام پر سے فرار ہونے کی کوشش کرے گی شیرے نے نجمی کے دونوں ہاتھ پیچھے کر کے رسی سے باندھ دیئے۔ نجمی نے کچھ نہ کہا وہ جیپ میں اسٹیئرنگ کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

شیرے نے طوفانی اسپیڈ سے جیپ کو بیرک کے احاطے سے نکالا اور اندھیری رات میں اسے ویران میدان میں ایک طرف ڈال دیا۔ وہ تیز رفتاری سے جیپ

کو لئے جا رہا تھا۔ کچھ دور تک جیپ سڑک پر دوڑتی رہی پھر اس کا رُخ دائیں جانب اونچے نیچے غیر ہموار میدان کی طرف موڑ دیا گیا۔ جیپ بار بار اچھل رہی تھی نجمی کی ہڈیاں دکھنے لگیں اس نے کہا۔ "آہستہ کیوں نہیں چلاتے؟"

شیرے نے کوئی جواب نہ دیا وہ جیپ آہستہ نہیں چلا سکتا تھا پھر بھی اپنی بیوی کا خیال کرتے ہوئے اس نے رفتار تھوڑی سی کم کر دی اس نے جیپ کی ہیڈ لائٹس بند کر دی تھیں۔ ستاروں کی دھیمی روشنی میں وہ صحیح رُخ پر جا رہا تھا۔ کئی سوکھے کھڈ اور نالے عبور کرنے کے بعد جیپ ایک بار پھر کھلے میدان میں آ گئی یہ میدان ریتیلا تھا جگہ جگہ اندھیرے میں جنگلی جھاڑیوں کے جھنڈ بکھرے ہوئے تھے۔

جیپ ہچکولے کھاتے جا رہی تھی اس کی رفتار ایک بار پھر تیز ہو گئی تھی جس کی وجہ سے نجمی کا انگ انگ درد کرنے لگا تھا۔ ہاتھ پیچھے بندھے ہونے کی وجہ سے وہ ان دھچکوں سے اپنا بچاؤ نہیں کر سکتی تھی اس نے چلا کر کہا۔

"جب میں اپنی مرضی سے تمہارے ساتھ جا رہی ہوں تو تم نے میرے ہاتھ کیوں باندھ رکھے ہیں؟ مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔" شیرے نے ایک دم بریک لگا دیئے۔ نجمی کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ شیرے نے اُتر کر نجمہ کے ہاتھ کھول دیئے لیکن ایک ہاتھ پھر بھی جیپ کے دروازے کی ریلنگ سے باندھ دیا نجمی نے اعتراض کیا مگر شیرا کچھ نہ بولا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر وہ اچھل کر بیٹھا اور جیپ ایک بار پھر ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

اب نجمی نے ایک ہاتھ سے اپنی سیٹ کو اور دوسرے بندھے ہوئے ہاتھ سے کھڑکی کی آہنی سلاخ کو تھام رکھا تھا۔ یہ تکلیف دہ ویرانے کا سفر جاری رہا۔ نجمی بے بسی کے عالم میں کبھی آس پاس اندھیرے میں ڈوبے میدان کو تکتی اور کبھی ستاروں کو دیکھنے لگتی یہی ستارے لاہور میں ان کے مکان کے اوپر بھی چمک رہے ہوں گے؟ کیا وہ زندہ ہوں گے؟ کاش میں ان کے اعتماد کو ذبح کر کے گھر سے نہ بھاگتی۔۔۔ کاش مجھے کوئی سمجھانے والا ہوتا۔

ندیم نے میری زندگی کو تباہی کے راستے پر ڈال دیا ہے لیکن نہیں اس میں ندیم کے علاوہ اس کا اپنا قصور بھی ہے۔ وہ سمجھدار، پڑھی لکھی، بالغ لڑکی تھی اسے ایسا گھناؤنا قدم کبھی نہیں اٹھانا چاہیئے تھا اسے اپنے ماں باپ کی عزت اور اپنی آبرو خاک میں نہیں ملانی چاہیئے تھی۔ وہ شریف ماں باپ کی بیٹی تھی اور شریف بیٹیوں کو اپنے ماں باپ کی عزت کا خیال ہوتا ہے وہ تو اپنی اور اپنے ماں باپ کی عزت پر جان قربان کر دیتی ہیں اور نجمی ان کی عزت کو نیلام کر کے گھر سے بھاگ آئی تھی۔

اب اسے اپنے گناہ کی سزا بھگتنا تھی اور وہ بھگت رہی تھی۔ ایک ناسمجھ ہرنی جب درندوں سے بھرے ہوئے جنگل کا رُخ کرتی ہے تو اس کا یہی انجام ہوتا ہے جیپ اب ایک ایسے جنگل میں سے گزر رہی تھی جہاں اندھیری راتیں اونچے اونچے پتلے پتلے درخت فاصلے فاصلے پر اگے ہوئے تھے ان کے بیچ میں راستہ بنا ہوا تھا۔ شیرے نے اب جیپ کی ہیڈ لائٹس جلا دی تھیں۔ ایک لومڑ یا کتا بھاگ کر جیپ کے آگے سے نکل گیا۔ جیپ کی روشنی چند گز تک ہی پڑ رہی تھی اس کی وجہ وہ جھاڑیاں تھیں جو کچے راستے پر جھکی ہوئی تھیں۔ اب رات کی ہوائیں سمندر کی مرطوب ہوا بھی شامل ہو گئی تھی۔ شیرے کے جگری دوست کا ڈیرا قریب آ رہا تھا۔ نجمی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ شخص اسے کہاں لئے جا رہا ہے۔ ایک دو بار اس نے پوچھا بھی مگر شیرے نے کوئی جواب نہ دیا۔

نجمی کو دُور روشنی کا نقطہ ٹمٹماتا نظر آنے لگا یہ شیرے کے دوست کے ڈیرے کی لالٹین کی روشنی تھی جو اس کی کوٹھری سے باہر بانس کے ساتھ لٹک رہی تھی۔ شیرے نے جیپ کی رفتار کم کر دی۔ نجمی نے کہا۔

"اب تو میرا ہاتھ کھول دو میں یہاں سے بھاگ کر کہاں جاؤں گی؟" شیرے نے نجمی کی بات کی طرف کوئی توجہ نہ دی اس کی نظریں دور نظر آتی لالٹین کی روشنی پر جمی تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ اس ڈیرے پر رات کو باہر کوئی روشنی نہیں کرتا یہ لالٹین شیرے کے دوست نے صرف اس کی خاطر روشن کر رکھی تھی۔ جیپ جھاڑیوں

اور ریت کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریوں کو روندتی ہوئی ڈیرے کی کوٹھڑی کے باہر ایک طرف جا کر رک گئی۔ شیرے کا دوست اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ باہر موجود تھا اس کے کاندھے سے پستول لٹک رہا تھا۔ شیرا اس کی طرف بڑھا دونوں دوست گلے ملے۔ شیرے نے نجمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ میری بیوی ہے میں اسے لے آیا ہوں۔" اس کے دوست نے شیرے کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے ایک طرف لے گیا۔ "معاملہ خراب ہو گیا ہے شیرے" شیرا منہ کھولے اپنے دوست کو تکنے لگا۔ شیرے کے بال گرد میں اٹے ہوئے تھے اس کا دوست اسے کوٹھڑی میں لے گیا۔ یہاں ایک کھاٹ بچھی ہوئی تھی۔

"تم بیٹھو۔۔۔ منہ ہاتھ دھو لو۔۔۔ میں تمہیں سب سمجھاتا ہوں۔" شیرا جلدی سے بولا۔

"مگر تم تو کہتے تھے کہ ہر شے ٹھیک ٹھاک ہے؟" اس کے دوست نے کہا "شیرے۔۔۔ میرے دوست۔۔۔ یہ بات تم بھی جانتے ہو کہ بارڈر کے حالات بدلتے رہتے ہیں یہاں کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا ہے میں نے تمہارے بارڈر کراس کرانے کا پورا بندوبست کر رکھا تھا مگر عین وقت پر معاملہ گڑبڑ ہو گیا ہے اس وقت دونوں جانب سیکورٹی اتنی سخت کر دی گئی ہے کہ کوئی چڑیا بھی بارڈر کراس نہیں کر سکتی۔

شیرے نے کہا "ہم دو دن بعد بارڈر کراس کر لیں گے۔" اس کا دوست بولا۔ "میں نے سارا پتہ کروالیا ہے یہ سیکورٹی نامعلوم مدت تک جاری رہے گی خدا جانے کیا بات ہو گئی ہے دو ایک جگہوں پر تو فوجوں نے بھی اگلے مورچے سنبھال لئے ہیں اور بی ایس ایف والوں کی گاڑیاں ہر وقت گشت لگاتی رہتی ہیں۔" پھر اس نے باہر کی طرف دیکھ کر کہا۔

"بھابی کو یہاں لے آؤ۔۔۔ میں بستر لگوا دیتا ہوں۔۔۔ تم اگر چاہو تو اسی کوٹھڑی میں سو جاؤ صبح بات کریں گے۔" اس نے شیرے کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"گھبراؤ نہیں میرے دوست کچھ نہ کچھ ہو جائے گا میں تمہیں واپس کراچی نہیں جانے

دوں گا میں جانتا ہوں وہاں تمہارے دشمن اب تمہاری گھات میں بیٹھے ہیں۔" شیرے کا چہرہ اتر گیا تھا وہ بارڈر کراس کر کے دوسرے ملک میں نکل جانے کا منصوبہ بنا چکا تھا کہ معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا اس نے نجمی کا ہاتھ کھول دیا اور سر پر سے گرد جھاڑتے ہوئے بولا "میرے ساتھ آ جاؤ۔۔۔ گھبراؤ نہیں۔۔۔ یہ میرا جگری یار ہے وہ تمہیں بھابی کہتا ہے۔"

نجمی اپنی کلائی کو دوسرے ہاتھ سے دباتی ہوئی شیرے کے ساتھ کوٹھڑی کے پاس آئی۔ شیرے کا دوست ایک طرف ہٹ کر بڑے ادب سے کھڑا تھا۔ اس نے نجمی کو سلام کیا اور بولا۔

"بھابی! یہ جگہ تمہارے لائق نہیں مجھے معاف کر دینا۔" نجمی نے سوچا کہ یہ شخص نرم دل اور شریف انسان لگتا ہے اس سے فرار ہونے میں مدد لی جا سکتی ہے اس کی بپتا سن کر یقیناً اس کا دل پگھل جائے گا وہ بوجھل قدموں سے کوٹھڑی میں داخل ہو گئی۔ وہاں پہلے ہی سے بستر لگا دیا گیا تھا دوسری کوٹھری سے ایک عورت آنکھیں ملتی ہوئی نمودار ہوئی اس نے نجمی کا منہ ہاتھ دھلایا اور بستر پر بٹھا کر کچھ کہے بغیر واپس چلی گئی تھوڑی دیر میں شیرا بھی آ گیا وہ واسکٹ اتار رہا تھا کہ نجمی نے کہا۔

"تم یہاں نہیں سوؤ گے۔" شیرا واسکٹ اتارتے اتارتے رک گیا۔ "تم میری بیوی ہو نجمی! میرے پاس نکاح نامہ موجود ہے۔" نجمی نے نفرت سے کہا۔

"خبردار! اس نکاح نامے کا نام نہ لینا۔" شیرا قریب آ کر بولا۔

"مگر نجمی تم تو میرے ساتھ زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کر چکی تھیں۔" نجمی نے گہری آہ بھری۔۔۔ پھر شیرے کی طرف دیکھا اور شکستہ آواز میں بولی۔

"ہاں۔۔۔ میں نے یہی فیصلہ کیا ہے۔۔۔ مگر تم ابھی اس کوٹھڑی میں نہیں سوؤ گے۔۔۔ جو میں کہتی ہوں وہی کرو۔۔۔ جاؤ۔۔۔ کل دیکھا جائے گا۔" شیرے نے واسکٹ پہنے رکھی اور کوٹھڑی سے باہر نکل گیا اس نے یہ بات اپنے جگری دوست کو بتا دی انہوں نے کوٹھڑی کے باہر تالا لگا دیا تالے کی آواز سن کر نجمی کا دل بیٹھ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے کسی نے اس کی قسمت کو تالا لگا دیا ہے۔ اس کے خواب ٹوٹ چکے

دلنوں کی بہار ختم ہو گئی ہے اب وہ اس بہار کو کبھی نہ دیکھ سکے گی۔ اس کا جسم درد کر رہا تھا وہ چارپائی پر لیٹ گئی اس نے آنکھیں بند کر لیں اسے نشابہ کا خیال آ گیا وہ کس حال میں ہوگی؟ اس کے بارے میں کیا سوچ رہی ہوگی۔ نجمی کی آنکھوں میں گرم گرم آنسوؤں کے قطرے کپکپانے لگے ایک گرم آنسو اس کی آنکھ سے نکل کر اس کے رخسار پر بہہ گیا پھر نجمی نے اپنے منہ پر دونوں ہاتھ رکھ لئے اور دوسری طرف منہ کر کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی دیر تک روتے رہنے کے بعد اس پر نیند کی غنودگی طاری ہوتی گئی اور وہ سو گئی۔

ساتھ والی کوٹھڑی میں شیرا ابھی سو گیا تھا۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو دن کافی نکل آیا تھا اس کے دوست نے ناشتہ تیار کروا رکھا تھا۔ نجمی کی محافظ عورت نے نجمی کو اپنی نگرانی میں غسل کروانے کے بعد دوسرے کپڑے پہنا دیئے تھے اسے ناشتہ بھی کروا دیا گیا تھا اور اب نجمی کوٹھڑی میں سر جھکائے خاموش بیٹھی اپنے کئے پر آنسو بہا رہی تھی۔

شیرا ناشتہ کرتے ہوئے اپنے دوست کے ساتھ بڑی اہم باتیں کر رہا تھا بارڈر کراس کرنا اب ناممکن تھا۔ شیرے نے اپنے دوست کو صاف صاف بتا دیا تھا کہ لڑکی پڑھی لکھی ہے اور لاہور کے معزز گھرانے سے تعلق رکھتی ہے وہ اس کے ساتھ گھر بسانے پر راضی نہیں ہے مگر وہ اس سے شادی کر چکا ہے نکاح نامے پر لڑکی کے دستخط موجود ہیں وہ ہر صورت میں نجمی کے ساتھ ایک نئی شریفانہ زندگی شروع کرنا چاہتا ہے۔ اس کے دوست نے کہا۔

"کچھ روز تمہارے ساتھ رہے گی تو اپنے آپ راضی ہو جائے گی... اب واپس جائے گی تو اس کی وہ عزت نہیں ہوگی عورت کو داغ لگ جائے تو پھر اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا وہ ان باتوں کو ضرور سمجھتی ہوگی۔" شیرا بولا۔

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ اب میں اسے لے کر کہاں جاؤں؟ پاکستان میں، میں کسی بھی شہر میں رہا تو زمان کے آدمی وہاں پہنچ کر مجھے قتل کر ڈالیں گے اور ہو

سکتا ہے کہ یہ لڑکی بھی میرے ہاتھ سے نکل جائے۔" اس کے دوست نے شیرے کو ایک مشورہ دیا اور بولا۔

"اگر تم میرے اس مشورے کو تسلیم کر لو تو میں تمہارا سارا بندوبست کر دوں گا۔"

شیرا جینک سے پیالی میں چائے ڈال رہا تھا وہ رک گیا اپنے دوست کی طرف چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا اور بولا۔

"اس کا تو مجھے خیال ہی نہیں آیا تھا۔" پھر اچانک اس کے چہرے پر مایوسی کے سائے منڈلانے لگے بولا۔

"لیکن یہ لڑکی وہاں بڑی آسانی سے مجھ سے بھاگ جائے گی... وہ تو اپنا ہی ملک ہوگا۔" شیرے کے دوست نے شیرے کو اپنی نوبیاہتا اور زبردستی کی بیوی کو ساتھ لے کر مشرقی پاکستان چلے جانے کا مشورہ دیا تھا۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب مشرقی پاکستان میں مکمل طور پر امن اور سکون تھا۔ شیرا کہہ رہا تھا۔

"دوست! مجھے صرف ایک سال کسی الگ تھلگ مقام پر ایسی جگہ رہنا ہوگا جہاں میری بیوی کے پاس آنے جانے والا کوئی نہ ہو یہ جگہ شہر سے دور کسی ویران مقام پر واقع ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ اس سے ایک بچہ ہو جائے... بس پھر یہ عورت مجھ سے کہیں نہیں جائے گی۔" شیرے کا دوست مسکرا رہا تھا سگریٹ کا کش لگا کر پستول والی پیٹی گود میں رکھتے ہوئے بولا۔

"اس کا بھی انتظام ہو جائے گا... میرا ایک آدمی تمہارے ساتھ مشرقی پاکستان جائے گا وہ تمہیں وہاں ایک ایسی جگہ پر پہنچا دے گا جہاں وہی کچھ ہوگا جو تم چاہتے ہو تم چاہے زندگی بھر وہاں رہو تمہیں کوئی نہیں پوچھے گا تمہارے کھانے پینے کا سارا خرچ میرا مشرقی پاکستان والا دوست اٹھائے گا اور یہ تم پر کوئی احسان نہیں ہوگا اس کا... تم یوں سمجھ لو کہ وہ خرچ میں کر رہا ہوں گا۔" شیرے نے کہا۔

"میں تم پر بھی بوجھ نہیں بننا چاہتا بس مجھے ایک سال کی مہلت چاہیئے

بچہ ہو گیا تو پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا یہ لڑکی پھر ہمیشہ کے لئے میری ہو کر رہے گی۔" شبیرے کے دوست نے کہا۔

"تم بے فکر ہو کر وہاں ایک سال رہو وہ جگہ شہر سے دور۔۔ بہت دور ایک پہاڑی جنگل میں ہے۔۔۔ مگر تمہیں ضرورت کی ہر شے وہاں ملے گی۔" شبیرے کے سامنے سب سے بڑی پریشانی یہ تھی کہ اسے مشرقی پاکستان جانے کے لئے پہلے کراچی جانا پڑتا جہاں زمان اور اس کے ساتھی شبیرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہوں گے اس مسئلے کا حل شبیرے کے دوست نے یہ نکالا کہ وہ ان دونوں کو اپنے خاص محافظوں کی مدد سے کراچی کی بندرگاہ تک پہنچائے گا۔ شبیرے نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ چونکہ وہ ایک بار پھر کراچی جا رہے ہیں ممکن ہے نجمی کو شور مچانے یا کوئی مصیبت کھڑی کر دینے کا موقع مل جائے۔ شبیرے کے دوست نے کہا۔

"اس کا ایک ہی علاج ہے اور یہ کہ نجمی کو بے ہوش کر کے بیمار ظاہر کر کے بندرگاہ تک لے جاؤ ایک بار تم دونوں بحری جہاز میں داخل ہو گئے تو پھر کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا ویسے بھی میرا آدمی تمہارے ساتھ ہو گا۔" شبیرے نے کہا۔

"تو پھر جتنی جلدی ہو سکے ہمارا ٹکٹ منگوا دو۔" بے ہوشی کا سفوف شبیرے کے پاس ہی تھا اس کا اثر آدمی پر چوبیس گھنٹے تک ضرور رہتا تھا۔ شبیرے کے دوست نے اسی روز کراچی سے چاٹگام تک کے دو سیکنڈ کلاس کے ٹکٹ منگوا لئے بحری جہاز دو روز بعد دن کے وقت کراچی سے روانہ ہونے والا تھا۔ اس دوران شبیرے نے نجمی کو کوٹھڑی میں ہی بند رکھا اسے محافظ عورت کے ساتھ تھوڑی دیر کے لئے باہر جانے کی اجازت تھی۔

جس روز انہیں کراچی کی بندرگاہ کی طرف روانہ ہونا تھا شبیرے نے نجمی سے یہی کہا کہ وہ واپس کراچی جا رہے ہیں۔ نجمی نے پوچھا کہ وہ کراچی کس لئے جا رہے ہیں؟ جس کا جواب شبیرے نے یہ دیا کہ تمہیں وہاں چل کر بتاؤں گا۔ نجمی یہ سمجھی کہ

شاید زمان کا کچھ دباؤ پڑا ہے ہو سکتا ہے زمان نے کراچی میں شبیرے کے کسی قریبی آدمی یا بھائی کو یرغمال بنا لیا ہو وہ خوش ہوئی کہ اس اجاڑ ویرانے سے تو نجات ملے گی۔ کراچی ایک بڑا شہر تھا اور وہاں جا کر لاہور جانے کے ذرائع پیدا کئے جا سکتے تھے دن کے سات بجے انہیں روانہ ہونا تھا۔ چھ بجے شبیرا نجمی کے لئے چائے لے کر آ گیا۔ نجمی کی پیالی میں بے ہوشی کے سفوف والی چائے تھی نجمی کو اس قسم کا شک پیدا نہیں ہو سکتا تھا بھلا اب شبیرے کو کیا ضرورت تھی کہ اسے بے ہوش کرتا چنانچہ وہ بلا جھجک چائے پینے اور کراچی کی باتیں کرنے لگی۔

دوسرے گھونٹ پر ہی اس کا سر اسی طرح سے چکرایا جس طرح کراچی میں شادی کی رات چکرایا تھا وہ فوراً سمجھ گئی کہ اسے بے ہوش کیا جا رہا ہے۔ پیالی اس کے ہاتھ سے گر پڑی وہ شبیرے سے پوچھنے ہی والی تھی کہ بے ہوش ہو گئی ایک گھنٹے بعد بند ویگن اس طرح کراچی بندرگاہ کی طرف اڑی جا رہی تھی کہ شبیرے نے کوٹ پتلون اور ٹائی لگا رکھی تھی مونچھیں صاف کر دی تھیں۔ نجمی سامنے والی سیٹ پر برقعے میں ملبوس بے ہوش پڑی تھی۔ صرف چہرے پر سے نقاب اٹھا ہوا تھا۔ ان کے ساتھ ایک خاص آدمی بھی تھا یہ آدمی شبیرے کے دوست کی طرف سے ساتھ بھیجا جا رہا تھا اس کا نام گوندی تھا۔

ایک بھرا ہوا پستول گوندی کی لمبی قمیض کے اندر صدری میں چھپا تھا اور ایک پستول شبیرے نے قمیض کے اندر پتلون میں چھپا رکھا تھا ان کے ساتھ ایک ٹرنک بھی تھا جس میں شبیرے اور نجمی کے کپڑے وغیرہ تھے اس زمانے میں شناختی کارڈ کا رواج نہیں تھا۔ کراچی سے بحری جہاز میں مسافر ٹکٹ لے کر بیٹھتے اور مشرقی پاکستان پہنچ جاتے تھے۔

ان تینوں کی سیکنڈ کلاس میں نشستیں ریزرو ہو چکی تھیں۔ بندرگاہ پر گوندی نے جیٹی کے اہلکاروں کو بتایا کہ بیگم صاحبہ کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے کیونکہ ڈھاکا میں ان کی بیٹی کا کار کا حادثہ ہو گیا ہے۔ نجمی کو اسٹریچر پر ڈال کر جہاز میں

پہنچا دیا گیا۔ شیرا کوٹ پتلون میں اسٹریچر کو سنبھالے رونی صورت بنائے ساتھ ساتھ چل رہا تھا وہ بار بار آسمان کی طرف دیکھ کر آہ بھر لیتا تھا۔ کیبن میں نجمی کو برتھ پر لٹا دیا گیا تو شیرے نے سکھ کا سانس لیا ماتھے سے پسینہ پونچھ کر گوندی سے بولا۔

"گوندی جہاز چلنے میں کتنی دیر ہے ابھی؟" کوئی دو گھنٹے بعد جہاز کے انجن اسٹارٹ ہوئے اور کیبن کے فرش اور دیواروں میں ہلکی ہلکی لرزش پیدا ہوئی تو شیرا کیبن سے باہر نکل کر کاریڈور میں جنگلے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ کافی بڑا جہاز تھا۔ نیچے جیٹی پر لوگ ہاتھ ہلا ہلا کر اپنے احباب کو رخصت کر رہے تھے۔

جہاز آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہا تھا۔ شیرے نے پتلون قمیض پہن رکھی تھی اسے کوئی دور سے بالکل نہیں پہچان سکتا تھا۔ اب اگر وہ پہچان بھی لیا جاتا تو زمان اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ جہاز کافی پیچھے چلا گیا تو شیرا بھی کیبن میں آ گیا بڑی بڑی مونچھوں والا اس کے دوست گوندی برتھ پر اکڑوں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی انگوٹھیوں کے نگینے چمک رہے تھے۔ یہ اونچا لمبا جوان تھا اور شلوار قمیض میں ملبوس تھا۔ بالوں کے پٹے گردن تک تھے۔ گلے میں چاندی کا تعویذ تھا اور سیاہ واسکٹ پہن رکھی تھی۔ اس نے دوسری برتھ پر بے ہوش نجمی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"لالہ! اب اس کا برقعہ اتار دو ذرا اسے ہوا لگے۔" شیرا بولا۔

"ذرا جہاز کو کھلے سمندر میں پہنچ جانے دو۔" جہاز کھلے سمندر میں داخل ہوا تو شیرے نے بے ہوش نجمی کا برقعہ اتار کر ایک طرف تہہ کر کے رکھ دیا۔

جہاز کے ڈاکٹری عملے کی ایک نرس نے آ کر نجمی کا ٹمپریچر دیکھا اسے ٹیکہ لگایا پھر گلوکوز لگا کر چلی گئی۔ جہاز چاٹگام کی طرف رواں تھا جو بیس گھنٹوں کے بعد نجمی کو ہوش آ گیا اس نے آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا۔ سب سے پہلے اس کی نظر گوندی پر پڑی۔ اس بڑی بڑی مونچھوں والے آدمی کو اس نے شیرے کے دوست کے ڈیرے پر دیکھا ہوا تھا۔ اس نے شیرے کی طرف دیکھ کر نقاہت بھری آواز میں پوچھا

کہ تم نے مجھے بے ہوش کیوں کیا [illegible]

"یہ ضروری تھا۔ اب تم میری بات غور سے سنو۔۔۔" اور پھر شیرے نے اسے بتایا کہ وہ اسے لے کر مشرقی پاکستان جا رہا ہے جہاں وہ دونوں اپنے دشمنوں سے دور رہ کر نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔

"نرس تمہاری دیکھ بھال کر رہی ہے۔ ہم نے انہیں یہی بتایا ہے کہ تم اپنی بچی کے ایکسیڈنٹ کی خبر سن کر بے ہوش ہو گئی تھیں۔ تم بھی یہی ظاہر کرنا۔ تم اس وقت بحری جہاز میں ہو اور جہاز چاٹگام کی طرف جا رہا ہے اگر تم نے کسی کو دیکھ کر شور مچانے کی کوشش کی تو ایک پستول گوندی کے پاس ہے اور ایک بھرا ہوا ریوالور میرے پاس ہے اس سے پہلے کہ تم کسی کو کچھ کہہ سکو دو گولیاں سینے سے پار ہوں گی۔ ہمارے ساتھ جو ہوگا ہم بعد میں دیکھیں گے مگر تم زندہ نہ رہو گی۔"

گوندی نے اپنا پستول واسکٹ کی جیب سے نکال کر نجمی کو دکھایا۔ شیرے نے بھی اپنے ریوالور کی ایک جھلک دکھا دی۔ نجمی سمجھ گئی کہ اب وہ پوری طرح ان کے چنگل میں ہے اور کوئی سوچی سمجھی حکمت عملی ہی اسے ان سے نجات دلا سکتی ہے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"شیرے میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ میں تیرے ساتھ زندگی بسر کرنے کو تیار ہوں مجھے صرف دو ایک ماہ کی مہلت دے دو۔ میں تمہارے ساتھ ہی رہوں گی۔

پھر تم مجھ پر اعتبار کیوں نہیں کرتے؟" شیرا اپنے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ نجمی نے کہا۔

"تم نے اپنی مونچھیں کیوں صاف کر دیں؟" شیرے نے سر کو جھٹک کر کہا۔

"ان باتوں کو چھوڑو۔ مونچھیں پھر آ جائیں گی۔ میں نے تمہیں جو کچھ کہا ہے اس کو ذہن میں رکھنا۔ ورنہ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھو گی۔" دروازے پر ٹک ٹک ہوئی شیرے نے گوندی کی طرف دیکھا۔ گوندی نے اٹھ کر کیبن کا دروازہ کھول دیا۔ نرس ٹرے لیے جب اندر داخل ہوئی نجمی کو ہوش میں دیکھ کر وہ مسکرا کر بولی۔

"بیگم صاحبہ کو ہوش آ گیا تھینک گاڈ۔" اس نے ٹمپریچر لیا۔ ڈرپ کو چیک

کیا اور بولی اب انہیں تھوڑا تھوڑا سوپ پلاتا ہو گا۔"

شیرا بڑا مودب ہو کر پاس ہی کھڑا تھا بولا۔" ابھی پلاتا ہوں جی۔ اب بخار تو نہیں ہے ناسسٹر جی؟" نرس سر سے نفی کا اشارہ کرتے ہوئے کیبن سے نکل گئی اس دوران گوندی کا ہاتھ جیب میں ہی رہا اور جیب کے اندر پستول کی نالی کا رخ نجمی کی طرف تھا۔ نجمی نے آنکھیں بند کر لیں اور آہستہ سے کہا۔

"مجھے نیند آ رہی ہے۔" شیرا اور گوندی کیبن کے باہر آ کر کاریڈور میں جنگلے کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔ جہاز کھلے بے کراں سمندر میں اپنی منزل کی طرف چلا جا رہا تھا۔ آخر ایک روز جب سورج طلوع ہوا تو دور سے زمین کی سیاہ لکیر نظر آنے لگی۔ جہاز میں ہر ایک کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ چاٹگام کی بندرگاہ آنے والی تھی۔ دوپہر کے بعد جہاز مشرقی پاکستان کی بندرگاہ سے جا کر لگ گیا۔

نجمی کو ایک بار پھر برقعہ اوڑھا دیا گیا۔ اگرچہ اسے نقاب اٹھانے کی اجازت تھی۔ گوندی اور شیرا نجمی کو درمیان میں لئے جیٹی سے باہر آ گئے۔ نجمی کو معلوم تھا کہ وہ گولیوں کی زد میں ہے۔ لیکن اس نے دل میں عہد کر رکھا تھا کہ وہ پہلا موقع ملتے ہی کسی نہ کسی طرف فرار ہو جائے گی۔ وہ اپنے وطن میں تھی۔ مشرقی پاکستان کی پولیس اس کی ضرور مدد کرے گی۔

گوندی نے ایک ٹیکسی کرائی اور دونوں کو ساتھ لے کر ہوائی اڈے کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ جانتا تھا اسے کہاں جانا ہے۔ شیرے کو اس نے سب کچھ بتا دیا تھا۔ چاٹگام کا ہوائی اڈہ پتینگا شہر سے کافی دور واقع ہے اور اس سے آگے پہاڑی علاقہ شروع ہو جاتا ہے جو ایک طرف کوکس بازار کی طرف اور دوسری طرف کپتائی اور سندربند سے جا ملتا ہے۔ کپتائی کے شمال مشرق میں سنتھال قبیلے کے لوگ آباد ہیں جو چکمہ قبیلے ہی کی ایک شاخ ہیں۔ یہ نیم جنگلی لوگ چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔ یہاں کرنافلی دریا کے پار بھارت کی سرحد شروع ہو جاتی ہے اور یہ جگہ اسمگلروں کی جنت ہے۔

گوندی شیرے اور نجمی کو اسی علاقے میں لئے جا رہا تھا۔ جنگل کا علاقہ شروع ہوا تو گوندی نے ٹیکسی چھوڑ دی اب جنگل میں پیدل سفر شروع ہو گیا یہاں ساگوان بانس اور املی کے درختوں کی بھرمار تھی۔ گوندی اس علاقے میں کئی بار سفر کر چکا تھا۔

وہ یہاں کے چپے چپے سے واقف تھا۔ وہ انہیں ایسے راستوں سے لے کر جا رہا تھا جہاں جنگلی درندوں کا خطرہ نہیں تھا۔ نجمی کبھی جنگلوں میں پیدل نہیں چلی تھی۔ وہ بہت جلد تھک کر بیٹھ گئی۔ شیرا اور گوندی کو بھی رکنا پڑا۔ گوندی نے شیرے کو ایک لے جا کر کہا۔

"ہمیں شام ہونے سے پہلے پہلے یہ جنگل پار کر کے کرنافلی گاؤں پہنچ جانا چاہیئے اگر جنگل میں رات آ گئی تو یہاں شیر بہت ہوتے ہیں جو رات کو ہی اپنے شکار کی تلاش میں نکلتے ہیں۔"

شیرے نے کہا میری بیوی تھک گئی ہے میں اس کو زبردستی تو نہیں چلا سکتا۔ گوندی نے پھنکار کی طرح سانس چھوڑ کر دوسری طرف منہ کر لیا۔ شیرے نے نجمی کو سمجھایا کہ یہ جنگل بڑا خطرناک ہے ہمیں اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے یہاں سے نکل جانا ہو گا۔ نجمی کے لئے شیر اور درندے اتنے خطرناک نہیں تھے جتنے خطرناک اس کو شیرا اور گوندی لگ رہے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کسی طرح ان کو جل دے کر جنگل میں بھاگ کر غائب ہو جائے اور پھر واپس چاٹگام کے کسی پولیس اسٹیشن پہنچ کر قانون کی مدد حاصل کرے وہ اٹھ کر آہستہ آہستہ چل رہی تھی تاکہ شیرے اور گوندی کے پیچھے رہ جائے اور ایسا ہی ہوا۔ وہ ان دونوں کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ درمیان میں تین چار قدم کا فاصلہ ہو گا۔ نجمی کی دونوں جانب جنگل بڑا گھنا تھا۔ درختوں کے تنے ساتھ ساتھ اگے ہوئے تھے اور ان کے جھاڑ اوپر جا کر ایک دوسرے سے کھل مل گئے تھے وہاں دن کے وقت بھی ہلکا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

نجمی اس حقیقت سے پوری طرح باخبر تھی کہ یہ لوگ اسے جنگل میں کسی ایسے مقام پر لئے جا رہے تھے جہاں سے اس کا نکلنا ناممکن ہو جائے گا۔ چنانچہ وہ راستے

ہی میں کسی جگہ سے فرار ہو جانا چاہتی تھی۔ سوچ سمجھ کر آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔۔۔ دائیں بائیں بھی دیکھتی جاتی تھی۔ ایک مقام پر اس کے اور شیرے گوندی کے درمیان جنگلی جھاڑیاں آ گئیں۔ نجمی نے دائیں جانب دیکھا ادھر درختوں کے بیچ میں ایک چھوٹی سی کھائی تھی جس میں جھاڑ جھنکار کی بھرمار تھی۔ یہ کھائی زیادہ گہری نہیں تھی اور پیچھے کی طرف چلی گئی تھی۔

نجمی نے مزید کچھ سوچے سمجھے بغیر کھائی میں چھلانگ دی اسے کھائی کے اوپر شیرے اور گوندی کے دوڑنے اور ایک دوسرے کو پکارنے کی آوازیں سنائی دیں۔ نجمی نے کھائی میں بے تحاشہ پیچھے کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔

○

نجمی اندھا دھند بھاگتی جا رہی تھی۔ اس کے کپڑے جھاڑیوں میں الجھ رہے تھے اس کا دوپٹہ کسی کانٹے دار جھاڑی نے کھینچ لیا تھا۔ کھائی آگے جا کر بائیں جانب مڑ گئی سامنے تھوڑی سی چڑھائی آ گئی نجمی کھائی میں سے باہر نکلی تو سامنے شیرا اور گوندی کھڑے تھے ان میں سے ایک کے ہاتھ میں پستول تھا اور دوسرے کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔

شیرے نے آگے بڑھ کر نجمی کو بازو سے کھینچ کر نیچے گرا لیا اور اسے لاتوں اور گھونسوں سے مارنا شروع کر دیا۔ نجمی کی چیخیں نکل گئیں۔ آج تک کسی نے اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ شیرا اسے گندی گالیاں بھی دے رہا تھا نجمی کا دماغ پھٹنے لگا اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"مجھے معاف کر دو۔۔۔ معاف کر دو۔۔۔ اب نہیں بھاگوں گی۔" گوندی ریوالور لئے چپ چاپ کھڑا تھا۔ شیرے نے نجمی کو بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور غضب ناک لہجے میں بولا۔

"اب تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو میں پستول کی ساری گولیاں تیرے پیٹ میں اتار دوں گا تم مجھے جانتی نہیں ہو میں اب تک تیرے نخرے اٹھا رہا ہوں میں تیرا

خون بھی کر سکتا ہوں۔ روتے روتے نجمی کی ہچکی بندھ گئی تھی اب انہوں نے اسے آگے لگا لیا۔ نجمی کا سارا جسم دکھ رہا تھا۔ اسے کبھی کسی نے نہیں پیٹا تھا اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ وہ بے بس ہو چکی ہے اور اب خدا ہی اسے ان ظالموں کے چنگل سے نجات دلا سکتا ہے۔ وہ نقاہت کے ساتھ چل رہی تھی۔

شیرے نے اسے ایک بار پھر گالی دے کر کہا۔ "سیدھی ہو کر چلو۔" نجمی کو شیرے سے خوف آنے لگا تھا وہ بڑی مشکل سے سیدھی ہو کر چلنے لگی۔ گوندی آگے ہو گیا وہ راہنمائی کر رہا تھا کیونکہ اسے جنگل کے راستوں کا علم تھا۔ دوپہر کے وقت وہ ایک جگہ رک گئے یہاں ایک چھوٹا سا پہاڑی چشمہ بہہ رہا تھا۔

شیرے نے نجمی سے کہا کہ وہ ادھر منہ ہاتھ دھو لے اور خود گوندی کے ساتھ درختوں کی دوسری طرف چلا گیا۔ گوندی کہنے لگا۔ "یہاں ہمیں زیادہ دیر نہیں رکنا۔ تھوڑا بہت کھا پی کر ہمیں آگے چل دینا چاہئے میں چاہتا ہوں کہ شام ہونے سے پہلے پہلے ہم کرنالی گاؤں پہنچ جائیں۔"

گوندی نے تھیلے سے روٹی اور چینی کی شیرے نے کچھ روٹی اور چینی نجمی کو جا کر دی۔ نجمی چشمے کے پاس سر جھکائے بیٹھی تھی شیرے نے محبت سے کہا "میں برا آدمی نہیں ہوں پر تم میری بیوی ہو مجھ سے مقابلہ کرو گی تو میں تیرے ٹکڑے کر دوں گا میری مرضی کے مطابق چلو گی تو تمہیں رانی بنا کر رکھوں گا۔۔۔۔ لو یہ کھا لو ہمارے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے۔"

شیرا ذرا پرے ہٹ کر گوندی کے ساتھ بیٹھ گیا اور روٹی کھانے لگا۔ جنگل میں دور سے کسی جانور کے بولنے کی مسلسل آواز آ رہی تھی۔ چند لمحے آرام کرنے کے بعد ان کا سفر دوبارہ شروع ہو گیا یونہی چلتے چلتے وہ گھنے جنگل سے نکل کر ایسی جگہ آ گئے جہاں درخت دور دور اگے ہوئے تھے اور بائیں جانب پہاڑیوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ فضا میں حبس تھا، ہوا میں ساگوان اور دیودار کے درختوں کی ہلکی ہلکی مہک رچی ہوئی تھی۔

گوندی نے سامنے والے درختوں کی طرف اشارہ کرکے کہا "ان درختوں کے پیچھے اترائی ہے آگے سنتھالوں کی وادی ہے اور اس کے آگے کرنافلی دریا بہہ رہا ہے۔ اسی دریا کے کنارے ہمارے استاد کے منہ بولے بھائی بھلوا کا خفیہ اڈہ ہے تم یہاں چاہے ساری عمر رہنا تمہاری ہوا کی طرف بھی کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔

شیرے نے سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے دور درختوں کی طرف دیکھا اور کہا "تم کس دن واپس جاؤ گے؟" گوندی نے بتایا کہ وہ ہفتہ دس دن ٹھہرے گا۔ نجمی قریب ہی گھاس پر بیٹھی تھی اس کی پسلیاں درد کرنے لگی تھیں۔ وہ اب بے توجہی سے ان کی باتیں سن رہی تھی اس نے اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے کر دیا تھا خدا جانے اب اسے اپنے ماں باپ بھائی اور شبانہ کی شکل دیکھنی نصیب بھی ہو گی یا نہیں اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ شیرے کا رویہ اب سخت ہو گیا تھا اس نے کرخت آواز میں کہا۔

"چلو اٹھو۔" نجمی جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ان کے ساتھ چلنے لگی۔ بھلوا کا خفیہ اڈا ابھی دور ہی تھا کہ درختوں کے پیچھے سے اچانک چار پانچ نیم وحشی کالے کالے آدمی نیزے اٹھائے نکل کر سامنے آ گئے انہوں نے گوندی کو پہچان لیا گوندی نے انہیں سلام کیا۔ ان سے ہاتھ ملایا اور ان کی زبان میں بتایا کہ استاد نے کراچی سے کچھ مہمان بھیجے ہیں بھلوا دادا کے پاس۔۔۔ بھلوا دادا ڈیرے پر ہی ہے کیا؟" نیم وحشی آدمی آگے آگے چلنے لگے۔

دریا کے کنارے کیچڑ اور سال کے گھنے درختوں کے نیچے ایک کھلی جگہ پر چھ سات بانس کی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ ایک طرف زمین سے دو فٹ اونچی مچان اور پتھروں کی دیواروں اور کھپریل کی چھت والا کمرہ بنا ہوا تھا جس کے برآمدے میں بھلوا دھوتی اور واسکٹ پہنے بانس کی چٹائی پر بیٹھا سگار پی رہا تھا۔ اس نے گوندی کو دیکھا تو اٹھ کر گلے ملا استاد کا حال پوچھا۔

گوندی نے کہا "بھلوا دادا! استاد نے یہ دو اپنے مہمان تمہارے پاس بھیجے ہیں یہ تمہارے پاس ہی رہیں گے یہ میاں بیوی ہیں۔" بھلوا نے شیرے سے گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھی اپنا بھائی ہی سمجھو۔۔۔ کیا نام ہے تمہارا؟" شیرے نے اپنا نام بتایا تو بھلوا دادا نے شیرے کے کندھے پر زور سے ہاتھ مار کر کہا۔ "ادھر بھی سندر بن کا شیر کبھی کبھی آ جاتا ہے۔" پھر اس نے نجمی سے کہا۔

"بھابی! ادھر تم بے فکر ہو کر رہنا تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔" گوندی نے الگ لے جا کر شیرے اور نجمی کے بارے میں پوری تفصیلات بیان کر دیں بھلوا دادا ہنس دیا کہنے لگا "پھر کیا ہوا۔۔۔ میاں بیوی نہ بھی ہوں تو کوئی فرق نہیں پڑتا ہم تو یاروں کے یار ہیں یار کی دوست بھی ہماری بھابی ہوتی ہے۔"

بھلوا دادا نے فوراً مچان والے کمرے میں دو پلنگ رکھوا کر مچھر دانیاں لگوا دیں اور مرغیاں کاٹنے کا حکم دیا۔ ایک جھونپڑی سے ایک پکی عمر کی عورت نکل کر نجمی کے پاس آئی اور اسے اپنے ساتھ لے گئی۔ اس نے نجمی کو نہلا دھلا کر ساڑھی پہننے کو دی نجمی کا جسم اب زیادہ دکھنے لگا تھا۔

اس عورت نے کہا "میرا نام مرتھا ہے۔۔۔ تمہارا نام کیا ہے؟ تم تو بڑی خوبصورت ہو۔" نجمی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے کالج میں بھی اس کی سہیلیاں اسے کہا کرتی تھیں کہ تم بڑی خوبصورت ہو۔ ندیم بھی اسے یہی کہا کرتا تھا ندیم کا خیال آتے ہی نجمی کا حلق کڑوا ہو گیا وہ اپنے ماں باپ کو یاد کر کے رونے لگی۔

مرتھا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا "روتی کیوں ہو؟" اچھا سمجھ گئی ابھی تم نئی نئی ہو میں بھی جب پہلی بار یہاں آئی تھی تو بہت رویا کرتی تھی اب میری طرف دیکھو۔۔۔ میں ہر وقت ہنستی رہتی ہوں۔۔۔ میں بہت خوش ہوں۔ بھلوا مجھے بڑا خوش رکھتا ہے۔۔۔ اری تمہارا آدمی تو جوان ہے۔" اور مرتھا قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

ٹھیک اس وقت لاہور میں شبانہ بھی نجمی کو یاد کر رہی تھی وہ اپنی گاڑی میں کالج سے واپس اپنی نہر کنارے والی کوٹھی کینال لاج کی طرف آ رہی تھی۔ نجمی کی گمشدگی اس کے لئے ایک معمہ بن کر رہ گئی تھی اسے لاپتہ ہوئے چار پانچ مہینے ہو گئے تھے۔ اس کے والد کا اسی غم میں انتقال ہو گیا تھا، سوتیلی ماں مکان کو تالا لگا کر اپنے آبائی گاؤں چلی گئی۔

ندیم روزانہ کی طرح کالج آتا تھا کبھی کبھی اس کی ملاقات شبانہ سے ہو جاتی تھی وہ کھویا کھویا سا رہتا تھا اب اسے بہت کم قہقہے لگاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ ایک روز شبانہ اس کے کالج پہنچ گئی شبانہ کی چھٹی حس نے بتا دیا تھا کہ ندیم کو نجمی کی گمشدگی کا علم ہے۔ ندیم شبانہ کو دیکھ کر کچھ گھبرا سا گیا کیونکہ وہ خاص طور پر اسے ملنے آئی تھی "میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتی ہوں ندیم" ندیم سمجھ گیا کہ وہ اس سے کیا باتیں کرنا چاہتی ہے وہ کینٹین میں جا کر بیٹھ گئے۔

شبانہ نے بات شروع کرتے ہی پوچھا "ندیم تم مجھے بتاتے کیوں نہیں کہ نجمی کہاں ہے؟ میں بھی تمہاری طرح اس سے محبت کرتی ہوں۔ . . وہ میری ایک ہی سہیلی تھی میں وعدہ کرتی ہوں کہ تم مجھے جو کچھ بتاؤ گے میں اس کا ذکر کسی سے نہیں کروں گی۔"

ندیم کا دل بھی نجمی کے ساتھ کی گئی زیادتی پر اسے ہر وقت ملامت کرتا رہتا تھا وہ بھی چاہتا تھا کہ کسی کے سامنے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرے اور شبانہ سے بہتر اور کوئی انسان اس کے لئے موزوں نہیں تھا پھر بھی ندیم نے قسم دے کر شبانہ سے وعدہ لیا کہ وہ کسی سے کوئی بات نہیں کرے گی پھر اس نے شبانہ کو نجمی کے بارے میں ایک ایک بات بیان کر دی۔

شبانہ تو اس کا منہ تکتی رہ گئی جب ندیم چپ ہو گیا تو اس نے کہا "تم نے نجمی کو تلاش کیوں نہیں کیا؟" ندیم گہرا سانس کھینچ کر بولا۔

"شبانہ! میں نے کراچی کا کونہ کونہ چھان مارا۔ . . میرے دوست زمان نے بھی نجمی کی تلاش میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ کسی بردہ فروشوں

گروہ کے ہتھے چڑھ گئی ہے۔" شبانہ نے کہا۔

"اور تم اپنے دوست زمان پر ذرا سا بھی شک کرنے کو تیار نہیں ہو . . . . . مجھے یقین ہے کہ یہ ساری اسکیم اسی کی تیار کی ہوئی تھی نجمی کو اسی نے گم کیا ہے ضرور اس کا تعلق پیشہ ور بردہ فروشوں سے ہے وہ جرائم پیشہ آدمی ہے تمہیں اس کے خلاف پولیس میں مقدمہ درج کرانا چاہیے تھا۔"

ندیم نے جلدی سے کہا" خدا کے لئے ایسا پھر مت کہنا شبانہ۔ . . وہ ایسا نہیں ہے اس نے تو میری شادی کا سارا بندوبست کر رکھا تھا اور پھر اگر میں اس کے خلاف مقدمہ درج بھی کرا دوں تو کس بناء پر؟ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔"

شبانہ سر جھکا کر گہری سوچ میں گم ہو گئی۔ اب تک نجمی نہ جانے کہاں کی کہاں پہنچ چکی ہو گی اس نے ندیم سے کہا۔

"ندیم! تم برا مت ماننا۔ . . مگر میں کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ تم نے نجمی کی زندگی ہی برباد نہیں کی بلکہ اس کے سارے خاندان کو تباہ کر دیا ہے تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تم اسے گھر سے بھاگنے کے لئے کہو اور پھر اسے بھگا کر ساتھ لے جاؤ تم نے اس کے ساتھ ایسا ظلم کیا ہے کہ میں تمہیں اب کیا کہوں۔" ندیم نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"شبانہ بہن! میرا ضمیر مجھے ہر وقت کچوکے لگاتا رہتا ہے رات کو نجمی کا خیال آتا ہے تو میں اٹھ کر بیٹھ جاتا ہوں مجھے ایک پل چین نہیں پڑتا تم مجھے ایسا نہ کہو میں . . . میں نے تو صرف نجمی سے شادی کرنے کے لئے یہ سب کچھ کیا تھا۔ . . مجھے کیا خبر تھی کہ اس کا ایسا المناک نتیجہ نکلے گا۔" شبانہ نے کہا۔

"اب تمہارا فرض ہے کہ ایک بار پھر کراچی اپنے جرائم پیشہ دوست زمان کے پاس جا کر ایک نئے زاویے سے نجمی کا سراغ لگانے کی کوشش کرو۔ . . میرا دل گواہی دیتا ہے کہ زمان کو معلوم ہے نجمی کہاں ہے کیونکہ وہ جہاں بھی ہے اسے وہاں زمان نے ہی بھجوایا ہے۔"

ندیم خالی خالی نظروں سے کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا پھر وہ جیسے اپنے آپ بولا۔ ”زمان ایسا نہیں کرسکتا۔۔۔ زمان ایسا نہیں کرسکتا۔“ شبانہ نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”وہ کرسکتا ہے۔۔۔ تم صرف ایک سال سے اس کے دوست ہو مجھے یقین ہے کہ اسی نے اسکیم بنا کر نجمی کو گم کیا ہے تم ایک بار کراچی جا کر پتہ تو کرو۔۔۔ یہ تمہارا فرض ہے ندیم۔۔۔ نجمی کی زندگی کی تباہی کی آدھی ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے۔“

ندیم قائل ہوگیا۔ اب اس کا ذہن بھی اس طرح سوچنے لگا کہ بہت ممکن ہے زمان کے کسی ساتھی کی نیت خراب ہوگئی ہو اور اس نے دھوکے سے نجمی کو اغوا کرلیا ہو اسے کراچی جا کر زمان سے اس انداز میں ۔۔۔ کرنی چاہیئے زمان کی نیت پر اب بھی ندیم کو کسی قسم کا شک نہیں تھا اس نے شبانہ سے کہا۔

”شبانہ بہن! میں اسی ہفتے کالج سے چھٹی لے کر کراچی چلا جاؤں گا اور از سر نو تحقیقات کروں گا۔۔۔ اگرچہ زمان ایسا کبھی نہیں کرسکتا لیکن یہ کام اس کے کسی ساتھی کا بھی ہوسکتا ہے تم مطمئن رہو میں اس بار نجمی کا سراغ لگا کر ہی واپس آؤں گا۔“

شبانہ نے ندیم کے اس عزم کو سراہا اور اٹھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”میں اگلے ہفتے تمہیں ملوں گی خدا کرے کہ تم نجمی کو برآمد کرانے میں کامیاب ہوجاؤ۔۔۔ سنو! اگر کراچی پولیس کی مدد لینی پڑے تو ہچکچانا نہیں۔۔۔ قانون آخر قانون ہوتا ہے پولیس ضرور تمہاری مدد کرے گی۔“

شبانہ واپس اپنے کالج چلی آئی۔ کالج سے وہ دوپہر کے وقت فارغ ہو کر اپنی کوٹھی کی طرف روانہ ہوگئی۔ جون کے دن تھے نہر کنارے پاپلر کے درخت ہرے ہرے پتوں سے بھر گئے تھے۔ گرم لو چل رہی تھی ابھی ساون شروع نہیں ہوا تھا۔ شدید تپش کی وجہ سے مال اور کینال بینک کی سڑکیں پیدل چلنے والوں سے تقریباً خالی تھیں نہر میں ضرور کچھ لڑکے چھلانگیں لگا رہے تھے۔ اپنی کوٹھی کینال لاج والا چھوٹا سا پل عبور کرتے ہوئے شبانہ کی نظر سامنے املتاس کے درخت پر پڑی املتاس کی شاخوں سے

زرد رنگ کے پھولوں کے گچھے لٹک رہے تھے۔ شبانہ کی گاڑی درخت کے قریب سے گزری تو اسے املتاس کی گہری گہری گرم خوشبو آئی۔ دھوپ، تپش اور لو کی وجہ سے املتاس کے درخت کے گرد اس کے زرد پھولوں کی بسنتی روشنی سی پھیلی ہوئی تھی۔ شبانہ نے گاڑی گیراج میں بند کی اور درختوں کے نیچے سے گزرتی کوٹھی کے ٹھنڈے برآمدے میں آگئی۔

دروازہ کھول کر سٹنگ روم میں آئی تو اس کی نظر اپنے والد اور بڑے بھائی عقیل پر پڑی وہ دونوں سر جوڑے کونے والے صوفے پر سامنے کوئی فائل کھولے بیٹھے تھے انہوں نے شبانہ کی طرف ایک لمحے کے لئے بھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ شبانہ سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں آگئی کمرے کا اے سی چل رہا تھا۔ فضا میں بڑی، لطیف خوشگوار خنکی تھی۔ باہر اور اندر کی فضا میں زمین و آسمان کا فرق تھا اسے ایسے لگا جیسے وہ صحراؤں کی تپتی دھوپ سے نکل کر اچانک کسی پرفضا ٹھنڈے پہاڑی مقام پر آگئی ہو۔ باتھ روم میں جا کر اس نے منہ ہاتھ دھویا، بالوں میں برش پھیرا دوسرے کپڑے بدلے اور کچن کی طرف جا رہی تھی کہ دوسری منزل کی راہداری میں اسے بھابی مل گئی۔ اس نے کہا۔

”کھانا میرے کمرے میں ہی کھا لینا ——— کھانا لگ گیا کیا؟“ شبانہ نے پوچھا۔

”ہاں“ بھابی نے دھیمی آواز میں کہا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ شبانہ بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر آگئی۔ میز پر کھانا لگ چکا تھا بھابی کچھ چپ چپ سی تھی۔ ابو اور بھائی بھی کسی معاملے میں الجھے ہوئے لگتے تھے۔ شبانہ نے کھانے کی میز پر بیٹھتے ہوئے بھابی سے پوچھا۔

”آج گھر میں سب چپ چپ سے ہیں۔۔۔ خیریت تو ہے نا بھابی؟“ بھابی کی زبانی شبانہ کو معلوم ہوا کہ کاروبار میں زبردست نقصان ہوگیا ہے اور حکومت کی طرف سے نوٹس ملا ہے کہ اگر پندرہ دنوں کے اندر اندر سرکار کے خزانے میں دس لاکھ روپے جمع نہ کرائے گئے تو ساری جائیداد قرق کرلی جائے گی اگر جائیداد کی قرقی سے بھی حکومت کی مطلوبہ رقم پوری نہ ہوئی تو جیل کی ہوا کھانی پڑے گی۔

شبانہ بے انتہا پریشان ہو گئی وہ کھانا نہ کھا سکی بیچھے اپنے ابوا ور بھائی کے پاس آ گئی معلوم ہوا کہ بھابی ٹھیک کہہ رہی تھی۔ شبانہ کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس کے ابو اور بھائی کو سرکاری ٹھیکیداری میں یہ نقصان کیوں اور کیسے ہوا وہ تو اس لئے پریشان تھی کہ اس کے پیارے ابوا ور بھائی پر بہت بڑی مصیبت آن پڑی تھی۔ اس زمانے میں دس لاکھ کی رقم کوئی معمولی رقم نہیں تھی۔ ابو اور بھائی کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ ابو تو بار بار پانی پی رہے تھے۔

شبانہ نے انہیں حوصلہ دینا چاہا تو وہ بولے "بیٹی! یہ کوٹھی اور شہر والا مکان بیچ کر بھی چھ ساڑھے چھ لاکھ روپے کی ضرورت ہو گی۔" پھر آہ بھر کر بولے۔

"بینک بھی ہمارا اعتبار کرنے کو تیار نہیں ہے اب تو ظفر کو امریکہ فون کرنا پڑے گا اس مصیبت میں شاید وہی ہماری کچھ مدد کر سکے واشنگٹن میں آج کل اس کا لاکھوں ڈالر کا کاروبار ہے ہم صرف اس سے قرض حسنہ ہی لیں گے اللہ نے چاہا تو بہت جلد رقم اسے واپس کر دیں گے۔"

شبانہ کے دل کو چوٹ سی لگی وہ نہیں چاہتی تھی کہ ظفر ایسے آدمی کا احسان لیا جائے مگر وہ اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ اپنے ابو اور بھائی کو اس ارادے سے باز رکھ سکتی۔ ان کے پاس بھی دوسرا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ دس لاکھ کی رقم انہیں کوئی بھی قرض نہیں دے سکتا تھا اسی روز ظفر کو واشنگٹن فون کیا گیا۔

شبانہ کے ابو نے اسے صورتحال سے باخبر کیا تو وہ سمجھ گیا کہ یہ لوگ اس کے دام میں اپنے آپ آ گئے ہیں۔ روپے پیسے کی ظفر کے پاس کمی نہیں تھی وہ کاروباری آدمی تھا اور شبانہ کے ابو اور بھائی سے بھی وہ کاروبار کرنا چاہتا تھا مگر اسے شبانہ کو نیچا دکھانے کا نادر موقع مل گیا تھا اس نے کہا میں لاہور پہنچ رہا ہوں وہاں آ کر بات کرونگا۔" تین دن کے بعد ظفر لاہور پہنچ گیا۔ شبانہ کالج میں تھی کالج سے واپس آئی تو ظفر ڈرائنگ روم میں بیٹھا اس کے ابو اور بھائی سے باتیں کر رہا تھا۔

شام تک یہ میٹنگ ہوتی رہی بعد میں بھابی کی زبانی شبانہ کو پتہ چلا کہ ظفر نے

شبانہ کے ابو کو دس لاکھ کی رقم بھیجنے کی حامی بھر لی ہے لیکن اس کے عوض اس نے اندرون شہر والا مکان اور کینال بینک والی کوٹھی کینال لاج اپنے نام لکھوائی ہے۔ شبانہ کے ابو نے یہ جائیداد اس لئے بھی ظفر کے نام کر دی کیونکہ شبانہ کی شادی اس کے ایم اے کرنے کے بعد ظفر سے ہونے ہی والی تھی۔

رات کے کھانے پر سبھی لوگ جمع تھے ظفر بڑا خوش تھا۔ شبانہ کے ابو اور بھائی، عقیل خوشامد کی حد تک ظفر کی تعریف کر رہے تھے۔ ظفر پہلے سے زیادہ صحت مند ہو گیا تھا اس کا لباس بھی بہت قیمتی تھا مگر آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے وہ کنکھیوں سے شبانہ کی طرف یوں دیکھ لیتا تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ اب میں دیکھوں گا کہ تمہیں مجھے تھپڑ مارنے کی جرأت کیسے ہوئی تھی۔ شبانہ کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بری طرح جکڑ دی گئی ہے اور اسے ماں باپ اور خاندان کی عزت کی قربان گاہ پر چڑھا دیا گیا ہے۔ پہلے اس کا ارادہ تھا کہ وہ ظفر کے ساتھ شادی سے انکار کر دے گی اور بھائی اور ابو کو منا لے گی مگر اب وہ خواہش کے باوجود ایسا نہیں کر سکتی تھی۔

اسے ظفر کی زر خرید لونڈی بنا دیا گیا تھا وہ اس کے سامنے زبان بھی نہیں کھول سکتی تھی اس نے شبانہ کے باپ اور بھائی کو جیل سے بچا لیا تھا اور چاہے دونوں مکان اپنے نام کروا لئے تھے لیکن ان کے عوض دس لاکھ روپے کی ادائیگی کی حامی بھر لی تھی جو انہیں کوئی دوسرا آدمی نہیں دے سکتا تھا۔ کھانے کی میز پر ظفر نے کئی بار شبانہ سے بات کرنے کی کوشش کی مگر شبانہ بیزاری سے ہوں ہاں کہہ کر چپ ہو گئی۔

کھانے کے بعد شبانہ لان میں اپنی بھابی کے پاس بیٹھی جوس پی رہی تھی کہ ظفر امریکی قمیض پتلون میں سگریٹ منہ میں دبائے آن حاضر ہوا۔ "ہائے لیڈیز!" شبانہ کو اس کا انداز تخاطب زہر لگا۔ بھابی آہستہ سے مسکراتی ہوئی اٹھ کر چلی گئی۔۔۔ کیونکہ بہرحال شبانہ اور ظفر کی منگنی ہو چکی تھی اور اب تو شادی لازمی بن گئی تھی۔ ظفر آرام کرسی پر دھپ سے بیٹھتے ہوئے بولا۔ "یہاں گرمی زیادہ ہے واشنگٹن میں موسم اتنا گرم نہیں ہوتا۔"

شبانہ خاموشی سے جوس کا گلاس ہاتھ میں لئے سامنے دیکھتی رہی۔ ظفر نے ذرا آگے

جھک کر کہا "میں چاہتا ہوں اگر موسم بہار میں تم میرے پاس واشنگٹن آجاؤ۔" شبانہ نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا۔ ظفر نے سگریٹ گھاس پر پھینک کر اسے پاؤں سے مسل دیا اور بولا۔

"اب تمہیں واشنگٹن آنے سے کوئی نہیں روک سکے گا ویسے میں نہیں چاہتا کہ تم ایم اے کے فائنل ایئر کا امتحان دو اس کی ضرورت نہیں ہے۔" شبانہ کے کان گرم ہو گئے وہ اندر اندر ہی کھولنے لگی آخر وہ نہ رہ سکی اس کے منہ سے نکل ہی گیا۔

"تم کون ہوتے ہو مجھ پر حکم چلانے والے؟ میں ایم اے کروں چاہے نہ کروں۔۔۔" ظفر ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اس نے دانت چباتے ہوئے کہا "میں کون ہوتا ہوں۔۔۔ یہ اپنے ابوجان سے پوچھنا تم ایم اے نہیں کرو گی۔" اور یہ کہہ کر ظفر تیز تیز قدم اٹھاتا لان سے چلا گیا۔ شبانہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے وہ ابوجان سے کیا پوچھتی اسے تو سب کچھ معلوم تھا اسے اپنے جسم کے ساتھ لپٹی ہوئی زنجیروں کی جھنکار سنائی دینے لگی تھی یہ وہ زنجیریں تھیں جن کو شبانہ زندگی بھر نہیں توڑ سکتی تھی۔ ظفر واپس چلا گیا اسی ہفتے ظفر نے دس لاکھ روپے بینک کے ذریعے بھجوا دیئے اس روز گھر میں ہر کوئی خوش و خرم تھا۔

ابو کو تو جیسے نئی زندگی مل گئی تھی ان کے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے تھے۔ بھائی بھی بے حد خوش تھا اسی روز رقم سرکاری خزانے میں جمع کرا دی گئی اور شبانہ کے ابو اور بھائی تباہی کے گڑھے میں گرتے گرتے بچ گئے۔ ظفر نے واشنگٹن پہنچ کر روپے بھیجنے کے بعد شبانہ کے ابو کو لکھ بھیجا کہ وہ جلدی شادی کرنا چاہتا ہے شبانہ کو ایم اے کرنے کی کوئی ضرورت نہیں آگے پڑھائی وہ امریکہ میں آ کر بھی پوری کر سکتی ہے۔

ظفر کی خواہش اب حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ ابو اور بھائی نے شبانہ کو صاف صاف کہہ دیا کہ اسے لاہور میں ایم اے کرنے کی بجائے واشنگٹن جا کر ایم اے کرنا ہو گا کیونکہ ظفر وہاں بالکل اکیلا ہے۔ شبانہ گم سم ہو کر رہ گئی وہ کیسے انکار کر سکتی تھی۔ ظفر اس کے چھوٹے بھائی عامر کے بھی تعلیمی اخراجات برداشت کر رہا تھا جو کیلے فورنیا یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا شبانہ نے اپنے آپ کو باپ اور بھائیوں پر قربان کر دیا اور ابو سے کہا کہ وہ جب کہیں گے وہ کالج جانا چھوڑ دے گی۔ ظفر کو ٹیلی فون کیا گیا کہ وہ شادی کے لئے کب لاہور آ سکتا ہے۔

اس نے چھ ماہ بعد کی ایک تاریخ دے دی ایک اعتبار سے شبانہ کی شادی کا دن پکا ہو گیا۔

اس رات شبانہ اپنے بستر میں بہت روئی اسے اپنی والدہ اور بہن غزالہ یاد آئی جو اگر زندہ ہوتیں تو شاید حالات کی شکل یہ نہ ہوتی۔ پھر اسے راحیل کا خیال آیا مگر راحیل تو ایک خیال پرست ہیولا تھا وہ کون تھا، کہاں سے آتا تھا، کہاں چلا جاتا تھا؟ شبانہ کو کچھ علم نہیں تھا وہ اس سے کیا توقع لگا سکتی تھی اور اگر وہ چاہتا بھی تو شبانہ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا وقت گزرتا چلا گیا۔

ندیم اس عرصہ میں نجمی کی تلاش میں کراچی جا چکا تھا۔ وہ سیدھا زمان کے ہوٹل میں گیا۔ زمان نے اسے آتا دیکھا تو بڑے تپاک سے ملا اور فکر مند چہرہ بنا کر پوچھنے لگا "بھابی کا کوئی پتہ چلا؟" ندیم نے کہا۔

"زمان بھائی! میں اسی لئے ایک بار پھر تمہارے پاس آیا ہوں۔۔۔ نجمی تو ایسے گم ہو گئی ہے کہ جیسے اسے آسمان کھا گیا ہو اس کے والد کا پیچھے انتقال ہو گیا ہے۔ سوتیلی ماں اپنے بیٹے کو لے کر گاؤں جا کر آباد ہو گئی آخر وہ کب تک رشتے داروں اور محلے والوں کے طعنے سن سکتی تھی میں نے تو سوچا ہے کہ یہ معاملہ پولیس کو دے دوں۔" زمان چوکس ہو گیا بولا۔

"ندیم۔۔۔ میرے دوست۔۔۔ میرے بھائی پولیس والوں کو کیس دینے سے بڑی بدنامی ہو گی اور پھر تمہارے پاس کوئی ثبوت بھی نہیں ہے کہ نجمی یہاں سے گم ہوئی ہے دیکھو نا۔۔۔ میں کاروباری آدمی ہوں اگر پولیس مجھ سے آ کر پوچھے گی تو بھائی مجھے اپنا کاروبار بچانے کے لئے یہی کہنا پڑے گا کہ میں نے اس نام کی عورت کو کبھی دیکھا تک نہیں۔۔۔ پولیس تمہیں بھی گھسیٹتی پھرے گی پھر تم نجمی کو اغواء کر کے لائے تھے تم پر بھی کیس چل پڑے گا بہت سی باتیں تمہیں سوجھی ہوں گی؛ اس کے باوجود یہ کوئی گارنٹی نہیں ہے کہ نجمی برآمد کر لی جائے گی۔" ندیم کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔

"مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ نجمی کو اسی ہوٹل کے کسی آدمی نے اغواء کیا ہے۔" زمان نے میز پر مکا مارتے ہوئے کہا۔

"خدا کی قسم اگر میرے ہوٹل کا کوئی آدمی تمہاری طرف یا تمہاری بیوی کی طرف میلی آنکھ سے بھی دیکھے تو میں کھڑے کھڑے اس کی آنکھیں نکال دوں۔۔۔ اس کی کھال کھینچ کر رکھ دوں گا۔" اس نے سر کو نفی میں ہلا کر بڑے اعتماد سے کہا۔

"نہیں میرے دوست! یہ کسی باہر کے آدمی کا کام ہے کوئی تمہارے پیچھے یقیناً لاہور سے ہی لگا ہوگا اسے معلوم ہوگا کہ تم لاہور سے بھاگ کر کراچی جا رہے ہو۔۔۔ وہ موقع کے انتظار میں رہا جونہی نجمی بھابی اکیلی ہوٹل سے ذرا دور گئیں اس آدمی نے اسے وہیں دبوچ لیا اتنے دن ہو گئے ہیں یہ کسی تجربے کار گینگ کا ہی کام ہو سکتا ہے میرا کوئی آدمی ایسا کرتا تو وہ ضرور کچھ دنوں کے لئے یہاں سے غیر حاضر ہو جاتا جبکہ ایسا نہیں ہے میرے سب آدمی اسی جگہ ہوٹل میں موجود ہیں۔

ندیم چپ ہو گیا وہ بھ کہہ سکتا تھا اسے تو زمان کے سارے آدمیوں کی پوری طرح سے شناخت بھی نہیں تھی۔ وہ اسی کے ہوٹل میں ٹھہرا تھا اسی ہوٹل کے ایک کمرے میں اس کی شادی ہونے والی تھی کہ آسمان سے جیسے بجلی گری اور حجلہ عروسی برباد ہو گیا دلہن غائب ہو گئی اسے زمین کھا گئی یا آسمان نے اٹھا لیا۔

ندیم شکستہ دل لئے دیر تک اپنے کمرے کے پلنگ پر بیٹھا نجمی کو یاد کرتا رہا کہ خدا جانے وہ بدنصیب لڑکی کہاں ہو گی اپنے آپ کو وہ نجمی کی تباہی کا ذمہ دار ٹھہرانے میں حق بجانب تھا اگر وہ اسے مجبور نہ کرتا تو نجمی کبھی اس کے ساتھ گھر سے نہ بھاگتی۔ اس نے نجمی کو مجبور کیا تھا لیکن وہ تو شادی کر کے فوراً واپس اپنے ماں باپ کے پاس جانا چاہتا تھا مگر ہمارے معاشرے میں کسی لڑکی کا گھر سے بھاگنا کوئی معمولی بات نہیں ہوتی اور یہ معمولی بات تھی بھی نہیں نجمی نے بہت بڑی حماقت کی تھی۔ زندگی میں آ کر اپنے گھر سے بھاگ کر جو لڑکی سوسائٹی سے ایک بار جبڑیا کا بچہ نیچے گر پڑے پھر اسے کبھی گھونسلے کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوتا۔

نوکر ندیم کے لئے کھانا لے آیا ندیم کو بالکل بھوک نہیں تھی مگر جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے تھوڑا بہت کھانا ضروری تھا۔ نوکر کھانا رکھ کر جانے لگا تو ندیم نے یونہی اس

سے پوچھا اس ہوٹل میں کتنے نوکر کام کرتے ہیں؟ اس نے تھوڑی سی تعداد بتائی ندیم کو ان آدمیوں کا خیال آ گیا جو نجمی سے اس کے نکاح کے وقت بطور گواہ اچکنیں پہن کر سروں پر ٹوپیاں جما کر آئے تھے وہ بھی زمان کے اپنے آدمی ہی تھے ان میں سے کوئی آدمی ندیم کو کل سے ہوٹل میں دکھائی نہیں دیا تھا اس نے نوکر سے پوچھا۔

"زمان صاحب کے اپنے آدمی بھی ہوٹل میں ہی رہتے ہیں۔" نوکر نے کہا

"صاحب جی یہ تو مجھے معلوم نہیں جی۔" اور وہ کمرے سے نکل گیا۔ ندیم کو اب خیال آنے لگا کہ زمان کے اپنے آدمی کہاں ہیں۔ ان میں سے ابھی تک اسے کوئی ایک بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہ کھانا کھانے کے بعد نیچے لابی میں آ گیا کاؤنٹر پر زمان کی جگہ ایک نوکر بیٹھا تھا لوگ ہوٹل میں کھانا کھا رہے تھے یا کھانا کھا کر جا رہے تھے۔ ندیم کاؤنٹر کے پاس بچھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا تھوڑی دیر بعد جب رش کم ہوا تو ندیم نے کاؤنٹر پر موجود نوکر سے پوچھا۔

"زمان صاحب کہاں گئے ہیں۔" نوکر نے کہا۔

"وہ شاید سکھر گئے ہیں صبح تک واپس آ جائیں گے۔" ندیم سوچنے لگا یہ شخص اچانک سکھر کیوں روانہ ہو گیا ہے؟ کچھ دیر کاؤنٹر کے پاس بیٹھے رہنے کے بعد ندیم ہوٹل کی سیڑھیاں اتر کر باہر چھوٹے سے باغیچے میں آ گیا موسم گرم تھا مگر تھوڑی دیر پہلے ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی چوکیدار چارپائی پر اکڑوں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ ندیم کو اس نے کئی بار زمان کے ساتھ دیکھا تھا وہ اسے اپنے مالک کا گہرا دوست سمجھتا تھا۔ ندیم اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد کہا۔

"بابا! پچھلی دفعہ میں آیا تھا تو زمان صاحب کے کچھ دوست یہاں ملتے تھے۔ اس بار ان میں سے ایک بھی نظر نہیں آ رہا۔ یہ لوگ زمان صاحب کے ساتھ ہی سکھر گئے ہیں کیا۔" چوکیدار بولا۔

"صاحب تو اکیلا ہی سکھر گیا ہے۔ ویسے صاحب کے دوستوں میں سے سبھی یہاں آتے جاتے رہتے ہیں۔ تم کل لاہور سے آئے ہو۔ پرسوں وہ سب لوگ یہاں موجود تھے۔ ہاں ان میں سے شیرا اب دکھائی نہیں دیتا۔" ندیم کے کان کھڑے ہو گئے۔ مگر اس نے بڑے

بھولپنے سے پوچھا۔ "شیرا ابھی یہیں کہیں ہوگا۔" چوکیدار نے کہا۔

"یہاں ہوتا تو ضرور آتا۔ وہ تو یہاں آئے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ پچھلے کئی ماہ سے وہ غائب ہے۔" ندیم نے بظاہر بے تعلقی سے پوچھا۔ "وہ بیمار ہوگا۔ اپنے گھر لاہور یا حیدرآباد چلا گیا ہوگا۔" چوکیدار نے کہا۔

"اس کا تو یہی ہوٹل گھر تھا۔ اسی ہوٹل کے کمرے میں رہتا تھا وہ۔ میرا خیال ہے زمان صاحب نے اسے کسی لمبے پھیرے پر باہر بھیجا ہے۔" ندیم نے پوچھا۔ "یہ پھیرا کیا ہوتا ہے بابا۔" اب چوکیدار کو احساس ہوا کہ وہ ایسی باتیں کہہ گیا ہے جو اسے نہیں کرنی چاہیئے تھیں اس نے زور سے کھنکار کر کہا۔ "ہوٹل کے لئے پنجاب سے گھی اور آٹا لینے ہمارے اپنے آدمی ہی جاتے ہیں شیرا ابھی ادھر ہی گیا ہوگا۔"

اور چوکیدار اٹھ کر پانی پینے کے بہانے دوسری طرف چلا گیا۔ ندیم کو ایک اشارہ ضرور مل گیا تھا کہ زمان کے اپنے ساتھیوں میں سے ایک آدمی شیرا غائب ہے اور زمان کے آدمی کسی جگہ پھیرا لگانے بھی جاتے ہیں ندیم کو کبھی کبھی یہ خیال ضرور آتا تھا کہ اس کا دوست زمان ایک چھوٹے سے ہوٹل کا مالک ہوتے ہوئے اتنے ٹھاٹھ باٹھ سے زندگی بسر نہیں کر سکتا جبکہ ہوٹل میں مسافر بھی اتنے نہیں آتے تھے۔

ندیم نے اس سلسلے میں مزید سراغ لگانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے پیچھے اپنے کالج میں مزید چھ دن کی چھٹی کا تار روانہ کر دیا۔ شبانہ پہلے بھی کالج میں صرف نجمی کے ساتھ ہی تھوڑا ہنس کھیل لیا کرتی تھی۔ نجمی کی گمشدگی کے بعد اس نے کسی سہیلی سے زیادہ میل جول نہیں بڑھایا تھا لیکن اب جبکہ اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ ایم اے کا اگلا فائنل سال مکمل نہ کر سکے گی تو وہ اداس اداس رہنے لگی۔ ظفر کو شبانہ کے ایم اے کرنے یا نہ کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ صرف اس کی انا کو شکست دینا چاہتا تھا۔ وہ صرف اس کی شخصیت کی خود پسندی اور وقار کو دو ٹکڑے کرنا چاہتا تھا۔

شبانہ اب کالج کے در و دیوار ٹھنڈے پرسکون برآمدوں، سبزہ زار اور کیفے ٹیریا کے باہر اُگے ہوئے سایہ دار گھنے درختوں اور پھولوں کے ننھے ننھے پھولوں سے کو تکتی

راہداریوں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتی۔ اسے معلوم تھا کہ کچھ دنوں کے بعد یہ تمام مناظر اور پرسکون تعلیمی فضا اس سے ہمیشہ کے لئے چھین لی جائے گی اور اس کے پاس صرف یہاں کی یادیں ہی رہ جائیں گی۔ اس وقت شبانہ کے دل میں خیال آتا کہ کاش وہ دنیا میں اکیلی ہوتی اس کے کوئی ماں باپ نہ ہوتے بہن بھائی نہ ہوتے۔ اسے کسی بت کے آگے قربانی کا بکرا نہ بننا پڑتا۔ آخر اسے کس جرم کی سزا مل رہی تھی؟ کیا اس جرم کی سزا مل رہی تھی کہ وہ قدرت کے حسن اور کائنات کی خوبصورتی کی عاشق تھی اور اس نے اپنے ذہن میں حسن، پاکیزگی، سچائی اور آٹے چاول کی دنیا سے دور لطیف جذبوں کا ایک آئیڈیل بنایا ہوا تھا؟ کیا اس لئے کہ اس نے دنیا داری کے تالاب کی دلدل سے کنول پھول کی طرح اپنا چہرہ باہر نکال رکھا تھا؟

اگر دلدل کے اندر رہنے والوں کو زندہ رہنے کا حق ہے تو دلدل سے باہر رہنے والوں کو بھی زندہ رہنے کا اتنا ہی حق ہے۔ شبانہ اپنے لطیف خوابوں اور روحانی خیالات میں رہنے والی لڑکی تھی۔ اس دنیا سے اس کا رشتہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس کے باوجود شبانہ کو اپنے ماں باپ کے جذبوں خیالوں اور خوابوں کا بے حد احترام تھا۔ وہ جانتی تھی کہ کچھ جذبے کچھ روایتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جنہیں خواہش کے باوجود بھی کبھی نہیں توڑنا چاہیئے۔ اس نے اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے جذبات کا ہمیشہ احترام کیا تھا اور وہ مرتے دم تک اسی اصول پر قائم رہنا چاہتی تھی۔ چنانچہ ظفر کے ایماء پر شبانہ کے ابو نے اسے جو حکم دیا۔ شبانہ نے سر خم تسلیم کر لیا تھا زندگی کے بعض مقام ایسے ہوتے ہیں کہ جہاں انسان کی ہار میں ہی اس کی فتح ہوتی ہے۔

شبانہ کو اب راحیل کی یاد شدت سے آنے لگی تھی۔ وہ اس کے قریب بیٹھ کر اس کے پائپ اور سرخ گلاب کی پنکھڑیوں سے نکلتی خوشبو محسوس کرنا چاہتی تھی۔ وہ اس کی باتیں سننا چاہتی تھی جو اس دنیا کی باتیں نہیں تھیں۔ شبانہ کو وہ جنت کی باتیں محسوس ہوتی تھیں یعنی اس دنیا سے بہت دور۔ ۔ کسی ایسی سرزمین کی باتیں کہ جہاں زمین نہیں تھی۔ پھول بھی نہیں تھے۔ جہاں خوشبو پھولوں کی کثافت تھی جہاں روشنی زمین کی ... جہاں

صرف ایک احساس تھا خوشبو کا احساس، روشنی کا احساس، سچائی، پاکیزگی اور حسن بے پرداہ کا احساس۔ شبانہ کئی بار لاہور کی لائبریری میں بھی گئی مگر اسے راحیل کے پائپ کی خوشبو نہ آئی۔ ایک روز آسمان پر کالی گھٹائیں چھا گئیں اور ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں۔ شبانہ کا چہرہ کالی گھٹاؤں، ٹھنڈی ہواؤں میں اڑتی املتاس کے زرد پھولوں کی خوشبو اور مکانوں، کمروں سے نکلتی چائے کی مہک کے احساس سے چمک رہا تھا۔ وہ گاڑی نکال کر کینال بینک پر آئی تو ایک سرخ رنگ کی کار اس کے قریب سے ہو کر گزر گئی۔ شبانہ چونکی۔ اسے یوں لگا جیسے کار راحیل چلا رہا تھا۔ اس نے وہیں سے گاڑی ٹرن کی اور سرخ کار کے پیچھے تیز رفتاری سے چلی۔

سرخ گاڑی شبانہ کی نگاہ میں تھی۔ کینال بینک کی پاپولر کے درختوں میں گھری ہوئی سڑک دور تک ویران تھی۔ ساون کی ابر آلود فضا میں درختوں کی شاخیں ٹھنڈی ہواؤں میں دھیرے دھیرے لہرا رہی تھیں۔ بھری ہوئی نہر کا ریتیلا ٹھنڈا پانی سکون سے بہہ رہا تھا۔ شبانہ کو یقین تھا کہ سرخ کار میں اس نے راحیل کو دیکھا ہے۔ وہی چوڑے شانے، یونانی ناک سیاہ بالوں میں لہراتی سفید بالوں کی جھلک اور ہونٹوں میں دبا ہوا آبنوسی پائپ۔۔۔۔
یہ سوائے راحیل کے اور کون ہو سکتا تھا؟

شبانہ ایک عجیب سے والہانہ جذبے کے ساتھ سرخ کار کا تعاقب کر رہی تھی یونانی ناک اور کنپٹیوں پر طلوع ہوتی سفید بالوں کی روشنی والے راحیل نے شبانہ کے دل میں زندگی کے سوئے ہوئے جذبوں کو جیسے گہری نیند سے جگا دیا تھا۔ وہ اپنے اندر ایک نئی طاقت نئی تابندگی محسوس کر رہی تھی۔ راحیل کی ایک جھلک دیکھ لینے سے شبانہ کو اپنے تمام غم فکر، تمام مسائل سارے دکھ بے حقیقت لگنے لگے تھے۔ اسے فضاؤں میں پائپ کے تمباکو کی خوشبو اور گلاب کے تر و تازہ سرخ پھولوں کی مہک آنے لگی تھی۔

یہ قدیم وینس کے شاہی باغات اور غرناطہ کے عالی شان محرابی باغیچوں میں کھلے ہوئے پھولوں کی خوشبوئیں تھیں۔ پھول غرناطہ اور وینس کے زوال کے ساتھ ہی مرجھا کر بکھر گئے تھے لیکن ان کی خوشبوئیں زندہ تھیں اور اپنے چاہنے والوں کی تلاش میں سرگرداں تھیں اور اب ان کے کارواں کی ایک بچھڑی ہوئی لہر لاہور کے کینال بینک

کی سڑک پر رواں تھیں۔

سرخ کار کی رفتار تیز تھی۔۔۔ شبانہ نے بھی اپنی گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔۔۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے خوابوں کا پیچھا کر رہی ہے۔ جیسے وہ اپنے وجود سے بچھڑے ہوئے جذبوں کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔ جیسے وہ غروب ہوتے سورج کی کرن ہے اور طلوع ہوتے سورج کی روشنیوں کے سمندر میں گم ہونے جا رہی ہے اس کی نظریں دُور جاتی سرخ کار پر جمی تھیں۔ نہر پر بنا ہوا لکڑی کا چھوٹا سا پل گزر گیا۔

شبانہ نے سرخ کار کو بائیں جانب ٹاہلیوں کے درمیان سے گزرتی کچی سڑک پر مڑتے دیکھا۔۔۔ اس کا چہرہ ان جانی مسرت سے چمک اٹھا۔ یہ راحیل ہی تھا اور نہر کنارے والی پرانی بوسیدہ کوٹھی کی طرف جا رہا تھا جہاں چھوٹی سی ندی کے کنارے سرخ اور نیلے انگور کی بیلیں بانس کی چھت پر جھکی ہوئی تھیں اور جہاں نہر کی طرف سے جو ٹھنڈی ہوا آتی تھی اس میں پانی میں ڈوبی ہوئی گھاس اور موتیے کی خوشبو ہوتی تھی۔

شبانہ نے اپنی گاڑی ٹاہلیوں والی چھوٹی سی کچی سڑک پر موڑی تو سڑک دُور تک خالی تھی۔ راحیل کی کار کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی مگر سڑک پر اڑتی ہوئی ہلکی ہلکی گرد اس بات کی طرف اشارہ کر رہی تھی کہ ابھی ابھی یہاں سے کوئی گاڑی گزری ہے۔ شبانہ نے گاڑی کی رفتار کم کر دی۔ سامنے پرانی کوٹھی کا سنسان برآمدہ اور خاموش صحن تھا۔ شبانہ گاڑی کو کوٹھی کے کشادہ کچے صحن میں لے گئی۔ اس نے دیکھا کہ دائیں جانب جھکی ہوئی چھت والے گیراج کے باہر وہی سرخ گاڑی کھڑی تھی۔ شبانہ نے وہیں ایک طرف اپنی گاڑی کھڑی کر دی۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ویران برآمدے میں آ گئی۔ یوکلپٹس کی شاخ پر ایک بلبل کہیں سے آ کر بیٹھ گئی۔ شاخ تھوڑی دیر جھولنے کے بعد رک گئی۔ شبانہ دوسری بار اس غیر آباد نیم آسیبی کوٹھی میں آئی تھی۔ پہلے اسے یہاں ایک چوکیدار ملا تھا۔۔۔ اب وہ چوکیدار بھی نہیں تھا۔ پہلو کی جانب بڑی نہر میں سے نکلی ہوئی چھوٹی سی نہر تھوڑا سا خم کھا کر کوٹھی کے پیچھے جا رہی تھی۔

کوٹھی کے پیچھے آگے جا کر شاید مالٹوں کے باغ تھے جن کو یہ نہر سیراب کرتی تھی اور انگور اور لوکاٹ کے باغ بھی تھے جن کے خوشے اس نہر کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتے تھے۔ سامنے اس کمرے کا دروازہ تھا جہاں شبانہ کو راحیل ملا تھا۔ کمرے کا دروازہ نیم وا تھا۔ شبانہ دروازے کے قریب پہنچی تو اسے پائپ کی خوشبو میں گلاب کے پھولوں کی مہک محسوس ہوئی۔ یہ خوشبو نیم وا دروازے میں سے آ رہی تھی۔

اب شبانہ کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ ایک لمحہ کے لئے رک گئی۔ آخر وہ ایک ایسے شخص سے ملنے کیوں جا رہی ہے جس نے کبھی اس کے جذباتی مسائل میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ جس نے کبھی اس کے دل کی تپش کو محسوس نہیں کیا۔ جس نے کبھی اس کی آنکھوں میں جھانک کر اس کی روح کے کرب کو نہیں دیکھا جو اس سے بات کرتا ہے تو لگتا ہے کہ وہ اپنے آپ سے گفتگو کر رہا ہے۔ جو اس کی طرف دیکھتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کی نظریں شبانہ کے پیچھے کسی کو دیکھ رہی ہیں۔

شبانہ کی انا اور خود پسندی نے اس کے قدم روک لئے۔۔۔ وہ واپس مڑی ہی تھی کہ کمرے کے اندر سے کسی کی آواز آئی۔۔۔ "اندر آ جاؤ شبانہ" یہ راحیل کی آواز تھی یہ گویا شبانہ کے ماضی کی آواز تھی۔۔۔ ان دور دراز جزیروں کی آواز تھی جن کے درختوں کی شاخیں کھلے نیلے سمندروں کی ہواؤں میں لہرا لہرا کر شبانہ کو اپنی طرف بلایا کرتی تھیں۔۔۔ اس کے قدم رک گئے تھے۔۔۔ وہ گویا ماضی اور حال کے درمیان کھڑی تھی۔۔۔ ادھ کھلے دروازے میں پائپ کے تمباکو کے ساتھ گلاب کے پھول کی خوشبو آئی تو شبانہ کمرے میں داخل ہو گئی۔

اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی اور شگفتگی کا احساس بھی تھا۔۔۔ یہ احساس راحیل کی موجودگی میں ہمیشہ اس کے لاشعور میں موجود رہا تھا۔ وہ اس احساس سے بچنا بھی چاہتی تھی اور اسے اپنی جان کے ساتھ لگا کر بھی رکھنا چاہتی تھی۔۔۔ کمرہ خالی تھا۔۔۔ پرانی طرز کا کشادہ آتشدان ٹھنڈا تھا۔ کارنس پر رینفائیل کی پینٹنگ نہیں تھی۔ آبنوسی گول میز پر گرد کی ہلکی سی تہہ جمی ہوئی تھی۔ میز کے وسط میں بلور

کے چھوٹے سے گلدان میں گلاب کا تازہ پھول سجا تھا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ شخص اس فضاء میں موجود ہے جس کی یادیں سایہ بن کر شبانہ کے ساتھ ساتھ سفر کرتی تھیں۔ وہ کمرے کے عقبی دروازے سے گزر کر دوسری طرف انگور کی بیلوں والے چھوٹے سے لان میں آ گئی۔ انگور کی بیلوں سے لدی ہوئی بانس کی چھوٹی سی چھت کے نیچے سبز بید کی میز اور کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ شبانہ اس کے قریب سے گزری تو اس کی نگاہ بے اختیار سرخ اور سیاہ انگور کے ان گچھوں کی طرف اٹھ گئی جو بیل کے چوڑے پتوں میں سے جواہرات کی طرح لٹک رہے تھے۔

ساون کے ابر آلود دن کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ شبانہ کی نگاہیں جس کو ڈھونڈ رہی تھیں وہ اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔۔۔ وہ ٹھنڈے پانی والی چھوٹی سی نہر پر آ گئی۔۔ یہاں گلاب گیندا اور موتیا کے پھولوں کے جھاڑ تھے۔ موتیے کے پھول سبز پتوں کے بیچ سفید موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔۔۔ نہر کا پانی گدلا تھا۔ یہ نہر اتنی چھوٹی تھی کہ اسے چھلانگ لگا کر پھلانگا جا سکتا تھا۔

نہر کی دوسری جانب شبانہ نے پہلی بار مالٹوں کے درختوں کی قطاریں دیکھیں وہ نہر کے اس کنارے پر تھوڑا آگے بڑھی تھی کہ اسے پائپ کے تمباکو کی مخصوص خوشبو آئی، وہ خوشبو کے ساتھ ساتھ چلتی گلابوں کی بیل کے پیچھے آئی تو اسے راحیل ہری بھری گھاس پر اس طرح بیٹھا نظر آیا کہ اس نے یوکلپٹس کے درخت سے ٹیک لگا رکھی تھی۔۔۔ گہرے کلر کی پتلون، سمر شوز، اطالوی بوسکی کی نیم آستینوں والی قمیض اور گلے میں میرون کلر کا اسکارف۔۔۔ آبنوسی پائپ اس کے ہونٹوں میں دبا تھا جس میں سے نیلے رنگ کے دھوئیں کی پتلی سی لکیر تھوڑی تھوڑی دیر بعد نکل کر غائب ہو جاتی تھی۔

شبانہ کو دیکھ کر وہ تعظیماً اٹھ کھڑا ہوا۔ "مجھے معلوم تھا تم آؤ گی۔" اس نے پائپ منہ سے نکالتے ہوئے گہری بوجھل آواز میں کہا۔۔ شبانہ کے ہونٹ

ذرا سے سکڑ گئے۔ اسے کیسے معلوم ہوا کہ میں آؤں گی؟ اسے کیوں معلوم ہوا کہ میں آؤں گی؟ آخر میری قسمت میں ہی کیوں لکھا ہے کہ میں اس کے پاس آؤں؟ وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ راحیل پائپ جھاڑتے ہوئے بولا۔

"دیکھو نہر کی طرف سے جو ہوا آ رہی ہے اس میں پانی میں ڈوبی گھاس کی خوشبو ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔۔۔ ہم انگور کے خوشوں کو دیکھتے ہیں۔"

اس نے شبانہ کا ہاتھ تھاما اور اسے لے کر بانس کی چھت پر چڑھی ہوئی بیلوں کی طرف بڑھا۔۔۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "جولائی میں انگور ابھی کچے ہوتے ہیں۔ مگر دیکھو ان پر نیلا اور سرخ رنگ کیسے آ رہا ہے۔ ابھی یہ رنگ پھیکا ہے۔ بارشوں میں ان پر رنگ آ جائے گا اور اگست ستمبر میں یہ گہرے سرخ، گہرے نیلے ہو جائیں گے۔

انگور کی خوشبو اس کے اندر بند ہوتی ہے۔ جب تک اس کے دل کو نہ چیرو وہ اپنی خوشبو کے راز کو افشاء نہیں کرتا۔ اسی طرح بعض لوگ اپنی خوشبو کو اپنے اندر اس وقت تک بند رکھتے ہیں جب تک کہ ان کا دل نہیں ٹوٹتا۔"

راحیل بید کی سبز آرام کرسی پر بیٹھ کر پائپ میں تمباکو بھرنے لگا۔ شبانہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھی تھی۔۔۔ ساون کی گھٹا جھکی ہوئی تھی لیکن بارش نہیں ہو رہی تھی۔ راحیل نے پائپ سلگایا تو فضاء میں قرون وسطیٰ کے شاہی محلات ایسی خوشبو پھیل گئی کم از کم شبانہ کے ذہن میں اس خوشبو کی یہی تصویر بنتی تھی۔

شبانہ نے گہرا سانس بھرنے کے بعد اسے اپنی سہیلی نجمی کے بارے میں بتایا کہ اس کے لاپتہ ہونے کے بعد میں اور زیادہ تنہائی محسوس کرنے لگی ہوں۔ راحیل جیسے لاتعلقی سے نجمی کی بات سنتا رہا۔ وہ پائپ کے ہلکے ہلکے کش لگاتا نہر کنارے اگے ہوئے موتیے کے سفید پھولوں کو دیکھ رہا تھا۔ جب شبانہ نے اپنی تنہائی کا ذکر کیا تو راحیل کے ہونٹ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کھل گئے۔

"تنہائی میں تو انسان نے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔۔۔ تم اس سے کیوں ڈرتی ہو؟"

شبانہ نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔۔ اس لئے کہ میں گوتم بدھ نہیں ہوں۔ میں اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر جنگلوں میں نہیں جا سکتی۔ اس لئے مجھے تنہائی سے ڈر لگتا ہے۔۔۔"

راحیل اب بھی مسکرا رہا تھا۔ اس نے انگوٹھے سے پائپ کا تمباکو دباتے ہوئے کہا۔۔۔ "تم اگر گوتم بدھ نہیں ہو تو یہ اچھی بات ہے۔۔۔ تم اپنے ماں باپ کو نہیں چھوڑ سکتیں۔۔۔ یہ بھی اچھی بات ہے۔۔۔ پھر تم پریشان کس بات سے ہو؟ کیا تمہارے ماں باپ تمہاری شادی کر رہے ہیں؟ لیکن شادی میں بھی تمہارے لئے ایسی کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیئے۔ تم جس قسم کے ماحول میں رہ رہی ہو ایک نہ ایک دن ہر لڑکی کے ساتھ یہ حادثہ ضرور ہوتا ہے۔"

شبانہ کے حلق کا ذائقہ کڑوا سا ہونے لگا تھا۔۔ وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ "میرے ماں باپ میری شادی ایک ایسی جگہ کرنا چاہتے ہیں جہاں میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔" راحیل نے پائپ ہونٹوں سے الگ کرتے ہوئے شبانہ کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ اسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ اس نے کہا۔۔۔ "تو پھر تم وہاں شادی کیوں کر رہی ہو؟" شبانہ نے آنکھیں جھکا لیں اور انگلی کے ناخن سے بید کی میز کو کریدتے ہوئے بولی۔

"میں نے انکار کر دیا تو گھر کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ پھر شاید میرا باپ زندہ نہ رہے۔

راحیل نے کہا۔ "ہر گھر کا شیرازہ ایک نہ ایک دن بکھر جاتا ہے ہر باپ کو ایک نہ ایک دن مرنا ہوتا ہے۔"

شبانہ نے جھنجلا کر کہا "لیکن میں نہیں چاہتی کہ ایسا وقت سے پہلے ہو۔"

راحیل نے پائپ منہ سے لگاتے ہوئے کہا "تو پھر چپکے سے وہاں شادی کر لو جہاں تم شادی نہیں کرنا چاہتیں۔ اپنے باپ کے لئے یہ قربانی کر گزرو۔ اس سے تمہارے ضمیر کو بڑا سکون نصیب ہوگا۔ اور ضمیر کا سکون ہی جنت ہے۔ اپنی پسند کی

شادی کرنے کے بعد اگر تمہارے ضمیر کو اطمینان نصیب نہ ہوا تو تم اپنی پسند کی ساری شادی شدہ زندگی دوزخ میں بسر کرو گی۔ چھوڑو ان باتوں کو۔ آؤ نہر کے پاس چلتے ہیں۔ دیکھو نہر کا پانی کس قدر سکون سے بہہ رہا ہے۔"

راحیل نے شبانہ کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے ساتھ لیا اور قریب ہی بہتی چھوٹی سی نہر کے کنارے ٹہلنے لگا۔ "میں جہاں پیدا ہوا تھا وہاں ایسی ہی ایک نہر بہا کرتی تھی۔ وہ نہر لوکاٹ کے ایک باغ میں سے گزرتی تھی۔ جب میں چھوٹا سا تھا تو اس نہر پر کھیلنے جایا کرتا تھا۔ میں لوکاٹ کے ایک کیری رنگ کے گچھے کو بڑے شوق سے دیکھا کرتا تھا جو اپنی ٹہنی سمیت نیچے نہر کی سطح پر جھکا شاید اس میں اپنا عکس دیکھا کرتا تھا۔

ایک روز میں نہر پر گیا تو کیری رنگ کی لوکاٹ کا وہ گچھا درخت کی ٹہنی پر نہیں تھا۔ شاید کوئی لڑکا اسے توڑ کر لے گیا تھا۔ مگر نہر کے شفاف پانی کا آئینہ اسی طرح بہہ رہا تھا۔ دیکھو اس نہر کے پانی کو دیکھو۔ غور سے دیکھو تو آدمی کو لگے گا جیسے وہ خود بھی پانی کی لہروں کے ساتھ بہہ رہا ہے۔ یہاں دوسرے کنارے لوکاٹ کے باغ ہیں۔ مگر ان کے درمیان سے نہر نہیں گزرتی۔ کبھی میں تمہیں اپنے بچپن کی کہانی سناؤں گا۔ بچپن کے گیت سناؤں گا۔ تمہیں معلوم ہے دنیا میں سب سے زیادہ درد انگیز گیت بچپن کے گیت ہوتے ہیں۔"

شبانہ راحیل کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اب بارش کی نامعلوم سی پھوار پڑنے لگی تھی۔ راحیل نے چہرہ اُوپر اُٹھا کر گھٹاؤں کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ ایک عجیب و غریب مسرت کے احساس سے چمک رہا تھا۔

اس نے کہا "نیچر کتنی حسین ہے۔ شفاف ہے۔ تم اس کے آر پار دیکھ سکتی ہو وہ اپنا آپ نہیں چھپاتی وہ کپڑے نہیں پہنتی۔ وہ شادی بھی نہیں کرتی۔ پھر ہم کیوں شادی کرتے ہیں؟" راحیل ہنس دیا۔ اس نے شبانہ کی آنکھوں میں جھانک کر کہا

"سنہری خوشبودار چائے اور گلاب کے پھول اور سنہرا رنگ اڑاتی دوکرم

پراسرار آنکھیں اس دنیا میں نیچر کا یہ حسین تحفہ ہے۔ آؤ گلابوں کے پاس بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔"

نہر کنارے جہاں گلاب کے پھولوں کے پودے تھے وہاں ناریل کا ایک چھوٹا سا پیڑ بھی تھا۔ اس کے پاس ہی بانس کی ایک جھاڑی اور کیلے کے دو تین ساتھ ساتھ اُگے ہوئے درخت بھی تھے جن کے پھٹے ہوئے چاک در چاک چوڑے پتے سرنگوں تھے۔ وہ دونوں ان درختوں کے درمیان گھاس پر بیٹھ گئے۔ راحیل نے ناریل کے چھوٹے درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

یہ درخت جلاوطنی کی زندگی گزار رہا ہے۔ ناریل بانس کیلا انناس یہ سب کچھ جلا وطن درخت ہیں یہ جنوب مشرقی ایشیا کی طویل بارشوں والی اندھیری راتوں میں اُگتے ہیں اور سمندروں کی مرطوب ہوائیں انہیں آدھی آدھی رات کو آکر پیار کرتی ہے لیکن ہم نے انہیں زبردستی یہاں لا کر زمین میں گاڑ دیا ہے۔ یہ درخت یہاں صرف اُگتے ہیں، پروان نہیں چڑھتے۔ یہ سارے درخت اُداس ہیں۔ جس طرح تم اُداس ہو جس طرح دوسری کئی لڑکیاں اُداس ہیں۔ تم نے کبھی بانس کی کونپل کو اپنی شاخ پر طلوع ہوتے دیکھا ہے؟ یہ قدرت کی نشانیاں ہیں انہیں دیکھا کرو۔ کیا تمہیں معلوم ہے۔ انناس ناریل اور سیتا پھل کے درخت بھی آپس میں بیٹھ کر سیلون کی چائے پیتے ہیں؟

میں نے ان درختوں کو جنوب مشرقی ایشیاء کے ساون کی لمبی لمبی جھڑیوں میں ناریل کی پیالیوں میں نیلگری کی ڈھلانوں پر اُگنے والی چائے پیتے دیکھا ہے انہیں آپس میں باتیں کرتے، ہنستے، ایک دوسرے سے محبت کر کے، ایک دوسرے کو محبت بھرے خط لکھتے اور ساون کی بھیگی ہواؤں میں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے رقص کرتے دیکھا ہے۔

ہاں شبانہ... درخت بھی ایک دوسرے کو محبت بھرے خط لکھتے ہیں، پریم پتر لکھتے ہیں ہر وہ پتا جو درخت کی ڈالی سے ٹوٹ کر گرتا ہے وہ ایک درخت کا دوسرے درخت کے نام محبت بھرا خط ہوتا ہے۔ اس پر کبھی پاؤں نہ رکھنا۔ اس کا احترام کرنا۔ ہوائیں درختوں کی نامہ بر ہیں۔ وہ ان پتوں کو، ان محبت بھرے خطوں کو، ان پریم پتروں کو اڑا کر ایک درخت سے دوسرے درخت تک پہنچا دیتی ہے ہم ایک دوسرے کو محبت بھرے خط لکھنا بھول گئے ہیں۔ ہماری محبتیں ٹیلیفون کے بے جان تاروں سے شروع ہوتی ہیں اور وہیں ایک دن ڈس کنیکٹ ہو جاتی ہیں۔ کبھی کبھی میں ٹیلیفون کے کھمبوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے ان کے تاروں پر جگہ جگہ جھولتی ٹوٹی پھوٹی آدھی پکی محبتوں کی لاشیں لٹکتی نظر آتی ہیں۔ کبھی ہم زرد نیلے نازک کاغذوں پر محبت بھرے خط لکھ کر انہیں طرح طرح کے عطریات میں بسا کر دھڑکتے دل کے ساتھ نامہ بر کے حوالے کیا کرتے تھے۔ حنا کے عطر میں بسا کر ریشمی رومال بھیجا کرتے تھے۔

درخت اب بھی اپنے محبت ناموں کو سچے پھولوں کا عطر لگا کر نامہ بر ہواؤں کے سپرد کرتے ہیں۔ تم نے کالی داس کی شکنتلا ضرور پڑھی ہوگی تمہیں یاد ہے۔ شکنتلا نے کنول پھول کی پاکیزہ پنکھڑی پر پریم پتر لکھ کر راجہ دشنت کو بھیجا تھا۔ اب نہ وہ شکنتلا رہی نہ کنول کے پھول رہے۔ نہ وہ تو رہا، نہ وہ میں رہا، جو رہی تو بے خبری رہی۔"

راحیل پائپ سلگانے کے لئے خاموش ہو گیا۔ ساون کی دھیمی دھیمی پھوار اسی طرح گر رہی تھی۔ کیلے کے چاک داماں پتے خاموش تھے، سرنگوں تھے۔ راحیل کہہ رہا تھا۔

"محبت کو دور شجاعت چاہیئے۔ پنجاب کا بھی ایک دور شجاعت تھا جب مرزا اپنی صاحباں کی محبت کی خاطر لڑتے لڑتے ہلاک ہو گیا تھا۔ تم نے مرزا صاحباں نظم پڑھی ہے؟ جانتی ہو صاحباں اپنے پیر کے مزار پر جا کر کس خواہش کا اظہار کرتی ہے؟ وہ کہتی ہے کہ" اگر میرا محبوب میرے پاس آجائے تو میں پیر کے نام کا بکرا دوں گی۔ کاش میری چھ سات ہمسائیاں مر جائیں اور جو باقی بچیں وہ بیمار پڑ جائیں تاکہ وہ مجھے مرزے کے پاس جاتے نہ دیکھ سکیں۔ کاش اس ہندو کی دکان کو آگ لگ جائے جس کے باہر رات کو دیا جلتا رہتا ہے اور مجھے اپنے محبوب کے پاس جاتے ہوئے اس دکان کے قریب سے گزرنا پڑتا ہے۔ کاش ساری کی ساری گلیاں ویران،

سنسان ہو جائیں اور ان ویران گلیوں میں صرف اور صرف میرا محبوب پھیرا کرے۔"

راحیل مسکرایا اور کہنے لگا "محبت کو دور شجاعت کی ضرورت ہے، سر پھرے شاہ سواروں کی ضرورت ہے۔ جو اپنی محبوبہ کی خاطر زرہ پوش ہو کر ایک پہاڑی سے گھوڑا دوڑاتے دوسری پہاڑی پر کود جائیں اور چکنا چور ہو جائیں اور کبھی نیم روشن چاندنی راتوں میں پھولوں بھری بالکونیوں کے نیچے کھڑے ہو کر گٹار پر محبت کے گیت گائیں۔

یہ شفاف محبتوں کے راستے ہیں شبانہ یہ سچی محبتوں کے آئینے میں عزت، غیرت اور انسانی وقار کے نوشتے ہیں جن پر کبھی از خود رفتہ جیالی محبتوں کی داستانیں لکھی جاتی ہیں۔ اندلس میں یہ ہماری بھی روایت رہی مگر پھر ہم نے اس کتاب کو بند کر دیا اور ہم نے ان جذبوں کو جلا وطن کر دیا۔ جس طرح انناس کا درخت ناریل کا درخت بانس کا درخت جلا وطن کر دیا گیا ہے۔"

راحیل نے سرخ گلاب کا پھول توڑ کر شبانہ کے بالوں میں سجایا اور کہنے لگا بالوں میں گلاب سجانے والوں کو تاریخ کی گرد اپنے ساتھ اڑا کر لے گئی میں تاریخ کی گرد سے نکل کر تمہارے پاس آیا ہوں تمہیں یہ بتانے کہ گلاب کے پھول صرف قبروں پر ڈالنے کے لئے نہیں ہوتے بلکہ خوبصورت بالوں میں سجانے کے لئے بھی ہوتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔"

جس وقت شبانہ اس ویران پرانی کوٹھی سے باہر نکلی بارش تیز ہو گئی تھی۔ راحیل کوٹھی کے گیٹ پر بارش میں اسے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہہ رہا تھا وہ بارش میں بھیگ رہا تھا پائپ اب بھی اس کے ہونٹوں میں دبا تھا۔

شبانہ نے گاڑی کے بند شیشوں میں سے ہاتھ ہلا کر اسے الوداع کہا۔ اور گاڑی کیتال بینک کو جانے والی کچی سڑک پر ڈال دی کچی سڑک کی دونوں جانب شیشم کے درخت بارش میں شرابور تھے۔ شبانہ نے کیتال بینک کی سڑک پر آتے ہوئے گھوم کر پیچھے دیکھا پرانی کوٹھی کا گیٹ خالی تھا۔ راحیل وہاں نہیں تھا

گاڑی کو لکڑی کے چھوٹے پل پر سے نکال کر نہر کے دوسرے کنارے پر آ گئی۔ ساون کی موسلا دھار بارش نے نہر کی سطح پر ایک دھند سی پھیلا دی۔ بارش کی اس دھند میں شبانہ ان تمام لفظوں کی شکلیں بنتی دیکھ رہی تھی جو اس نے راحیل کی زبان سے سنے تھے۔ شبانہ اپنی "کیتال لاج" والی کوٹھی میں پہنچی تو بھائی نے اسے ایک خط لا کر دیا یہ خط کراچی سے ندیم نے لکھا تھا۔

شبانہ اپنے کمرے میں آ گئی اس نے جلدی سے خط کھول کر پڑھا ندیم نے نجمی اور اس کی گمشدگی کا حوالہ دیئے بغیر لکھا تھا کہ جس کام کے لئے میں کراچی آیا تھا اس کے لئے جان توڑ کوشش کر رہا ہوں۔ مجھے امید کی ایک ہلکی سی کرن نظر آئی ہے۔ تمہارے اندازے کافی حد تک درست ثابت ہو رہے ہیں۔ کالج سے میں نے مزید ایک ہفتے کی چھٹی لے لی ہے۔ دعا کرو کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکوں۔ تمہارا بھائی ندیم۔

شبانہ نے خط کو دو بار پڑھا پھر تہہ کر کے میز کی دراز میں رکھ دیا۔

اب اس کے خیالات کا رخ نجمی کی طرف مڑ گیا۔ خدا جانے نجمی اس وقت کہاں ہو گی کس حال میں ہو گی۔ نجمی کا المیہ شبانہ کے لئے ناقابل یقین تھا۔ دیکھتے دیکھتے اس خوبصورت، چنچل اور ہنس مکھ لڑکی کی زندگی برباد ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ وہ ندیم کے ورغلانے میں آ کر یا اپنی کسی خواہش اور جذبات میں بہہ کر گھر کے حصار سے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ گھر آج بھی ہم مشرقی لڑکیوں کے لئے ایک حصار ایک مضبوط قلعے کی حیثیت رکھتا ہے۔ خواہ شادی کرانے کے لئے ہی سہی لیکن کسی لڑکی کا کسی لڑکے کے ساتھ گھر سے بھاگ جانا ایک بھیانک اقدام ہے جس کے نتائج ہر حالت میں بھیانک ترین مرتب ہوتے ہیں۔

شبانہ کو یقین تھا کہ ندیم نے نجمی کو چھوڑا نہیں تھا وہ اس سے چھین لی گئی تھی۔ شبانہ کھڑکی کے پاس بیٹھی دیر تک نجمی کے بارے میں سوچ کر پریشان ہوتی رہی۔ کھڑکی کے باہر آم اور یوکلپٹس کے درختوں میں بارش ہو رہی تھی۔ نچلی منزل سے بھابی کے ملازم کو پکارنے کی آواز آ رہی تھی شبانہ کے بھائی اور ابو ابھی تک گھر

نہیں آنے تھے۔ بھائی اور باپ کی جگہ کون لے سکتا بھلا؟ شبانہ نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے ابو اور بھائی کے لئے دل ہی دل میں دعا مانگنے لگی۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی عامر کے لئے بھی دعا مانگی جو کیلی فورنیا یونیورسٹی میں انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ جو اگرچہ شبانہ کے ہونے والے خاوند ظفر کا زیر بار احسان تھا لیکن وہ اس کا بھائی تھا۔ پیارا بھائی! چھوٹے بھائی کو یاد کر کے شبانہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

ندیم کراچی میں ابھی تک زمان کے ہوٹل میں ہی تھا۔ زمان اس کی موجودگی سے پریشان تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ اگر ندیم نے پولیس میں رپورٹ کر دی کہ اس کی کزن نجمی زمان کے ہوٹل میں آ کر غائب ہوئی ہے تو زمان کے لئے بے پناہ مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں۔ اگرچہ زمان نے یہ حوالہ دے کر کہ ایسی رپورٹ درج کرانے سے اس کی اور نجمی کے ماں باپ کی بھی بدنامی ہوگی اور پولیس انہیں بھی گھسیٹتی پھرے گی۔ ندیم کو اس ارادے سے روک دیا تھا تاہم وہ نہیں چاہتا تھا کہ ندیم زیادہ دن اس کے ہوٹل میں ٹھہرے۔

نجمی زمان کے پاس بھی نہیں رہی تھی اسے شیرا اغوا کر کے نہ جانے کہاں لے گیا تھا۔ زمان کو نجمی اور شیرے کے ٹھور ٹھکانے کا کچھ علم نہیں تھا۔ اس نے اپنے طور پر شیرے اور نجمی کا کھوج لگانے کی سر توڑ کوشش کی تھی مگر اسے کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ زمان نے اس سے پہلے جس عورت کو بھی خاص ایجنٹوں کے ذریعے باہر کے ممالک میں فروخت کیا تھا اس کا جعلی نکاح شیرے کے ساتھ ہی پڑھوایا تھا اور فوراً بعد نکاح نامہ اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔

نجمی کے معاملے میں زمان سے تھوڑی تاخیر ہو گئی۔ اس نے شیرے پر اعتماد کیا اور شیرا نکاح نامے کے ساتھ نجمی کو بھی لے بھاگا۔ پھر بھی زمان نے اپنے آدمی سارے ملک میں دوڑا دیئے تھے کہ وہ شیرے اور نجمی کو ڈھونڈ نکالیں۔ اس دوران وہ ندیم کو پہلی فرصت میں واپس لاہور پہنچانا چاہتا تھا لیکن وہ اسے صاف اور کھلے لفظوں میں ایسا نہیں کہہ سکتا تھا۔ ایک دو بار زمان نے ندیم کو دبی زبان میں کہا بھی کہ

کراچی میں اس کی پڑھائی کا ہرج ہو رہا ہے۔ اسے واپس لاہور چلے جانا چاہیئے۔ آخر میں جو کراچی میں بیٹھا ہوں۔ میں نجمی کا سراغ لگا کر چھوڑوں گا۔ ندیم نے اسے بتایا کہ میں نے کالج سے ایک ہفتے کی مزید چھٹی لے لی ہے اور میں خود بھی کراچی میں گھوم پھر کر نجمی کا سراغ لگانا چاہتا ہوں۔ زمان نے بڑی فرمانبرداری سے کہا تھا۔

"ضرور سراغ لگاؤ میرے دوست میرا ہوٹل تمہارے لئے حاضر ہے تم جب تک چاہے یہاں رہ سکتے ہو۔" اس کے ساتھ ہی ساتھ زمان نے اپنا ایک جاسوس ندیم کے پیچھے چھوڑ دیا تھا کہ وہ اس کی نقل و حرکت کی نگرانی کرتا رہے اور زمان کو آ کر ہر شام رپورٹ دے کہ ندیم کہاں کہاں گیا تھا۔

ندیم اس جاسوس سے بے خبر تھا۔ ہوٹل کے چوکیدار کی زبانی اسے اتنا علم ہو چکا تھا کہ زمان کا ایک ساتھی جس کا نام شیرا تھا کئی روز سے غائب ہے۔ اور زمان نے اس کے بارے میں کبھی کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ ندیم نے چاہا کہ وہ زمان سے شیرے کے بارے میں مزید پوچھے لیکن پھر یہ سوچ کر خاموش رہا کہ اس طرح زمان کو شک ہو جائے گا جو ندیم نہیں چاہتا تھا۔

ندیم دن بھر کراچی کی سڑکوں پر پھرتا رہتا۔ اس نے کراچی کے سارے علاقے چھان مارے۔ وہ ایسی بستیوں میں بھی گیا جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ مگر نجمی کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔ زمان کو ساری رپورٹ مل جاتی تھی کہ آج ندیم کہاں کہاں گیا ہے۔ ندیم کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ زمان کا ایک خفیہ ٹھکانہ شہر سے بہت دور ایک ویران جگہ پر واقع ہے جہاں اس نے نجمی کو قید میں ڈال رکھا تھا اور جہاں سے شیرا اسے اغواء کر کے مشرقی پاکستان لے اڑا تھا۔

آخر ندیم کی چھٹیاں ختم ہو گئیں اور ایک دن وہ زمان سے اجازت لے کر لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔ زمان اسے ٹرین میں سوار کرا کر آیا تو اس نے سکھ کا لمبا سانس لیا۔

لاہور آ کر ندیم شبانہ سے ملا اور اسے بتایا کہ زمان کو بھی نجمی کا کچھ پتہ نہیں

ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ بھی نجمی کے بارے میں بے خبر ہے۔ شبانہ کا دل نہیں مانتا تھا مگر اسے یقین کرنا پڑا۔ اس لئے کہ وہ خود جاکر تحقیقات نہیں کرسکتی تھی ندیم نے ٹھنڈا خشک سانس بھر کر کہا۔

شبانہ بہن میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہتا ہے۔ نجمی کی تباہی کا میں ہی ذمے دار ہوں۔ کاش میں اسے گھر سے بھگا کر نہ لے جاتا۔ اگرچہ میں اسے شادی کرنے کے لئے لے گیا تھا۔ پھر بھی مجھے ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہیئے تھا۔ اگر میں نجمی کو مجبور نہ کرتا تو وہ کبھی گھر سے باہر قدم نہ نکالتی۔ میں نے ایک طرح سے اس کے سارے خاندان کو تباہ کر دیا ہے اور ندیم نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا لیکن شبانہ نے اسے تسلی کا ایک لفظ بھی نہ کہا۔

ندیم کو یہ ذہنی کوفت اٹھانا چاہیئے تھی۔ یہ اس کی سزا تھی۔ شبانہ کے خیال میں تو اسے اس سے زیادہ سزا ملنی چاہیئے تھی مگر وہ اسے کوئی سزا نہیں دے سکتی تھی۔ اس نے صرف اتنا کہا۔

"ندیم بھائی نجمی تمہاری وجہ سے لاپتہ ہوئی ہے۔ اس کا گھر تمہاری وجہ سے اجڑا ہے۔ اس کا باپ اس غم میں مر گیا۔ ماں بھائی شہر چھوڑ کر چلے گئے۔ تمہارا فرض ہے کہ تم نجمی کو تلاش کرو۔ اس کو گھناؤنے مصائب سے نجات دلاؤ خواہ اس کے لئے تمہیں اپنی جان سے ہاتھ کیوں نہ دھونا پڑے۔"

یہ کہہ کر شبانہ اُٹھ کر کلاس روم کی طرف چل دی ندیم ملامت اور اذیت کے شدید احساس کے ساتھ وہیں سر جھکائے بیٹھا آہیں بھرتا رہا۔ یہ اس نے کیا کر دیا تھا۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ اس کی ایک ذرا سی بھول نے ایک پورے خاندان کو تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا۔ حالانکہ اس کی نیت نیک تھی مگر اس نے جو راستہ چنا تھا وہ تباہی کا راستہ تھا۔ ندیم کے دل میں ایک ایسی پھانس اٹک گئی تھی کہ جس نے اس کی راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام کر دیا تھا۔ وہ اٹھا اور بوجھل قدم اٹھاتا یونیورسٹی کیمپس کے لان میں سے گزرنے لگا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب ہم اس حسین مگر بدنصیب اور جذبات کی رو میں بہہ کر اپنی زندگی کو بیچ منجدھار میں لے جانے والی لڑکی نجمی کی خبر لیں کہ رانگا متی اور کرنا مانی کے دلدار دار مساگوان اور بانس کے گھنے جنگلوں کی وادی میں اس پر کیا گزر رہی ہے نجمی رنگامتی پہاڑی سلسلے کی ایک گمنام وادی میں دریائے کرنافلی کے کنارے بھلوا اسمگلر کے خفیہ اڈے میں شبیرے کے ساتھ رہ رہی ہے۔ شبیرے کے ساتھ اس کے کراچی کے جگری دوست نے جس آدمی گوندی کو بھیجا تھا۔ وہ واپس جا چکا ہے نجمی کی یہاں پوری طرح نگرانی ہوتی ہے۔

بھلوا کے ڈیرے کی عورت مرتھا نجمی پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے ہے۔ وہی اس کو نہلاتی دھلاتی اور اپنے ساتھ جنگل میں ٹہلاتی ہے۔ نجمی نے ایک بار جنگل میں فرار ہونے کی کوشش کی تھی مگر شبیرے نے اسے بہت مارا تھا اور ایسی گالیاں دی تھیں کہ جن کو سن کر نجمی کے حواس معطل ہو گئے تھے۔ ایک طرح سے فرار کا خیال نجمی نے اپنے دل سے نکال دیا تھا اور اپنے آپ کو حالات کے حوالے کر دیا تھا۔ ایک کمزور لڑکی اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتی تھی۔

ایک روز نجمی کا اچانک جی خراب ہونے لگا۔ وہ سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گئی۔ ڈیرے کی عورت مرتھا۔ اس کے پاس آئی۔ وہ فوراً سمجھ گئی کہ لڑکی ماں بننے والی ہے۔ وہ بھاگ کر خوشخبری سنانے شبیرے کے پاس گئی۔ شبیرا یہ خوش خبری ایک مدت سے سننے کا آرزومند تھا۔ اس نے مرتھا کو سو روپے انعام میں دیئے اور بھاگا بھاگا نجمی کے پاس آکر اس کی تیمار داری کرنے لگا۔

جب نجمی کو حقیقت کا احساس ہوا تو اس نے وہیں فیصلہ کر لیا کہ وہ ایک جرائم پیشہ بدمعاش کے بیٹے کی ماں نہیں بنے گی۔ شبیرے نے ڈیرے کے مالک بھلوا اور عورت مرتھا کے تعاون سے نجمی کی نگرانی سخت کر دی۔ اب اسے کھپریل کی چھت والی اپنی کوٹھڑی سے پندرہ بیس قدم سے آگے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ شبیرا اپنے بچے کی آمد پر بہت خوش تھا۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر

لیا تھا کہ جب وہ ایک بچے کا باپ بن جائے گا تو نجمی کو ساتھ لے کر چٹاگانگ یا شمال کی جانب سلہٹ کی طرف نکل جائے گا اور وہیں کوئی چھوٹا موٹا شریفانہ کاروبار شروع کر کے باقی زندگی وہیں بسر کرے گا۔ دن گزرتے چلے گئے جب ۱۹۶۵ء کی جنگ چھڑ گئی۔ نجمی کو اس وقت پتہ چلا جب ایک۔ وز ڈیرے پر افراتفری پھیل گئی پھر اوپر سے دو جہاز گولیاں برساتے گزر گئے۔ شیرے نے سب سے پہلے نجمی کو اپنے حصار میں لے لیا۔ ڈیرے کے لوگ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ بھلوا چیخ چیخ کر انہیں اپنے کسی زمین دوز ٹھکانے کی طرف جانے کی ہدایت کر رہا تھا۔

اپنی درد بھری داستان سنا کر اس کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی مگر مرتھا کے سینے میں شاید دل نہیں رہا تھا۔ جرائم پیشہ لوگوں میں رہ کر وہ بھی ان ہی کی طرح بے حس اور سنگ دل ہو گئی تھی۔ اسے نجمی کی داستان غم سن کر اس کو بالوں سے پکڑ کر زمین پر روندا اور دو تین تھپڑ مار کر بولی۔

"پھر کبھی اپنی رام کہانی سنانے کی کوشش کی تو میں شیرے سے کہہ کر تیرے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دوں گی۔" نجمی آنسو بہاتی چپ ہو کر رہ گئی تھی۔ کس قدر مجبور و بے بس ہے عورت ہمارے معاشرے میں۔ نجمی کو اس کا احساس پہلے کبھی نہیں ہوا تھا اس کی ذرا سی بھول نے اس کی زندگی کو شاید ہمیشہ کے لئے تباہی کے غار میں جھونک دیا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ بھائی اور شبانہ اور کالج کی دوسری سہیلیوں کو یاد کر کے شروع میں بہت روتی تھی۔ مگر اب جیسے آنسو اس کی آنکھوں میں آنے سے پہلے ہی خشک ہو جاتے تھے۔

شیرا ویسے اس کا بہت خیال رکھتا تھا مگر اسے بار بار خبردار بھی کرتا تھا کہ اگر اس نے جنگل میں کسی طرف بھاگنے کی کوشش کی تو وہ اسے اپنے ہاتھوں قتل کر دے گا۔ وہ ایک جرائم پیشہ خونی آدمی تھا اگرچہ وہ شبانہ کے ساتھ شریفانہ زندگی بسر کرنا چاہتا تھا لیکن نجمی کا شیرے کی موجودگی میں دم گھٹنے لگتا تھا۔ اس نے تو یہ خواب دیکھے تھے کہ اس کی شادی ندیم سے ہو گی۔ دونوں اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں گے

اور پھر امریکہ چلے جائیں گے۔

ندیم کے تصور ہی سے نجمی کا حلق کڑوا ہو جاتا۔ کبھی وہ اسے بے گناہ نظر آتا اور کبھی اسے یقین ہو جاتا کہ ندیم ہی اس کی زندگی کی بربادی کا باعث ہے۔ اس کو دوست دشمن کی تمیز ہونی چاہیئے تھی۔ اس نے کیوں زمان کو اپنا دوست سمجھا؟ پھر وہ سوچتی کہ کاش اس کی سوتیلی ماں ندیم سے ہی اس کا رشتہ کرنے پر راضی ہو جاتیں۔ وہ دولت کا لالچ نہ کرتیں۔ اب نجمی کو خیال آتا کہ اگر اس کی سوتیلی ماں اس رشتے پر راضی نہیں تھی تو جہنم میں جاتا ندیم۔ ماں جہاں اس کی شادی کرنا چاہتی تھی وہ وہیں شادی کر لیتی کم از کم اس کی عزت تو محفوظ رہتی۔ اس کی نسل تو محفوظ رہتی۔ اس کی عزت نفس اور شخصیت تو بحال رہتی۔ لیکن اب پچھتانے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔

نجمی سیدھے راستے پر چلتی چلتی بھٹک کر ایک ایسی راہ پر چل نکلی تھی جہاں اسے دور دور تک نسل در نسل تک سوائے اندھیروں کے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اگر وہ کسی طرح وہاں سے بھاگ کر ڈھاکہ پہنچ کر پولیس کی پناہ میں آ جاتی ہے اور وہ اسے واپس لاہور بھیج دیتے ہیں تو معاشرہ اسے وہ مقام بھی نہیں دے گا جس مقام سے وہ منہ کے بل زمین پر گر پڑی تھی۔

شیرے کے پاس جو نکاح نامہ تھا اس پر نجمی کے باقاعدہ دستخط تھے اور شیرا اسے عدالت سے بھی واپس لا سکتا تھا۔ ویسے بھی وہاں رہ کر نجمی پر یہ انکشاف ہو گیا تھا کہ ان لوگوں کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں اور پولیس کے بعض عناصر ان سے باقاعدہ ماہانہ وصول کرتے ہیں۔

بہت جلد نجمی کو پتہ چل گیا کہ ہندوستان نے پاکستان پر حملہ کر دیا ہے۔ اور مغربی پاکستان اور (اس وقت کے) مشرقی پاکستان میں بھی پاک فوج کے جیالے سپاہی دشمن کے مقابلے پر ڈٹ گئے ہیں۔ نجمی کو اسی روز مارتھا کے ساتھ بھلوا اسمگلر کے زمین دوز ٹھکانے میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ جگہ دریائے کرنافلی کے کنارے پر تھوڑی دور ہی تھی مگر ایک جھاڑیوں سے بھرے ہوئے ٹیلے کے نیچے ایک خفیہ

غار میں واقع تھی۔ یہ غار اگرچہ قدرتی تھا مگر بھلوا کے آدمیوں نے اس کے اندر دیواریں کھود کر چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں بنا ڈالی تھیں۔ ایک جانب خفیہ شگاف میں سے اندر ہر وقت تازہ ہوا آتی رہتی تھی۔ غار کے دہانے کو جنگلی جھاڑیوں اور گھاس پھونس سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ اس غار میں پہلے ہی سے اسمگلنگ کا مال بھرا ہوا تھا۔ جتنے روز جنگ جاری رہی یہ لوگ اسی جگہ چھپے رہے۔ دن میں دو ایک بار نجمی کو گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے لئے غار سے باہر نکال کر ٹہلایا جاتا۔

یہ علاقہ سرحد پر تھا۔ دریا کی دوسری جانب بھارت کا بارڈر شروع ہو جاتا تھا۔ یہاں سے پاکستان کی جنگلی کشتیاں ایک دو بار گزریں تو نجمی کے دل میں آیا کہ وہ بھاگ کر اپنے فوجیوں کے پاس چلی جائے وہ اسے ضرور پناہ دیں گے اور اسے اس گھناؤنی زندگی سے نجات مل جائے گی لیکن اس پر پہرہ اتنا کڑا تھا کہ دور سے کسی جنگلی کشتی کی آواز آتے ہی شیرا نجمی کو پکڑ کر غار میں لے جا کر بند کر دیتا تھا۔

جنگ ختم ہو گئی کچھ دنوں بعد یہ لوگ بھی غار سے نکل کر اپنے پرانے اڈے پر آ گئے۔ دو مہینے گزر گئے۔ نجمی کی بے چینیوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اپنے جسم میں پلتے ہوئے گناہ سے کیسے نجات حاصل کرے۔ آخر اس نے دل میں ایک ایسا فیصلہ کیا جو اس کی زندگی کے لئے خطرناک بھی ہو سکتا تھا مگر وہ اپنی زندگی سے بھی تنگ آ گئی تھی۔ اس میں خودکشی کرنے کی ہمت نہیں تھی لیکن جو فیصلہ اس نے کیا اس پر عمل کرتے ہوئے اگر وہ مر بھی جائے گی تو وہ پروا نہیں کرے گی۔

اب اسے مارتھا کوٹھری سے نکال کر جنگل میں کچھ دور ٹہلانے لے جاتی تھی۔ نجمی اس دوران ان لوگوں کی بنگلہ بولی اچھی طرح سمجھنے لگی تھی اور کچھ کچھ بول بھی لیتی تھی وہ اپنے خطرناک فیصلے پر عمل کرنے کے لئے کسی موقع کی تلاش میں رہی۔ مارتھا جب اسے ٹہلانے لے جاتی تو اس کے ساتھ لگی رہتی تھی۔ نہاتے وقت بھی وہ اس پر نگاہ رکھتی تھی۔

یہ عورت ایک بلا بن کر نجمی سے چمٹ گئی تھی اس کے باوجود نجمی کو ایک موقع مل گیا۔ نجمی نے کوٹھری اور تالاب کے درمیان ایک ٹیلے کو چن لیا تھا اس ٹیلے کی اونچائی تیس پینتیس فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ ایک روز تالاب سے نہا کر واپس آتے ہوئے نجمی نے مارتھا سے کہا میرا دل اس ٹیلے پر چڑھ کر ٹھنڈی ہوا میں بیٹھنے کو کرتا ہے میرے ساتھ آؤ مارتھا۔ ۔ ۔ مارتھا راضی ہو گئی۔

نجمی آہستہ آہستہ ٹیلے کی چڑھائی چڑھنے لگی۔ مارتھا اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ ٹیلے کی چوٹی پر پہنچ کر نجمی نے گہرا سانس لے کر کہا مارتھا! یہاں ہوا کتنی خوشگوار ہے اور پھر ٹیلے کے کنارے پر آ کر نیچے دیکھنے لگی۔ مارتھا نے کہا۔

"آگے مت ہونا پیچھے ہٹ جاؤ۔" نجمی نے کہا دیکھو نیچے تمناری کے پھول کتنے سندر لگتے ہیں۔" اور یہ کہہ کر یہ ظاہر کیا جیسے اس کا پاؤں پھسل گیا ہے اور وہ چیخ مار کر نیچے گر پڑی۔ نجمی نے اپنے آپ کو خود گرایا تھا۔ نیچے اگرچہ اونچی اونچی جنگلی گھاس تھی مگر ٹیلے کی بلندی کم نہیں تھی زمین پر گرتے ہی نجمی بے ہوش ہو گئی۔

○
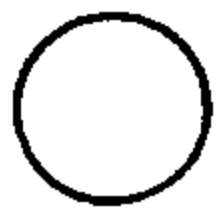
نجمی کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ مارتھا نے شور مچا دیا۔ اس کے شور کی آواز سن کر بھلوا، شیرا اور دوسرے لوگ بھاگ کر وہاں آ گئے۔ شیرے نے اپنی بیوی کو خون میں لت پت دیکھا تو گھبرا گیا۔ اسی وقت نجمی کو چارپائی پر ڈال کر رانگامتی کی ڈسپنسری میں لے جایا گیا۔

وہاں کا بنگالی ڈاکٹر بھلوا کا دوست تھا اس نے فوراً نجمی کو فرسٹ ایڈ دی اور دو تین انجکشن لگا دیئے۔ شیرا اپنے ہونے والے بچے کے بارے میں پریشان تھا۔ ڈاکٹر کو اسی وقت پتہ چل گیا تھا کہ لڑکی کا بچہ ضائع ہو گیا ہے۔ مگر اس نے شیرے کو اس وقت یہی کہا کہ وہ معائنہ کرنے کے بعد ہی بتا سکے گا۔ نجمی پیٹ کے بل گری تھی اس کی ہڈی کوئی نہیں ٹوٹی تھی مگر سر بائیں جانب سے پھٹ گیا تھا اور چہرہ

اس طرف سے سوچ گیا تھا۔ بھلوا اور اس کے آدمی تو واپس اپنے ڈیرے پر چلے گئے مگر شیرا اور مرتھا وہیں ڈسپنسری کے عقبی کمرے میں بے ہوش نجمی کے پاس ہی بیٹھے رہے۔ بنگالی ڈاکٹر نے مرتھا کو ایک طرف لے جا کر پوچھا۔ یہ آدمی اس کا خاوند ہے کیا؟

مرتھا نے کہا۔ "ہاں کیوں کیا بات ہے؟" بنگالی ڈاکٹر نے کہا۔

"اگر میں اسے یہ بتا دوں کہ بچہ ضائع ہو گیا ہے اور اس کی بیوی اب کبھی کسی بچے کی ماں نہ بن سکے گی تو اسے زیادہ صدمہ تو نہیں ہو گا۔" مرتھا نے سر جھٹک کر کہا۔

ڈاکٹر یہ بات آج نہیں تو کل بتانی پڑے گی۔ آپ اسے بتا دو خود ہی بتا دو۔ کچھ بھی نہیں ہو گا۔" تب ڈاکٹر نے شیرے کو ایک طرف لے جا کر سب کچھ بتا دیا۔ وہ ڈاکٹر کا منہ تکنے لگا۔ اس بات کا خدشہ اسے ضرور تھا کہ اتنی بلندی سے نجمی گری ہے بچے کو ضرور نقصان پہنچا ہو گا لیکن یہ بات اس کے لئے صدمے کا باعث تھی کہ اب نجمی کبھی ماں نہ بن سکے گی۔ اس خوبصورت لڑکی کو وہ صرف اس لئے اپنے دوست سے چھین کر اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا کر اس سے ہمیشہ کی خونی دشمنی مول لے کر یہاں لے آیا تھا کہ وہ اس کے بچوں کی ماں ہو گی اور وہ اس کے ساتھ شریفانہ زندگی کا آغاز کرے گا۔ جیسا بھی اس کا خواب تھا وہ خاک میں مل گیا تھا۔

اس نے بنگالی ڈاکٹر سے کہا کہ وہ ایک بار پھر معائنہ کرے۔ بنگالی ڈاکٹر نے شیرے کو یقین دلایا کہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ غلط نہیں ہے۔ شیرے نے سوچا کہ وہ کسی دوسرے ڈاکٹر کو دکھائے گا۔

شیرا نجمی کی تیمار داری میں لگ گیا۔ دوسرے روز نجمی کو ہوش آیا تو ڈاکٹر کی ہدایت کے برخلاف مرتھا نے نجمی کو بتا دیا کہ وہ اب کبھی ماں نہ بن سکے گی۔ نجمی کے لئے یہ جان لیوا خبر تھی۔ وہ صرف ایک جرائم پیشہ خاوند کے بچے کی ماں نہیں بننا چاہتی تھی اس نے آنکھیں بند کر لیں اور آہستہ آہستہ سسکیاں بھرنے لگی۔ پندرہ بیس دن کے بعد نجمی صحت یاب ہو گئی۔

شیرا اسے ڈیرے پر لے آیا۔ اس نے بھلوا سے بات کی کہ وہ نجمی کو کسی دوسرے ڈاکٹر کو دکھانا چاہتا ہے۔ بھلوا نے کہا۔ "کپتائی میں میری ایک تجربہ کار لیڈی ڈاکٹر واقف ہے۔ تم کل اپنی بیوی کو لے کر میرے ساتھ چلنا۔"

کپتائی رانگا متی کی وادی میں ایک اچھا خاصہ قصبہ تھا جو بعد میں ڈیم بننے سے زیر آب آگیا۔ اس کے شمال میں اوپر کی طرف ایک ٹیلے پر بنگالی لیڈی ڈاکٹر کا گھر تھا۔ یہ لیڈی ڈاکٹر کئی سالوں سے وہاں پریکٹس کرتی تھی۔ بھلوا اور شیرا نجمی کو لے کر اس کے کلینک میں آگئے۔ بنگالی لیڈی ڈاکٹر نے نجمی کا بغور معائنہ کیا اور وہی کچھ بتایا جو بنگالی ڈاکٹر نے انہیں بتایا تھا۔ شیرے نے پوچھا۔

"کیا بچہ پیدا ہونے کی کوئی امید نہیں ہے؟"

لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔ "بھگوان اگر چاہے تو امید ہو سکتی ہے۔ ویسے تمہاری بیوی کی کوکھ بالکل ختم ہو چکی ہے۔ اب تمہیں اس عورت سے بچے کی امید نہیں رکھنی چاہئے۔"

نجمی کو تو جو صدمہ پہنچا وہ اپنی جگہ تھا لیکن اب شیرے نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ وہ ایک بانجھ عورت کے لئے اتنی بڑی قربانی نہیں دے سکتا تھا کہ گھر سے بے گھر ہو جائے۔ جلاوطنی مول لے اور ہمیشہ خطروں میں گھرا رہے۔ اس نے سوچا کہ کراچی تو اب اسے واپس جانا نہیں ہے۔ اس عورت نجمی کو اپنے ساتھ لگائے رکھنا بیکار ہے بہتر یہی ہے کہ وہ ملک برما کی طرف نکل جائے۔ وہاں کسی لڑکی سے شادی کر کے نئی زندگی شروع کرے۔ مگر وہ نجمی کو یونہی ہاتھ سے نہیں کھونا چاہتا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ نجمی کو چھوڑے تو وہ واپس کراچی یا لاہور جا کر اس کے خلاف رپورٹ درج کرا دے اور پولیس اس کی تلاش میں رانگا متی پہنچ جائے۔ سب سے پہلے اس نے یہ پتہ کرایا کہ وہ برما کیسے جا سکتا ہے۔ بھلوا نے اسے یقین دلایا کہ وہ اسے رنگون پہنچانے میں اس کی مدد کرے گا۔ پھر اس نے شیرے سے کہا۔

"تمہارے ساتھ تمہاری بیوی ہو گی۔ کیا وہ برما کے دشوار گزار جنگلوں میں سفر کر لے گی؟"

"شیرے نے کہا میں اسے اپنے ساتھ نہیں لے جا رہا۔" بھلوا اس کا منہ تکنے لگا
تو کیا تم اپنی بیوی کو چھوڑ جاؤ گے؟" شیرے نے سگریٹ جلایا اور بھلوا کی طرف دیکھ
کر بولا۔

"میں اسے طلاق دے کر جاؤں گا۔ وہ اب بچہ پیدا نہیں کر سکتی۔ وہ میرے کسی
کام کی نہیں ہے۔ میں ایسی بیوی چاہتا ہوں جو میرے بچوں کی ماں بن سکے۔" بھلوا نے
تعجب سے پوچھا۔

"مگر اس کا تو یہاں کوئی نہیں ہے۔ تم اسے واپس کراچی پہنچاؤ گے کیا؟" نہیں
شیرے نے سگریٹ کا کش لگا کر کہا۔

"وہ کراچی واپس جا کر میرے لئے مصیبت کھڑی کر سکتی ہے میں اسے تمہارے
حوالے کر جاؤں گا۔ اس کے عوض تم مجھے صرف اتنی رقم دے دو کہ میں برما جا کر کوئی
چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر سکوں۔ مجھے معلوم ہے تمہیں ایسی لڑکیوں کی ضرورت رہتی
ہے۔ میں آج ہی اسے طلاق دے رہا ہوں۔" اسی روز شیرے نے نجمی کو طلاق دے
دی مگر اس وقت نجمی وہاں موجود نہیں تھی۔ صرف بھلوا اور بھلوا کا ایک ساتھی بطور
گواہ اس کے پاس موجود تھا پانچ ہزار روپے میں سودا طے ہو گیا۔ شیرے نے نکاح
نامہ پر طلاق کے تین حرف لکھ کر دستخط کر دیئے اور نکاح نامہ بھلوا کے حوالے کر دیا
بھلوا نے اسے پانچ ہزار کی رقم ادا کر دی۔

شام کو جب مرتھا نے نجمی کو بتایا کہ اس کے خاوند نے اسے طلاق دے دی ہے
وہ بہت خوش ہوئی۔ وہ اس عادی مجرم سے نجات حاصل کرنا چاہتی تھی لیکن جب
مرتھا نے اسے یہ بتایا کہ بھلوا نے اسے شیرے سے پانچ ہزار روپوں کے عوض خرید
لیا ہے تو نجمی کا دل بیٹھ گیا۔

وہ گڑھے سے نکل کر کنوئیں میں گر گئی تھی۔ شیرے کے ساتھ بیوی کی حیثیت
سے رہتے ہوئے اسے اُمید تھی کہ وہ کبھی نہ کبھی فرار ہو جائے گی لیکن بھلوا اسمگلروں
اور جرائم پیشہ افراد کے پورے گروہ کا سردار تھا اور وہ بے حد سنگدل اور ظالم

شخص تھا۔ سارے مشرقی پاکستان میں اس کے آدمی پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے چنگل
سے نکلنا آسان کام نہیں تھا۔ نجمی دل کو پکڑ کر رہ گئی۔ وہ شیرے سے پوچھنا چاہتی تھی
کہ اس نے اگر طلاق دینی تھی تو پھر اسے بھلوا کے پاس فروخت کیوں کیا؟ اسے واپس
کیوں نہیں جانے دیا۔

ابھی شام کی سنہری روشنی باقی تھی کہ نجمی نے شیرے کو دیکھا۔ وہ کوٹھری کے سامنے
درخت تلے بیٹھا اپنا پستول صاف کر رہا تھا۔ نجمی اس کے پاس جا کر بولی۔ "تم نے
مجھے طلاق کیوں دی شیرے؟"

شیرے نے کوئی توجہ نہ دی اور پستول کی نالی صاف کرتا رہا۔ نجمی نے کہا "اگر
مجھے طلاق دے دی تھی تو پھر اس بدمعاش کے پاس کیوں فروخت کیا۔ کیا لوگ
اپنی بیویوں کو بیچ دیا کرتے ہیں۔"

شیرے نے غصیلی نگاہوں سے نجمی کی طرف دیکھا اور بولا۔ "تم میری بیوی نہیں
ہو۔ تم میرے بچے کی ماں نہیں بن سکتیں اس لئے میرے ساتھ نہیں رہ سکتیں۔"

"تو پھر مجھے لاہور کیوں نہیں بھیج دیتے۔" نجمی نے کہا۔

شیرا غرایا "بکواس بند کرو۔ تمہیں لاہور بھیج کر میں اپنی قبر آپ نہیں کھودوں گا۔
اب تم بھلوا کی عورت ہو اس کے پاس جاؤ۔ وہ جیسا چاہے تمہارے ساتھ سلوک
کرے۔ مجھے اس سے کوئی لینا دینا نہیں۔"

یہ کہہ کر شیرے نے پستول کو صاف کر کے واسکٹ کی جیب میں ڈالا اور اُٹھ کر
درختوں کی طرف چل دیا۔ نجمی اس کے پیچھے پیچھے گئی۔ وہ اسے بار بار کہہ رہی تھی "شیرے
تم نے میری زندگی برباد کی ہے۔ اب تم مجھے یوں بے یار و مددگار چھوڑ کر نہیں جا سکتے
مجھے واپس لاہور بھجوا دو۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ مجھے واپس لاہور پہنچا دو
میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گی۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ کسی سے کچھ نہیں کہوں گی۔"

شیرا رُک گیا۔ وہ غضبناک نظروں سے نجمی کو دیکھنے لگا "میں تم کو یہاں اس
لئے لایا تھا کہ تمہارے ساتھ ایک شریف آدمی بن کر زندگی شروع کر دوں۔ مجھے

صرف اپنے بچّے کی پیدائش کا انتظار تھا پھر میں تمہیں اور اپنے بچّے کو لے کر شاید برما یا سنگاپور کی طرف چلا جاتا مگر تم نے میرے بچّے کو ہلاک کر دیا۔ ہاں۔ میں جانتا ہوں۔ تم جان بوجھ کر ٹیلے سے گری تھیں میں کوئی بچہ نہیں ہوں لیکن قدرت نے تم سے انتقام لیا اور تیری کوکھ بنجر کر دی۔ اب تو کبھی کسی بچّے کی ماں نہ بن سکے گی۔"

نجمی نے عاجزی سے کہا۔ "مگر تم نے مجھے بیچا کیوں؟"

شبیرے نے غرّاتے ہوئے کہا "تو کیا میں بنجر زمین کے ٹکڑے کو اپنے ساتھ ساتھ لئے پھرتا رہوں؟ تم اگر چاہو تو بھلوا سے بیاہ کر سکتی ہو۔ وہ بڑی عمر کا ہے تو کیا ہوا۔ وہ تمہارا بڑا خیال رکھے گا۔"

شبیرا درختوں کے درمیان جو پگڈنڈی تھی اس پر چلنے لگا۔ نجمی اس کے پیچھے چلی آ رہی تھی اس نے کہا۔ "شبیرے! مجھے تم سے اس قسم کی اُمید نہیں تھی کہ تم مجھے بیچ دوگے۔"

شبیرے نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ جھاڑیوں کے درمیان چلتا چلا گیا۔

نجمی آگے بڑھتے ہی لگی تھی کہ پیچھے سے اس کے نئے مالک بھلوا نے آواز دی "اری تو کہاں جا رہی ہے۔ چل واپس آ اب تیرا اس سے کوئی سمبندھ نہیں رہا۔" بھلوا نے مرتھا کو اشارہ کیا۔

مرتھا تیز تیز قدموں سے بڑھی اور نجمی کو بازو سے پکڑ کر تقریباً گھسیٹتے ہوئے پیچھے لے آئی۔ اتنے میں درختوں میں سے پستول کے فائر کی آواز آئی۔ پھر شبیرے کی چیخ بلند ہوئی۔ بھلوا مرتھا اور دوسرے لوگ بھاگ کر اِدھر گئے۔ نجمی وہیں کھڑی رہی اسے شبیرے کی چیخ کی آواز سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اُنہوں نے دیکھا کہ شبیرا زمین پر اپنی پنڈلی کو دونوں ہاتھوں سے دبائے پڑا کراہ رہا تھا اور اس کے سامنے ایک سیاہ کالا ناگ پھن اٹھائے پھنکاریں مار رہا تھا۔ لوگوں نے سانپ پر پتھر اور لاٹھیاں برسانی شروع کر دیں۔

سانپ کو وہیں مار دیا گیا مگر وہ شبیرے کو ڈس چکا تھا اور اپنی پنڈلی پر شبیرے کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی۔

شبیرے کا جسم سُن ہونے لگا تھا۔ اس کا حلق بند ہو رہا تھا۔ بھلوا اور اس کے آدمی شبیرے کو اٹھا کر برآمدے میں لے آئے۔ بھلوا نے چلّا کر کہا۔ "گھی کا کنستر لاؤ۔ جلدی کرو۔" مگر گھی کا کنستر آنے سے پہلے شبیرے کے ناک کان اور منہ سے سیاہ خون ابل ابل کر بہنا شروع ہو گیا۔ ناگ بہت زہریلا تھا۔ پانچ منٹ کے اندر شبیرے کے مردہ جسم نے پھولنا شروع کر دیا۔

بھلوا اور اس کے آدمیوں نے وہیں ایک گڑھا کھود کر لاٹھیوں کی مدد سے شبیرے کی لاش کو گڑھے میں گرا کر زمین میں دفن کر دیا۔ نجمی کو شبیرے کی موت کا کوئی افسوس نہ ہوا۔ وہ اُلٹا دل میں اسے بددعائیں دے رہی تھی کہ وہ مرنے سے پہلے اسے بدمعاشوں کے سردار کے پاس فروخت کر گیا تھا۔ نجمی کا نیا مالک شبیرے سے زیادہ سخت گیر نکلا۔

شبیرے نے تو پھر بھی اسے کافی آزادی دے رکھی تھی اور اس کی خاطر داری بھی کر لیتا تھا مگر بھلوا نے اسے کوٹھری میں بند کر کے رکھ دیا۔ اسے کوٹھری سے باہر نکلنے کی دن میں صرف ایک بار اجازت تھی اور اس وقت بھی مرتھا کے بجائے ایک بدمعاش پستول لٹکائے اس کے پیچھے پیچھے ہوتا تھا۔ نجمی تالاب پر نہاتی تو یہ بدمعاش جھاڑی کی اوٹ میں پستول لئے بیٹھا رہتا تھا۔ جس کوٹھری میں نجمی قید تھی اس کے دروازے پر تالا پڑا رہتا تھا۔

ایک روز مرتھا نے بھلوا سے کہا۔ "دادا! تم اس لڑکی سے بیاہ کیوں نہیں کر لیتے؟" بھلوا نے کہا۔

"بیاہ کرنے سے مجھے کیا ملے گا؟" وہ تو بانجھ ہے بانجھ۔" مرتھا نے پوچھا۔ "تو پھر اسے یہاں کس لئے بند کر رکھا ہے تو نے؟"

بھلوا بولا۔ "کسی اچھے سے گاہک کا انتظار کر رہا ہوں۔ پانچ ہزار میں خریدی ہے اوپر تین چار ہزار نہ سہی دو اڑھائی ہزار تو ضرور کماؤں گا۔"

نجمی اس سازش سے بے خبر تھی لیکن اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ

اسے قید میں کیوں ڈال دیا گیا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ بھلوا نے اگر اسے شبیر سے خریدا ہے تو وہ اس سے شادی کرے گا۔ مگر ایسے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ بہت جلد یہ معمہ حل ہو گیا۔ ایک شام نجمی کو کھانا کھلا کر منظا باہر گئی تھی۔ کوٹھری میں مٹی کے تیل کا لیمپ جل رہا تھا۔

نجمی اس حبس آلود کوٹھری میں بے چینی سے بانس کی چارپائی پر پہلو بدلتی ہوئی پنکھا جھل رہی تھی کہ باہر دروازے کا تالا کھلنے کی آواز آئی اور بھلوا کے ساتھ ایک سیاہ گھنگریالے بالوں والا بڑی بڑی مونچھوں والا ریچھ نما آدمی کوٹھری میں داخل ہوا نجمی جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بھلوا نے مسکرا کر کہا۔ "بیٹی رہو چندا یہ اپنا ہی آدمی ہے۔"

مونچھوں والا آدمی نجمی کو اوپر سے نیچے تک گھورنے لگا۔ بھلوا بولا۔ "یہ ہے جی چندا۔ بڑی سگھڑ ہے گھر کا کام کاج جانتی ہے۔ مہمانوں کی آؤ بھگت کرنے میں تو اس کا جواب نہیں ہے۔"

مونچھوں والے آدمی نے آگے بڑھ کر نجمی کے بازو کو پکڑ کر دو ایک بار دبایا۔ نجمی نے جلدی سے اپنا بازو کھینچ لیا۔ بھلوا نے اپنی زبان میں نجمی کو گالی دے کر کہا۔ "اب تجھے انہی کے پاس رہنا ہو گا۔ ہاتھ کیوں کھینچتی ہے ری چندا؟"

نجمی کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا آ گیا۔ وہ سمجھ گئی کہ اسے بھیڑ بکری کی طرح آگے فروخت کیا جا رہا ہے۔ بھلوا نے مونچھوں والے ہٹے کٹے آدمی سے پوچھا "کیوں موجمدار جی کھرا مال ہے نا؟"

مونچھوں والا موجمدار "ہوں" کہہ کر بھلوا کے ساتھ کوٹھری سے باہر نکل گیا باہر سے دروازے پر تالا ڈال دیا گیا۔ نجمی گھٹنوں پر سر رکھ کر رونے لگی۔ اس کی زندگی کا ایک بھیانک دور ختم ہوا تھا اور اب دوسرا بھیانک ترین دور شروع ہونے والا تھا۔ یا اللہ میرے گناہ بخش دے مجھے موت دیدے میں زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ لیکن نجمی کو زندہ رہنا تھا۔ ہر حال میں زندہ رہنا تھا۔ اس لئے کہ وہ خودکشی نہیں کر سکتی تھی

خودکشی کرنے کے لئے وہ اپنے اندر ہمت نہیں پا رہی تھی۔

مونچھوں والے بردہ فروش موجمدار نے بھلوا کو نجمی کے سات ہزار روپے نقد ادا کر دیئے۔ دریا میں اس کے آدمی کشتی میں تیار بیٹھے تھے۔ انہیں رات کے اندھیرے میں دریا پار کر کے انڈیا کی سرحد میں واپس چلے جانا تھا۔ یہ بھارت کے اسمگلر اور بردہ فروش تھے اور ان کا کام بارڈر پر اسمگلنگ کرنا اور غریب بے سہارا عورتوں کو خرید کر آگے کلکتے کے بردہ فروشوں کے ہاں فروخت کر دینا تھا۔ بھلوا نے موجمدار سے کہا۔ "یہاں چندا آواز نہیں نکال سکتی کشتی میں جانے کے بعد میری ذمے داری نہیں ہے۔ تم جانو اور تمہارا کام مگر میرا نام کہیں نہیں آئے۔"

موجمدار نے مونچھوں پر انگلی چلاتے ہوئے کہا۔ "بھلوا تم بھی جانتے ہو یہ ہمارا نیا پھیرا نہیں ہے۔ چندا ایسی کئی لڑکیوں کو میں انڈیا لے جا کر ٹھکانے لگا چکا ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔"

آدھی رات کو بھلوا کے دو آدمی دندناتے ہوئے کوٹھری میں داخل ہوئے۔ انہوں نے آتے ہی نجمی کے ہاتھ پیچھے باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونس کر رومال سے باندھ دیا اور پھر اسے اٹھا کر دریا کی طرف لے چلے۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہو گیا کہ نجمی کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ اسے موقع مل بھی جاتا تو کیا کر سکتی تھی۔ وہ تو جرائم پیشہ مردوں کے ہاتھوں میں ایک بکاؤ مال ایک بے بس و مجبور جانور بن کر رہ گئی تھی۔

دریا کنارے کشتی تیار کھڑی تھی۔ موجمدار کے آدمی وہاں موجود تھے۔ اندھیرے میں انہوں نے کچھ سائے اپنی طرف بڑھتے دیکھے تو جلدی سے کشتی سے نکل کر باہر آ گئے۔ کشتی میں پٹ سن کا ڈھیر لگا تھا۔ نجمی کو پکڑ کر اس ڈھیر کے نیچے چھپا دیا گیا۔ موجمدار نے خنجر نکال کر نجمی کی گردن پر رکھا اور کہا۔ "زیادہ ہاتھ پاؤں چلانے کی کوشش کی تو گردن پر چھری پھیر دوں گا۔ میں کئی لڑکیوں کو اس طرح قتل کر کے ان کی لاشیں دریا میں پھینک چکا ہوں۔"

نجمی سہم گئی اس کے اوپر دھان کے ریشے ڈال دیئے گئے۔ کشتی دریا میں چل

نکلی کچھ دور تک وہ دریا کے کنارے کنارے چلتی رہی۔ پھر اس کا رُخ دریا کے دوسرے کنارے کی طرف ہو گیا۔ رانگامتی کے دامن میں مشرق کی جانب دریائے کرنافلی کا پاٹ زیادہ چوڑا نہیں ہے۔ اس کے دوسرے کنارے پر ایک جانب سندربن ہے اور دوسری جانب بانس کے جنگلوں میں سے ہلی کے مقام کی طرف راستہ جاتا ہے ان لوگوں کی منزل ہلی تھی۔

کشتی رات کے اندھیرے میں دائیں جانب والے بانس کے جنگل کے کنارے جالگی۔ جلدی جلدی آدمی نیچے اترے۔ نجمی کو دھان کے نیچے سے نکالا وہ ادھ موئی سی ہو رہی تھی۔ اس کے منہ میں جو کپڑا ٹھنسا ہوا تھا اس سے اس کا دم گھٹ رہا تھا اس نے موجمدار کی طرف دیکھ کر اپنے منہ کی طرف اشارہ کیا۔ موجمدار نے بڑھ کر نجمی کے منہ سے کپڑا کھینچ لیا۔

نجمی نے بے اختیار گہرا سانس بھرا اور بنگلہ میں بولی۔ "میرا منہ کھلا رہنے دو۔ میں کوئی آواز نہیں نکالوں گی۔ اب میں کس کو مدد کے لئے پکار سکتی ہوں۔" اندھیرے میں نجمی کو موجمدار کے دانت نظر آئے۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ سرگوشی میں بولا۔

"اب اونچی آواز میں کوئی بات نہ کرنا۔ بس خاموشی سے چلتی رہو میرے ساتھیوں کے ہاتھوں میں ڈاہ ہیں تم خوب جانتی ہو ڈاہ ایک پل میں آدمی کے دو ٹکڑے کر دیتا ہے چلو۔"

نجمی کے ہاتھ ابھی تک پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ جنگل میں کچھ دور چلنے کے بعد ایک جھونپڑی آگئی۔ جھونپڑی کے باہر مٹی کے تیل کا لیمپ روشن تھا۔ دو پراسرار آدمی جھونپڑی سے باہر نکل آئے۔ موجمدار نے نجمی کو جھونپڑی کے اندر بھجوا دیا اور خود باہر زمین پر بیٹھ کر ان آدمیوں سے باتیں کرنے لگا۔ جھونپڑی والے آدمیوں نے موجمدار کو بتایا کہ آگے ہلی تک راستہ صاف ہے۔ اپنا ایک آدمی تمہارے ساتھ جائے گا۔ موجمدار نے جیب سے کچھ نوٹ نکال کر ان آدمیوں میں بانٹ دیئے۔ اس کے بعد نجمی اور آدمیوں کو ساتھ لیا اور جنگل میں ایک دشوار گزار راستے پر چل پڑا۔ یہاں اونچی گھاس اور

جنگلی جھاڑیوں کی بھرمار تھی۔ ایک گھنٹے تک یہ لوگ جنگل میں چلنے کے بعد ایک ندی کے کنارے آگئے۔ یہاں ایک کشتی موجود تھی۔ اب ندی میں کشتی پر سفر شروع ہو گیا۔ یہ ندی جنگل کے مختلف موڑ مڑتی ایک کھلے میدان میں نکل آئی۔

اندھیری رات کو آسمان پر کھلے ہوئے ستارے روشن کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے مگر ان لوگوں کو اپنے راستے کا پورا علم تھا۔ آگے بارڈر قریب تھا انہوں نے ایک برساتی نالے میں سے گزر کر بارڈر کراس کر لیا۔ ہلی کا چھوٹا سا گاؤں ان کی بائیں جانب رہ گیا تھا۔ یہاں انہیں انڈین بارڈر فورس کے دو سپاہیوں کو پانچ پانچ سو روپے اور ایک ایک ٹرانسسٹر رشوت کے طور پر دینا پڑا اور وہ بھارت کی سرزمین میں داخل ہو گئے تھکاوٹ کے مارے نجمی بے حال ہو رہی تھی۔

انڈیا کا بارڈر کراس کرنے کے بعد موجمدار نے اپنے پر پرزے نکال لئے۔ اس جگہ ان کا ایک ٹھکانہ تھا جہاں انہوں نے رات کا باقی حصہ بسر کرنا تھا۔ نجمی کا ایک پاؤں چارپائی کے ساتھ باندھ دیا گیا تھا۔ جھگی کے باہر ایک آدمی پہرے پر بھی موجود تھا۔ نجمی تو چارپائی پر گرتے ہی جیسے بے ہوش ہو گئی۔ نجمی کی آنکھ کھلی تو کوٹھڑی میں گھپ اندھیرا تھا۔ پہلے تو کچھ پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں ہے۔ آہستہ آہستہ وہ اپنے حواس میں آگئی۔

اس کے کانوں میں دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی وہ چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا ایک پاؤں چارپائی کی پائنتی کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ نجمی کو علم ہو چکا تھا کہ وہ موجمدار اور اس کے جرائم پیشہ ساتھیوں کے ہمراہ بارڈر کراس کر کے بھارت میں آگئی ہے۔ وہ غیر قانونی طور پر انڈیا میں داخل ہوئی ہے اور یہ بدمعاش یا تو اسے کسی دوسرے کے ہاتھ آگے بیچ دے گا یا اسے گناہ کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرے گا۔

نجمی گناہ کی اس اتھاہ دلدل میں گرنے سے پہلے وہاں سے فرار ہونے کی ایک آخری کوشش ضرور کرنا چاہتی تھی۔ وہ اگرچہ انڈیا کبھی نہیں آئی تھی مگر وہ ایک پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اگر وہ بھارت کے کسی بڑے شہر میں پاکستان

کے قونصل خانے یا سفارت خانے میں کسی طرح پہنچنے میں کامیاب ہو جائے تو اس کے جیانک مصائب کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ وہ کان لگا کر آدمیوں کی آوازیں سننے لگی۔

ان میں سے ایک آواز مونچھوں والے موجمدار کی تھی۔ وہ کسی کے ساتھ دھیمی آواز میں باتیں کر رہا تھا لگتا تھا کہ یہ دونوں شخص کوٹھری کی دیوار یا دروازے کے بالکل قریب بیٹھ کر باتیں کر رہے ہیں۔ وہ بنگلہ زبان میں بول رہے تھے اور نجمی اب اس زبان کو اچھی طرح سمجھ لیتی تھی اور ٹوٹی پھوٹی بول بھی لیتی تھی۔ نجمی ہمہ تن گوش ہو گئی۔ باہر چونکہ رات گہری اور خاموش تھی اس لئے وہ آوازوں کو آسانی سے سن سکتی تھی۔ موجمدار کہہ رہا تھا۔

"میں اسے کالی پور والے اڈے پر ہی رکھوں گا تم شہر جا کر بھیکم کو خبر کر دینا۔ میں چورنگی والوں کے ساتھ سودا نہیں کرنا چاہتا۔ مال خوبصورت بھی ہے اور جوان بھی۔ میں پوری رقم وصول کروں گا۔" دوسرے آدمی کی آواز آئی۔

"دادا! بھیکم اپنی کمیشن بہت لے گا۔" موجمدار نے جواب میں کہا۔

"لیکن وہ مال لکھی بائی کے ہاں بکوا دے گا۔ سوناگاچی میں اس کی زیادہ قیمت نہیں پڑے گی۔ وہ جاتے ہی یہ اعتراض کرنے لگتے ہیں کہ لڑکی کو گانا بجانا ڈانس کرنا سکھانا پڑے گا۔ لکھی بائی مال دیکھ کر اچھی قیمت دیدے گی۔"

نجمی سمجھ رہی تھی کہ اسے ایک بار پھر آگے کسی کے ہاتھ بیچنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ سوناگاچی کلکتے کا سب سے بڑا بازار حسن ہے۔ اور لکھی بائی شہر کے سب سے بڑے زیر زمین فیشن ایبل اڈے کی سرغنہ عورت ہے۔ جہاں سب معاملے ٹیلی فون پر طے ہوتے ہیں۔ وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ اسے زیادہ سے زیادہ دام لے کر کسی ایسی جگہ فروخت کیا جا رہا ہے جہاں ایک امیر آدمی اسے زر خرید لونڈی بنا کر اپنے گھر میں رکھ لے گا اور جہاں اس کی کوئی شنوائی نہیں ہو گی۔ اور وہ زندہ درگور ہو جائے گی۔

موجمدار کی باتوں سے اسے اتنا اندازہ ہو گیا کہ کالی پور نام کا ریلوے اسٹیشن وہاں سے قریب ہی ہے اور یہ لوگ ایک دن اسی جگہ گزار کر دوسرے دن رات

کے وقت وہاں سے کلکتے لے جانے والے ہیں۔ نجمی نے اپنے دل و دماغ سے مایوسی اور حسرت و یاس کے تمام جذبات کو نکال باہر پھینکا اور اپنے ذہن کی پوری صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے وہاں سے فرار ہونے کے منصوبے پر غور کرنا شروع کر دیا۔

دن چڑھا تو موجمدار نے خود کوٹھری میں آکر نجمی کے پاؤں کی رسی کھولی اور کہا۔ "میرا آدمی تمہیں تالاب پر لے جائے گا۔ جا کر اشنان کرو پھر ناشتہ کر کے یہاں آرام کرنا۔ ایک بات دھیان سے سن رکھو چندا۔ بھاگنے کی کوشش فضول ہو گی۔ اس سارے علاقے میں میرے آدمی پھیلے ہوئے ہیں جلیہ۔ باہر نکلو۔"

نجمی نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس سر جھکائے کھڑی رہی۔ موجمدار نے نجمی کو بالوں سے پکڑ کر ایک جھٹکا دیا اور گرج کر کہا۔

"کیا تم سنتی نہیں ہو میں کیا کہہ رہا ہوں؟"

نجمی نے انہیں کی زبان میں آہستہ سے کہا۔ "میں کہیں نہیں جاؤں گی۔" "شاباش!" موجمدار نے نجمی کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ ایک دھوتی پوش کالا کلوٹا ہندو بنگالی جس نے ہاتھ میں ڈاہ پکڑ رکھا تھا۔ نجمی کو لے کر تالاب پر لے گیا۔ اس نے تالاب کی سیڑھیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "ادھر جاؤ۔ ہم ادھر پہرہ دے گا۔ بھاگے گا تو اس ڈاہ سے ٹکڑے کر دے گا۔"

تالاب سے نہا کر واپس آنے کے بعد نجمی نے ارد گرد گہری نظر سے جائزہ لیا یہ جگہ کسی ویران علاقے میں واقع تھی جہاں ایک طرف ناریل کے درختوں کی قطار اندر تک چلی گئی تھی اور دائیں جانب اونچی نیچی زمین پر جگہ جگہ جنگلی جھاڑیوں اور سوکھی گھاس اگ رہی تھی۔ دور نجمی کو کچھ کھمبے نظر آئے جو شاید ٹیلی فون کے کھمبے تھے۔ یہ مشرق کی طرف جا رہے تھے۔

کوٹھری میں واپس آنے پر اسے ابلے ہوئے چاول اور مچھلی کا سالن دیا گیا۔ ناشتے کے بعد اس کا ایک پاؤں چارپائی سے باندھ دیا گیا۔ نجمی چارپائی پر لیٹ گئی اور فرار ہونے

کے بارے میں غور کرنے لگی۔ اس کا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ وہ ایک بار اپنی زندگی داؤ پر لگا دینا چاہتی تھی۔ وہ ان جرائم پیشہ لوگوں کے چنگل سے نکل کر کسی نہ کسی طرح کالی پور ریلوے اسٹیشن پہنچنا چاہتی تھی۔ وہاں کے اسٹیشن ماسٹر کو بھی اپنی بپتا سنا کر اس سے مدد لے سکتی تھی پھر اسے خیال آیا کہ وہ تو پاکستانی ہے اور اس کے پاس پاسپورٹ بھی نہیں ہے۔ اسٹیشن ماسٹر تو اسے پولیس کے حوالے کر دے گا۔ یہاں کی پولیس ہندو ہے۔ خدا جانے وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ اسے غیر قانونی طور پر انڈیا میں داخل ہونے کے جرم میں قید کی سزا ہو جائے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا اسے پاکستانی جاسوس سمجھ کر گرفتار کر لیا جائے اور پھر خدا جانے اس کو کیسی کیسی اذیتیں دے کر ہلاک کر دیا جائے۔

نہیں نہیں نجمی نے سوچا۔ اسے کلکتے پہنچ کر پاکستانی قونصل خانے میں جانے کی کوشش کرنی ہوگی۔ کلکتے میں مسلمان بنگالی بھی ہیں وہ ضرور اس کی مدد کریں گے۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کلکتے میں پاکستان کا قونصل خانہ ہے بھی کہ نہیں۔ اسی ادھیڑ بن میں سارا دن گزر گیا۔

شام کو ایک بار پھر نجمی کو نالاب پر لے جایا گیا۔ اس دفعہ نجمی نے اپنی کوٹھری کا بھی بغور جائزہ لیا۔ یہ بانس کی چار دیواری والی جھونپڑی نما کوٹھری تھی جس پر ناریل کی شاخوں کی ڈھلانی چھت پڑی تھی۔ کوٹھری کے عقب کی جانب نشیب تھا۔ آگے، جا کر زمین پھر اونچی ہو کر ہموار ہو گئی تھی۔ اس سے آگے جنگلی جھاڑیوں اور کہیں کہیں اُگے ہوئے ناریل کے چھریرے درختوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا جو دور بجلی یا ٹیلیفون کی تاروں کے کھمبوں تک چلا گیا تھا۔

رات کو ایک بار پھر نجمی کو مچھلی اور اُبلے ہوئے چاول کھانے کو دیئے گئے اسی رات کے پچھلے پہر ان لوگوں کو وہاں سے آگے روانہ ہونا تھا۔ شام ہوتے ہی یہ لوگ باہر کسی نشہ آور مشروب کا مٹکا کھول کر بیٹھ گئے۔ کچھ ہی دیر بعد ان کی آوازیں بلند ہو گئیں اور وہ آپس میں واہیات باتیں کرنے لگے۔

نجمی کے پاؤں میں جو رسی بندھی تھی وہ اتنی لمبی تھی کہ وہ چارپائی سے اتر کر صرف دو قدم آگے چل سکتی تھی۔ چارپائی بانس کی تھی۔ نجمی نے اسے اٹھا کر کوٹھری کے بانس کے دروازے کے قریب کیا اور سوراخ سے جھانک کر باہر دیکھا۔ چار آدمی تھوڑے فاصلے پر سامنے گھاس پر آلتی پالتی مارے بیٹھے ناریل کے پیالوں میں مشروب پی رہے تھے۔ ایک طرف لالٹین زمین پر رکھی تھی۔ اس کی دھیمی روشنی میں نجمی نے موجمدار کو دیکھا کہ وہ بھی ان لوگوں کے درمیان بیٹھا لہک لہک کر باتیں کر رہا تھا۔

نجمی دل میں دعائیں مانگنے لگی کہ یہ لوگ پی پی کر اسی جگہ بے ہوش ہو جائیں۔ اس نے چارپائی درمیان میں کھسکا لی اور رسی کی گانٹھ کو غور سے دیکھنے لگی۔ رسی پٹ سن کی تھی۔ اس کی دو گانٹھیں نجمی کے پاؤں میں لگی تھیں اور دو تین گانٹھیں پائنتی کی طرف بانس کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔

نجمی نے اپنے پاؤں میں لگی گانٹھوں کو کھولنے کی کوشش شروع کر دی۔ اسے بہت جلد احساس ہو گیا کہ گانٹھیں اتنی پختہ ہیں کہ وہ اسے صبح تک بھی کوشش کرتی رہے تو کھول نہیں سکے گی۔ مگر اسے ہر حالت میں انہیں کھولنا اور اسی رات وہاں سے فرار ہونا تھا۔ اس نے کوٹھری میں نگاہ دوڑائی۔۔۔ مگر اس نے دن کے وقت بھی دیکھ لیا تھا کہ کوٹھری میں سوائے بانس کی چارپائی کے دوسری کوئی چیز نہیں تھی۔

باہر سے اب کسی کے بے سرے تبلہ کا نے کی آواز آ رہی تھی۔ رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ باہر بیٹھے آدمیوں کی آوازیں مدھم پڑتی گئیں پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ نجمی نے پاؤں کی رسی کھولنے کی جدوجہد شروع کر دی۔ وہ رسی کو پائنتی کے بانس سے رگڑنے لگی۔ دروازے کے باہر آہٹ ہوئی۔۔۔۔

نجمی نے جلدی سے ہاتھ پیچھے ہٹا لیا اور چارپائی پر خاموشی سے لیٹ گئی۔ بانس کا دروازہ آہستہ سے کھلا۔ نجمی نے لیٹے لیٹے پلٹ کر دیکھا یہ موجمدار نہیں تھا۔ اس کا ایک ساتھی تھا۔ وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ نجمی جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ آدمی بھی جلدی سے زمین پر بیٹھ گیا پھر تیزی سے لپک کر چارپائی پر دونوں ہاتھ رکھ کر سرگوشی

میں بولا۔

"چندا بائی... میں تمہیں... عیش کراؤں گا... میرے ساتھ... چندا بائی... میرے ساتھ... عیش کراؤں گا ری... میرے ساتھ بھاگ چل... چل... نکل... چل..."

اسے بہت چڑھی ہوئی تھی... اس کے منہ سے بات صحیح نہیں نکلتی تھی۔ وہ گردن طوطے کی طرح گھما رہا تھا۔ اچانک نجمی کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح چمکا... اس نے اس ہندو بنگالی کے ہاتھ تھام لئے اور آہستہ سے بنگلہ میں بولی "مجھے یہاں سے نکال لے چل... میں ساری زندگی تیری خدمت کروں گی..."

آدمی نے سینہ پھلا دیا اور ہلکی سی ہچکی لی اور بولا۔ "چندا رانی... تو رانی ہے... شی... خاموش... بول نہیں... سالا موجمدار نہ سن لے... سالا کہاں سنے گا... میں نے سب کو بہت پلا دی ہے... چندا چل میرے ساتھ بھاگ چل..."

نجمی نے اسے پاؤں کی رسی دکھائی... وہ دانتوں سے رسی کی گانٹھیں کھولنے لگا۔ خدا جانے اس دبلے پتلے ہندو بنگالی میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی کہ اس نے چند لمحوں میں رسی کھول ڈالی۔ نجمی چارپائی سے نیچے اتر آئی۔ وہ آدمی نجمی کو پیچھے کھینچ کر بولا...

"شی! چندا رانی... شی... جلدی نہ کر... مجھے دیکھ آنے دو..." اور وہ لڑکھڑاتا ہوا کوٹھڑی سے باہر نکل گیا... اس کے فوراً ہی بعد اندر آ گیا۔ اور دونوں بازو کھول کر بولا۔ وہ سالے بے ہوش پڑے ہیں... دھت... میں نے جان بوجھ کر انہیں زیادہ پلا دی تھی..."

وہ خود بھی زیادہ چڑھائے ہوئے تھا اسے اس کا احساس نہیں تھا۔ وہ بار بار لڑکھڑا جاتا تھا۔ نجمی کے لئے یہ صورت حال بہت فائدہ بخش تھی۔ بجائے اس کے کہ وہ آدمی نجمی کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر لے جاتا۔ نجمی نے اس کا بازو پکڑا اور اسے کوٹھڑی سے نکال کر ایک طرف چلانے لگی۔ باہر لالٹین کی لو بہت دھیمی کر دی

گئی تھی۔ یہ سب کچھ اس آدمی نے ہی کیا تھا کیونکہ وہ رات کو نجمی کو وہاں سے بھگا کر لے جانا چاہتا تھا۔ گھاس پر موجمدار اور اس کے باقی ساتھی اوندھے پڑے تھے۔

نجمی اپنے عاشق صادق کو سنبھالے نشیب کی طرف اندھیرے میں بڑھی تو عاشق صادق لڑکھڑا کر گر پڑا... گرتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور آگے پیچھے یوں ڈولنے لگا جیسے طوفانی سمندر میں جہاز کے عرشے پر کھڑا ہو۔ نجمی اس جگہ اسے چھوڑنا نہیں چاہتی تھی وہ شور مچا سکتا تھا۔ اس نے اپنے محبوب کو تھام لیا۔ وہ نجمی کا سہارا لئے لڑکھڑا لڑکھڑا کر چل رہا تھا اور ساتھ ساتھ بار بار اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر نجمی کو خاموش رہنے کا اشارہ بھی کرتا جاتا تھا۔ آگے نشیب تھی یہاں آتے ہی وہ ایسا لڑکھڑایا کہ زمین پر لوٹنیاں کھاتا دور نیچے تک چلا گیا۔ نجمی بھاگ کر اس کے پاس آ گئی کہ اگر وہ شور مچائے تو وہ اس کا منہ بند کر دے۔

یہ خدشہ بے بنیاد تھا کیونکہ اسے اتنی ہوش نہیں رہی تھی وہ بے سدھ اور بے ہوش پڑا تھا۔ نجمی نے دل ہی دل میں اس عاشق صادق کا شکریہ ادا کیا اور سامنے والے میدان کی چڑھائی چڑھ کر اوپر ناریل کے درختوں میں آ گئی۔ آسمان پر ستارے چمک رہے تھے جیسے وہ بھی نجمی کے اس عجیب و غریب فرار کو دلچسپی سے تک رہے ہوں۔

نجمی نے دور کھمبوں کی قطار کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ وہ نسواری رنگ کی دھوتی نما ساڑھی میں ملبوس تھی۔ پاؤں میں ربڑ کی چپل تھی جو اسے تیزی سے بھاگنے سے روک رہی تھی۔ اس نے چپل اتار کر ہاتھ میں پکڑی اور اندھا دھند بھاگنے لگی۔ بہت جلد اس نے میدان پار کر لیا اور ناریل کے درختوں کی قطار کے پاس آ گئی۔ زمین پر سوکھی گھاس تھی اور اندھیرے میں جھاڑیاں آسیبی سایوں کی طرح لگ رہی تھیں۔ نجمی ان کے درمیان بھاگتی گئی۔ جب تھک جاتی تو بیٹھ کر تھوڑی دیر سانس درست کرتی اور پھر بھاگنا شروع کر دیتی۔ فرار کا یہ اس کا شاید آخری موقع تھا۔ وہ اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے جرائم پیشہ لوگوں کی گناہ آلود زندگی سے جتنی

دُور ہوسکے دُور ہوجانا چاہتی تھی۔

آسمان ستاروں سے بھرا ہوا تھا مگر نجمی کو انہیں دیکھنے کی فرصت نہیں تھی اس کا جسم پسینے میں شرابور ہوگیا تھا۔ سوکھی گھاس اس کے پاؤں کے تلوؤں کو تکلیف دے رہی تھی مگر نجمی اس سے بے نیاز بھاگی جا رہی تھی۔ اس نے اونچا نیچا میدان عبور کرلیا۔ ناریل کے درختوں کی قطار بہت پیچھے رہ گئی تھی۔

وہ ٹیلی فون کے کھمبوں کے پاس آ گئی۔ یہاں دھان کے کھیت تھے۔ جنوب مغرب کی طرف اسے دور روشنی سی جھلملاتی دکھائی دی۔ ضرور ادھر کوئی آبادی ہوگی۔ یہ سوچ کر نجمی اس روشنی کی طرف دوڑنے لگی۔ اب وہ بہت تھک گئی تھی اور اس سے بھاگا نہیں جاتا تھا۔ موجمدار اور اس کے آدمی اگرچہ بے سدھ پڑے تھے مگر ممکن تھا کہ وہ ہوش میں آجائیں اور موجمدار اسے وہاں نہ پاکر اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہو ... اس لئے نجمی راتوں رات اس خطرناک علاقے سے نکل جانا چاہتی تھی۔ دوڑنے کی اس میں سکت نہیں تھی۔

وہ تیز تیز چلنے لگی ... تھوڑی دیر بعد وہ تیز چلتے ہوئے بھی تھک گئی۔ وہیں بیٹھ کر ہانپنے لگی۔ جسم پسینے سے بھر گیا تھا۔ حلق خشک ہو رہا تھا۔ اس نے ساڑھی کے پلو سے منہ پونچھا ... ذرا سانس ٹھیک ہوا تو اٹھی اور روشنی کی طرف چلنے لگی جواب قریب آگئی تھی۔ یہ ایک نہیں دو تین روشنیاں تھیں۔ اصل میں یہ ایک چھوٹی نیم پختہ سڑک تھی جو کالی پور کی منڈی سے نکل کر آگے کشن گام کے قصبے تک چلی گئی تھی۔ سڑک پر آکر نجمی کو کچھ تسلی ہوئی کہ وہ انسانی آبادی میں پہنچنے والی ہے۔ اس وقت رات کے ڈیڑھ بجے کا سماں تھا۔ ٹھنڈی مرطوب ہوا چلنے لگی تھی۔

سڑک کے کنارے کافی فاصلوں پر دھیمی روشنی والے بلب روشن تھے۔ راستے میں نجمی نے ایک تالاب دیکھا ... مگر اس کا پانی بہت نیچے جاکر تھا اور سیڑھیاں، غائب تھیں۔ اندھیرے میں نجمی نے تالاب تک پہنچ کر پانی پینے کا خطرہ مول نہ لیا۔

وہ سڑک کے کنارے کنارے جس طرف اندھیرا تھا اس جانب چل رہی تھی

کبھی کبھی وہ پیچھے مڑ کر بھی دیکھ لیتی تھی۔ اس کی پنڈلیاں درد کرنے لگی تھیں۔ [illegible] قدم قدم چل رہی تھی۔ جب کھمبے کی روشنی آتی تو وہ جھاڑیوں کے پیچھے سے ہو کر نکل جاتی ... یونہی چلتے چلتے آخر اس نے دُور جھلملاتی روشنیوں کو دیکھا جو پہلے تو دور ستاروں کی طرح ٹمٹماتی رہیں پھر آہستہ آہستہ اُبھر کر سامنے آگئیں۔ یہ چھ سات روشنی کے نقطے تھے جن میں سے کچھ سرخ روشنیاں تھیں۔ اچانک نجمی کو خیال آیا کہ یہ ضرور کوئی ریلوے اسٹیشن ہوگا اور یہ ریلوے سگنل کی سرخ بتی ہے۔

ریلوے اسٹیشن کے خیال سے نجمی میں ایک نیا حوصلہ آگیا۔ وہ یہاں سے کسی بھی ٹرین میں بیٹھ کر کلکتے جا سکے گی۔ اس نے دوبارہ سگنل کی بتی کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ تھوڑا بھاگنے کے بعد وہ تھک گئی۔ اب پھر وہ قدم قدم چل رہی تھی۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ ریلوے لائن پر آگئی جو سیدھی ایک چھوٹے سے اسٹیشن کی طرف جا رہی تھی جہاں کچھ سرخ اور زرد بتیاں جھلملا رہی تھیں۔ نجمی تیز تیز چلنے لگی۔ ریلوے اسٹیشن قریب آیا تو اس نے اپنی رفتار مدھم کرلی۔

اسے یہ خطرہ بھی محسوس ہونے لگا تھا کہ کہیں ریلوے والے موجمدار کے جاننے والے نہ ہوں۔ اس نے کہا تھا کہ میرے آدمی اس علاقے میں جگہ جگہ پھیلے ہوئے ہیں یہ ریلوے اسٹیشن چھوٹا تھا اور اس کا صرف ایک ہی پلیٹ فارم تھا۔ کہیں کہیں پلیٹ فارم پر روشنی ہو رہی تھی۔

اندھیرے میں نجمی بنگلہ میں لکھا ہوا اسٹیشن کا نام نہ پڑھ سکی۔ پلیٹ فارم کے شروع میں ہی نلکا لگا تھا۔ نجمی نلکا کھول کر صدیوں سے پیاسے انسان کی طرح پانی پر ٹوٹ پڑی پانی پیا... منہ دھویا... گردن پر پانی ڈالا... پاؤں دھوئے اور ساڑھی سے منہ پونچھ رہی تھی کہ کسی نے بنگلہ میں پوچھا۔ "کون ہو تم!" نجمی کا دل زور سے دھڑکا... اس نے پلٹ کر دیکھا۔

نجمی کے پیچھے ایک ہندو بنگالی کھڑا اسے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ ہندو اس لئے کہ اس کے ماتھے پر سیندور کا تلک لگا تھا۔ یہ پکی عمر کا دبلا پتلا آدمی تھا جس نے دھوتی کرتہ پہن رکھا تھا۔ جرائم پیشہ لوگوں میں رہتے ہوئے نجمی میں ایک بے باکانہ اعتماد بھی پیدا ہو گیا تھا۔ اس ہندو بنگالی نے بنگلہ زبان میں نجمی سے پوچھا تھا کہ "کون ہو تم؟" نجمی نے شاید پہلی بار ایک غیر مرد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تیز لہجے میں بنگلہ میں ہی جواب دیا۔

"تم پوچھنے والے کون ہو؟ یہیں ٹھہرو میں ابھی پولیس کو بلاتی ہوں۔"

ہندو بنگالی ایک دم نرم ہو گیا ہاتھ باندھ کر بولا۔

"بیٹی میں نے تو اس لئے پوچھا تھا کہ تم اکیلی ہو اور یہ بارڈر ایریا ہے یہاں بدمعاش لوگ بہت پھرتے ہیں تمہارا پتی تمہارے ساتھ نہیں کیا؟"

نجمی نے کوئی جواب نہ دیا اور صبح کی پھیلتی روشنی میں نیم ویران دیہاتی ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر چل پڑی۔ پلیٹ فارم کی ٹین کی چھت کے نیچے دو چار لوہے کے بنچ بچھے تھے جن پر چند ایک مسافر بیٹھے گاڑی کا انتظار کر رہے تھے۔

نجمی کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ جتنی جلدی ہو سکے اس خطرناک علاقے سے نکل کر کلکتے پہنچ جائے۔ کلکتہ بڑا شہر تھا۔ وہ اتنے بڑے شہر میں آسانی سے گم ہو سکتی ہے وہ کلکتے پہنچ کر پاکستانی قونصلیٹ سے رابطہ پیدا کرنا چاہتی تھی تاکہ وہاں پناہ حاصل کر کے واپس پاکستان جا سکے۔ جو بات اسے پریشان کر رہی تھی وہ یہ تھی کہ جن لوگوں سے وہ بھاگ کر آئی ہے کہیں وہ یہاں نہ پہنچ جائیں۔ نجمی اکیلی ہی نہیں تھی بلکہ اس کے پاس چند روپوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہاں سے کلکتے تک کا کرایہ کتنا ہے۔ اسی ادھیڑ بن میں نجمی پلیٹ فارم کے واحد ٹی اسٹال کے قریب آکر کھڑی ہو گئی۔

اس نے پلٹ کر دیکھا پکی عمر کا ہندو بنگالی ایک بنچ پر کسی موٹی عورت کے پاس بیٹھا بستر کو رسی سے باندھ رہا تھا۔ نجمی کو یہ عام گھریلو قسم کا آدمی لگا جو اپنی بیوی کے ساتھ سفر کر رہا تھا اور اس نے ممکن ہے محض ہمدردی کی خاطر نجمی سے پوچھ لیا ہو کہ وہ کون ہے اور کہاں جا رہی ہے۔ وہ اکیلی کیوں ہے نجمی نے سوچا کہ اس آدمی اور اس کی بیوی کی حفاظت کی چھتری میں وہ کلکتے تک سفر کر سکتی ہے۔ مگر اب وہ خود اس ہندو بنگالی کے پاس نہیں جانا چاہتی تھی۔ وہ اسٹال کے پاس لوہے کے کھمبے کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔

اتنے میں وہی ہندو بنگالی اپنی موٹی بیوی سے کچھ پیسے لے کر انہیں گنتا، ہوا اسٹال کی طرف آیا۔ نجمی گوشۂ چشم سے اسے تک رہی تھی۔ اسٹال پر آکر

اس نے مٹی کے آبخوروں میں چائے ڈلوائی اور انہیں ہاتھوں میں تھام کر واپس جانے لگا تو نجمی کے پاس آ گیا۔

"بیٹی کیا تم ہمارے ساتھ چائے نہیں پیو گی؟ میری بیوی بھی تمہارا پوچھ رہی تھی کہ یہ بچی اکیلی کیوں بیٹھی ہے اسے بھی چائے پلا دو۔"

نجمی خود اس فیملی کے پاس جانا چاہتی تھی وہ اُٹھ کر ہندو بنگالی کے پاس آ گئی اور بولی۔

"میرے پاس پیسے ہیں میں چائے لیتی ہوں۔"

ہندو بنگالی بڑے اخلاق سے مسکراتے ہوئے بولا۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے بیٹی! تم کو اپنی بیٹی کہا ہے اب باپ کا فرض بنتا ہے کہ وہ بچی کو چائے پلائے۔"

اس نے نجمی کے لئے بھی چائے لی اور اپنی بیوی کے پاس آ گیا۔ نجمی نے اس کی بیوی کو غور سے دیکھا۔ سیدھے سادے نین نقش والی گہرے سانولے رنگ کی ادھیڑ عمر بھاری بدن والی بنگالی عورت تھی۔

اس کے ماتھے پر بھی بندی لگی تھی۔ اس نے نجمی کو اپنے پاس بٹھا لیا اور تھیلے میں سے بوندی کا لڈو نکال کر نجمی کو دیا۔ ایک لڈو اپنے خاوند کو بھی دیا نجمی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"بیٹی تمہارا نام کیا ہے؟ تم کہاں جا رہی ہو؟ تمہارا پتی دیو ساتھ نہیں آیا؟"

نجمی نے ایک گہری نگاہ پلیٹ فارم کے آخری جنگلے پر ڈالی۔ اسے ہر لمحہ خطرہ لگا تھا کہ موجمدار یا اس کا کوئی آدمی وہاں نہ آ جائے۔ پھر بولی۔

"موسی! میرا نام چندا ہے میرے آدمی نے مجھے مار کر گھر سے نکال دیا ہے اب کلکتے جا رہی ہوں۔"

بنگالی عورت نے پوچھا۔

"کلکتے میں تیرا کوئی بھائی بند ہے کیا؟"

نجمی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"وہاں تو میرا کوئی بھی نہیں ہے مگر کسی آشرم میں رات گزارا کروں گی۔ دن میں لوگوں کے گھروں کا کام کاج کر لیا کروں گی۔"

بنگالی عورت نے نجمی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"بیٹی چندا! کلکتہ تو بہت بڑا شہر ہے وہاں تمہیں کسی آشرم کا کیسے پتہ چلے گا۔ کیا تم پہلے کبھی کلکتے گئی ہو؟"

نجمی نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ہندو بنگالی کہنے لگا۔

"بیٹی! ایسا کرنا کہ تم کلکتے پہنچ کر ہمارے گھر چلی چلنا۔ ہم بھی کلکتے جا رہے ہیں۔ میں ایک دفتر میں چپڑاسی ہوں میرا چھوٹا سا کوارٹر ہے جو دفتر کی طرف سے ملا ہوا ہے۔"

اس کی بیوی نے بڑی شفقت سے کہا۔

"ہم تمہیں وہاں کوئی کام بھی دلوا دیں گے اور تمہارا کسی آشرم میں ٹھہرانے کا بندوبست بھی کر دیں گے۔"

ہندو بنگالی چائے کے سکورے کا آخری گھونٹ چڑھا کر بولا۔ "ہماری کوئی اولاد نہیں ہے بیٹی۔ چند روز ہمارے ہاں رہ لو گی تو ہمیں بڑی خوشی ہو گی آگے تمہاری مرضی ہے ہم تمہیں مجبور نہیں کر سکتے۔"

بنگالی عورت کہنے لگی۔ "تم اپنے خاوند کے پاس واپس کیوں نہیں چلی جاتیں۔ خاوند تو مارا پیٹا ہی کرتے ہیں تم کہو تو ہم تمہیں تمہارے خاوند کے پاس لے چلیں؟ ہم اسے سمجھائیں گے۔"

نجمی نے جلدی سے کہا "نہیں نہیں اب میں اس کے پاس نہیں جاؤں گی وہ مجھے ہر روز تاڑی پی کر مارتا ہے میں اسے چھوڑ آئی ہوں۔ میں کلکتے جا کر محنت مزدوری کر کے پیٹ پال لوں گی۔ بھگوان میری مدد کرے گا یہ بھی اچھا ہوا کہ میرے کوئی اولاد نہیں ہے۔"

ہندو بنگالی نے جیب سے بیڑی نکال کر سلگائی اور اپنی بیوی کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔

"رانی! چندا بیٹی ٹھیک کہتی ہے اس کا پتی تاڑی پی کر اسے پھر مارنا پیٹنا شروع کر دے گا اور یہ پھر گھر سے بھاگ جائے گی۔ ابھی تو اچھا ہوا کہ ہم اسے مل گئے ورنہ تم جانتی ہی ہو کہ یہاں کسی اکیلی لڑکی کا گھر سے یوں نکل آنا کتنی خطرناک بات ہوتی ہے۔"

"لو بیٹی برفی کھاؤ۔"

نجمی تھوڑی تھوڑی دیر بعد پلیٹ فارم کے آخری کنارے کو دیکھ لیتی تھی جہاں اب سنہری دھوپ چمک رہی تھی۔ ابھی تک موجمدار کے آدمیوں میں سے کوئی نہیں آیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ لوگ ابھی تک جھونپڑی کے باہر دھت پڑے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ لوگ نجمی کی تلاش میں کسی دوسری طرف نکل گئے ہوں۔

نجمی نے ہندو کے ہاتھ سے برفی لے لی اور کھانے لگی۔ اس ہندو بنگالی نے اپنا نام ہریل بتایا اور بیوی کا نام پدماوتی جس کو وہ پیار سے رانی کہہ کر پکارتا تھا نجمی نے ہریل سے کہا۔

"دادا منی میں تھوڑا بہت پڑھ لکھ بھی لیتی ہوں مجھے کوئی لکھنے پڑھنے کی نوکری دلا دو گے؟"

ہریل نے مسکرا کر کہا۔ "اری بیٹی کیوں نہیں دلا دوں گا۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ تم پڑھ لکھ بھی لیتی ہو۔"

اس کی بیوی نے بات کاٹ کر کہا۔

"اجی تم سیٹھ بندو سے کہہ کر بچی کو اس کے اسکول میں رکھوا دینا۔"

ہریل جیسے چونک کر بولا۔

"ارے ہاں تم نے خوب یاد دلایا سیٹھ بندو کا تو اپنا لڑکیوں کا اسکول ہے۔"

پھر نجمی کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا۔

"چندا بیٹی! بس تمہارا کام ہو گیا سمجھو۔ تمہاری تنخواہ بھی سو روپے تک کرا دوں گا"

نجمی نے بظاہر خوشی کا اظہار کیا مگر اندر سے وہ پریشان تھی وہ جتنی جلدی ہو سکے اس ویران دیہاتی اسٹیشن سے دور نکل جانا چاہتی تھی۔ دن چڑھتا جا رہا تھا یقینی بات تھی کہ اب تک وہ لوگ ہوش میں آ چکے ہوں گے اور جب مونچھوں والا بردہ فروش موجمدار جھونپڑی میں نجمی کو نہیں پائے گا تو زخمی ریچھ کی طرح اپنے آدمیوں کو لے کر اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہو گا۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد پلیٹ فارم کے آخری کنارے کی طرف دیکھ لیتی تھی جہاں ڈھلوان کے بعد درختوں کی قطار میں ایک کچی، پگ ڈنڈی دور تک جاتی تھی۔

یہ پگ ڈنڈی ابھی تک خالی تھی مگر کسی بھی لمحے یہاں موجمدار اور اس کے آدمیوں کے بھیانک چہرے نمودار ہو سکتے تھے۔ اگرچہ نجمی اس غریب ہندو بنگالی فیملی میں اپنے آپ کو کسی حد تک محفوظ محسوس کر رہی تھی مگر یہ لوگ اسے موجمدار کے آدمیوں سے نہیں بچا سکتے تھے۔ ہریل کہہ رہا تھا۔

"لیکن چندا بیٹی میں اب بھی تمہیں یہی کہوں گا کہ کلکتے پہنچ کر اپنے آدمی کو بھی وہیں بلوا لینا۔ عورت کی شوبھا اپنے پتی کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔"

نجمی نے کسی قدر بے چینی سے پوچھا۔

"دادا منی گاڑی کب آئے گی؟"

ہریل نے دور درختوں کی طرف دیکھا اور بولا۔

"گاڑی آ گئی ہے بیٹی وہ دیکھو تاڑ کے درختوں کے اوپر دھواں۔"

دو ایک مزدور سے قلی پلیٹ فارم پر آ کر بیٹھ گئے چند ایک مسافر جو وہاں تھے اپنا اپنا سامان سنبھالنے لگے۔ نجمی کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا اسے شدید خطرہ تھا کہ کہیں عین موقع پر موجمدار اپنے آدمیوں کو لے کر نہ آ جائے۔ گاڑی بھی کالی پور کی طرف سے آ رہی تھی۔ اس گاڑی میں بھی ان لوگوں کی موجودگی کا امکان تھا۔ ہریل کی موٹی بیوی رانی نے نجمی کی طرف دیکھ کر ذرا سا مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"بیٹی تو کہاں پیدا ہوئی تھی میرا مطلب ہے کہ تمہاری بنگلہ زبان صاف نہیں ہے"

تم کہیں بہار کی رہنے والی تو نہیں ہو بیٹی؟"

نجمی واقعی ابھی اتنی روانی سے بنگلہ زبان نہیں بول سکتی تھی۔ اگرچہ اس نے اس زبان پر کافی عبور حاصل کر لیا تھا مگر پھر بھی وہاں کے رہنے والوں کی طرح نہیں بولتی تھی۔ نجمی نے دور گاڑی کے انجن کے دھوئیں کی طرف نگاہیں جما رکھی تھیں۔ ہریل کی بیوی رانی کا سوال اسے بہت بُرا لگا مگر اس کا جواب ضروری تھا کہنے لگی۔

"میری پیدائش پٹنہ میں ہوئی ہے موسی۔ ماں باپ بچپن ہی میں مر گئے۔ چچا چاچی کے ہاں رہی جو بنگلہ کے ساتھ ساتھ بہاری بھی بولتے تھے۔"

یوں نجمی نے بات کو ٹال دیا۔ اب ریل گاڑی کا انجن دھواں اڑاتا اسٹیشن کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا جب وہ پلیٹ فارم میں داخل ہوا تو زمین ہلنے لگی۔ نجمی نے منہ دوسری طرف کر لیا کہ اگر ریل گاڑی میں موجمدار کے آدمی ہوں تو وہ اسے نہ دیکھ لیں۔ پسنجر ٹرین تھی چند ایک مسافر سامان اور بچوں کے ساتھ شور مچاتے ایک دوسرے کو چیخ چیخ کر آوازیں دیتے ٹرین سے اُترے۔

نجمی کی ٹکٹ ہریل بیچ میں جا کر لے آیا تھا۔ انہوں نے بھی تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں گھس کر اپنے لئے جگہ بنا لی۔ ٹرین میں کافی رش تھا۔ جب تک ٹرین اسٹیشن پر رکی رہی نجمی نے ساڑھی کے پلو سے اپنا آدھا منہ ڈھانپے رکھا۔

خدا خدا کر کے ٹرین چلی۔ نجمی کی جان میں جان آئی۔ کلکتہ وہاں سے کافی دُور تھا اور شام کے قریب ٹرین وہاں پہنچتی تھی۔ پسنجر ٹرین تھی ہر اسٹیشن پر رک جاتی۔ جب بھی ٹرین رکتی نجمی کا دل تیزی سے دھڑکنے لگتا مگر اس گاڑی میں بدمعاش موجمدار کے آدمی نہیں تھے۔ تین چار اسٹیشن چھوڑنے کے بعد ٹرین کی رفتار تیز ہو گئی۔ اس لئے کہ اگلا اسٹیشن کافی دُور تھا۔

راستے میں کئی ندی نالے آئے ایک دریا بھی آیا دوپہر کو گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی تو ہریل پلیٹ فارم پر اُتر کر کھانے کو چاول اور مچھلی لے آیا۔ سہ پہر تک ٹرین جنگلوں، اونچے نیچے میدانوں، کھیتوں اور تاڑ اور ناریل کے درختوں کے بیچ میں

سے گزرتی چلی گئی۔ تیسرے پہر کے بعد جب دن ڈھلنا شروع ہوا تو بڑے شہر کے مضافات دکھائی دینے لگے۔ ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا کہ ٹرین کلکتے کے دوسرے بڑے ریلوے اسٹیشن سیالدہ کے چھتے ہوئے کشادہ اور بارونق پلیٹ فارم میں داخل ہو گئی۔

نجمی نے لاہور میں کلکتہ شہر کے بارے میں سُن رکھا تھا کہ بھارت کا یہ بھی بمبئی کی طرح ایک بڑا شہر ہے آج وہ کلکتے کو پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ پلیٹ فارم پر لوگوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ نجمی کے دل کو حوصلہ ہوا کہ یہاں وہ آسانی سے تلاش نہیں کی جا سکے گی۔ یہ سوچ کر کہ اس شہر میں پاکستان کا قونصلیٹ ہے نجمی کو بڑی تسلی ہوئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنی منزل کے قریب پہنچ گئی ہے پاکستانی قونصلیٹ والے اسے ضرور پناہ دیں گے اور اسے لاہور بھی پہنچا دیں گے۔ ہریل اور اس کی بیوی رانی نجمی کے دائیں بائیں چل رہے تھے۔

ہریل نے بستر سر پر اٹھا رکھا تھا اس کی موٹی بیوی رانی اسے بار بار کسی بات پر ڈانٹ رہی تھی۔ نجمی کو ہریل پر بڑا ترس آیا بے چارہ اپنی بیوی کے آگے زبان نہیں ہلا سکتا تھا۔ اسٹیشن پر بہت رش تھا۔ اسی رش میں سے گزرتے وہ اسٹیشن سے باہر آ گئے۔

نجمی نے دیکھا کہ ایک کشادہ سڑک پر کاریں رکشے اور بسیں اور لوگ دوڑے چلے جا رہے تھے موسم زیادہ گرم نہیں تھا یہ سب کے سب دھوتی پوش ہندو بنگالی تھے۔ کئی ایک کے کاندھوں سے چھتریاں لٹک رہی تھیں۔ بڑی بڑی اُونچی عمارتیں کھڑی تھیں۔ ہریل نے بستر اُتار کر نیچے رکھ دیا اور دھوتی کے پلو سے پسینہ پونچھتے ہوئے بولا۔

"یہاں سے ہمارا کوارٹر زیادہ دُور نہیں ہے ادھر سے دوتالی بس میں بیٹھیں گے۔"

دوتالی سے مراد بس نمبر بیس تھی۔ یعنی ہاتھ کی تالی کو اگر دو بار بجایا جائے تو

پورے بیس منٹ کا سفر بنتا ہے کلکتے اور رنگون میں بھی تالی کی اصطلاح بڑی عام ہے نجمی نے تالی کا لفظ پہلے بھی سن رکھا تھا۔ آخر بیس نمبر بس آکر رک گئی۔ بس پہلے ہی سواریوں سے بھری ہوئی تھی بڑی مشکل سے نجمی بھی ہریل اور اس کی بیوی کے ساتھ اس میں بیٹھ گئی۔

بس روانہ ہو گئی۔ بس کی کھڑکی سے نجمی کلکتہ شہر کے بازاروں، سربفلک عمارتوں اور بڑی بڑی سجی سجائی دکانوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ بس ہر اسٹاپ پر تھوڑی دیر کو رکتی اور آگے روانہ ہو جاتی۔ ہریل نے کہا تھا ہمارا کوارٹر یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے مگر ابھی تک ان کا کوارٹر نہیں آ رہا تھا۔ نجمی کی بے چینی بھانپتے ہوئے ہریل نے نجمی سے کہا۔

"بس ہمارا محلّہ آ رہا ہے یہ خضر پور جیٹی کی طرف ہے مگر تمہیں کیا معلوم کہ خضر پور جیٹی کہاں ہے تم تو پہلی بار کلکتے آ رہی ہو۔"

ہریل کی بیوی نے پوچھا۔

"چندا بیٹی! کیسا لگا کلکتہ پسند آیا؟"

نجمی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں موسی بہت پسند آیا مگر خضر پور جیٹی کتنی دور ہے ابھی؟"

"بس ہم پہنچنے ہی والے ہیں۔" ہریل نے بیڑی نکالتے ہوئے کہا۔

جیٹی کے لفظ سے نجمی سمجھ گئی کہ یہ علاقہ دریائے ہگلی کے قرب و جوار میں ہو گا۔ جغرافیے کی کتاب میں اس نے پڑھ رکھا تھا کہ کلکتے میں دریائے ہگلی بہتا ہے جس کو دریائے جمنا بھی کہتے ہیں۔ کلکتے کی بندرگاہ دریائے ہگلی پر ہی واقع ہے۔

سورج غروب ہو رہا تھا کہ نجمی کو ہواؤں میں دریا کی رطوبت محسوس ہوئی بس ایک نسبتاً ویران سے علاقے سے گزر رہی تھی۔ یہاں کوٹھیاں بہت کم تھیں زیادہ تر اونچی ڈھلانی چھتوں والے مال گودام اور بیرکیں سی بنی ہوئی تھیں۔ سڑک پر ناریل اور تاڑ کے چھریرے درخت جھکے ہوئے تھے۔

دریا کی طرف سے آنے والی ہواؤں میں سرکنڈوں اور مچھلی کی ملی جلی بو ملی ہوئی تھی نجمی کو بدمعاش موجمدار اور اس کے آدمیوں کے چنگل سے نکل آنے کی بہت خوشی ہو رہی تھی اب وہ چاہتی تھی کہ جلدی سے رات گزرے اور دوسرے دن صبح صبح ہی وہ کسی ٹیکسی والے یا رکشا والے سے پتہ پوچھ کر پاکستانی قونصل جنرل کے دفتر میں پہنچ جائے اور انہیں اپنی دکھ بھری کہانی بیان کرے اور پھر ان کی مدد سے وہ پاکستان اپنے ماں باپ کے پاس پہنچنے کی کوشش کرے اس نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ جو گزر چکی سو گزر چکی اب خواہ کتنی ہی بدنامی ہو وہ اپنے ماں باپ کے قدموں میں زندگی گزارے گی۔ بس ایک موڑ پر پہنچ کر رک گئی۔

یہ علاقہ شہر سے کافی دور معلوم ہوتا تھا۔ شام کا اندھیرا ابھی نہیں چھایا تھا دور تاڑ کے چھدرے درختوں کے پیچھے ایک اونچی عمارت نظر آ رہی تھی۔ ہریل اور اس کی موٹی بیوی نے نجمی کو ساتھ لیا اور سڑک سے اتر کر ایک پگڈنڈی پر ہو گئے۔ ہریل نے بستر اپنے سر پر اٹھا لیا تھا وہ کہہ رہا تھا۔

"بس وہ سامنے والے درختوں میں ہمارا کوارٹر ہے کلکتہ میں کوئی کھولی بھی مل جائے تو بڑے دھن بھاگ ہوتے ہیں۔"

پگڈنڈی ایک طرف درختوں میں گھومی تو سامنے ڈھلوان چھت والا دومنزلہ مکان ایک طرف کو جیسے جھکا ہوا موجود تھا۔ ہریل کی بیوی رانی آگے آگے تھی۔ نجمی اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ رانی بولی۔

"مالک نے ہمیں نچلی منزل کے دو کمرے دے رکھے ہیں اوپر والی منزل میں اس کا گودام ہے۔"

ہریل نے سر پر بستر اٹھا رکھا تھا جس کی وجہ سے اس کا سانس پھول رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"بیٹی! ہم دونوں کے لئے تو ایک کمرہ ہی کافی تھا اب تو ہمارے پاس دو کمرے ہیں۔ تم اگر چاہو تو ایک کمرے میں ڈیرہ جما لینا۔"

ہرپل کی موٹی بیوی نے مکان کا تالا کھولا۔ اندر ایک چھوٹا سا صحن تھا جس میں پیپل
کا درخت اگا تھا۔ صحن کی دیواریں بارش کی وجہ سے سیاہ ہو رہی تھیں۔ سامنے دو کمرے
تھے ان کے درمیان سے ایک زینہ اوپر والی منزل کو جاتا تھا۔ مکان کے پچھلے برآمدے
میں ایک جانب غسل خانہ اور دوسری جانب کچن تھا۔ کمرے بوسیدہ اور سیل زدہ،
تھے۔ ہر کمرے میں ٹین کے صندوقوں کے درمیان بانس کی چارپائی بچھی تھی۔

ایک کمرے میں چٹائیوں کے فرش پر تین میلے کچیلے تکیے اوندھے پڑے تھے
نجمی کو اس گھر کی فضا سخت ناگوار لگی۔ مگر اس نے تو یہاں ایک رات ہی گزارنی
تھی۔ دوسرے دن اس نے وہاں سے پاکستانی قونصل خانے جانے کا عہد کر رکھا تھا۔
ہر کمرے کی دیواروں پر کالی دیوی کی فریم کی ہوئی تصویریں لگی تھیں۔ اس دیوی کو ہرپل
اور رانی درگا دیوی کہہ کر پکارتے تھے۔

انہوں نے آتے ہی درگا دیوی کی تصویر کے آگے ہاتھ جوڑ کر سر جھکایا لوبان
سلگایا اور نجمی سے بھی ماتھا ٹیکنے کو کہا۔ نجمی نے بادل نخواستہ درگا دیوی کی تصویر کو
پرنام کیا اور پھر نہانے کے لئے غسل خانے کی طرف چلی گئی۔

رات کو انہوں نے عقبی برآمدے میں ناریل کی چٹائی پر بیٹھ کر دال بھات کھایا۔
نجمی کو انہوں نے سونے کے لئے وہ کمرہ دیا جس میں چٹائیوں کا فرش بچھا تھا۔ نجمی کو
اس بات کا بڑا اطمینان تھا کہ وہ بدمعاش بردہ فروش موجمدار کے پنجے سے نکل آئی
ہے۔ یہ اتنا بڑا شہر تھا کہ نجمی کا پتہ چلانا نجمی کے خیال میں کوئی آسان بات نہیں تھی۔
جب وہ کمرے میں اکیلی رہ گئی تو اس نے پوٹلی کھول کر دیکھا۔ اس کے پاس صرف
سات روپے رہ گئے تھے۔ ان روپوں سے وہ ٹیکسی کروا کر پاکستانی قونصل خانے
پہنچ سکتی تھی۔ اگر پیسے کم ہوئے تو وہ قونصل خانے میں اپنے پاکستانی بھائیوں سے
لے سکتی تھی۔

پاکستان کا تصور اس وقت نجمی کو جیسے جنت کا تصور معلوم ہوتا تھا۔ اسے
اپنے المناک مصائب کا دور ختم ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ ہرپل اور اس کی بیوی

سے پاکستانی قونصل خانے کے بارے میں پوچھنے کی غلطی نہیں کر سکتی تھی۔ اس خیال
سے نجمی کو نیند نہیں آ رہی تھی کہ کل اس وقت وہ پاکستانی قونصل خانے میں اپنے
ہمدرد بھائیوں کے درمیان ہوگی۔

وہ چٹائی پر لیٹ گئی۔ کمرے میں صرف ایک بلب جل رہا تھا جس کی روشنی
بہت کمزور تھی۔ چھت کے ساتھ پنکھا بڑی دھیمی رفتار سے چل رہا تھا نجمی جس وقت
کھانا کھا کر اس کمرے میں آئی تھی اور ہرپل اور اس کی بیوی دوسرے کمرے میں گئے
تھے تو اس وقت رات کے دس بج رہے تھے یہ ٹائم ہرپل نے صندوق میں سے ٹائم
پیس نکال کر نجمی کو بتایا تھا۔ ہرپل نے نجمی کو کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا تھا۔
"چندا بیٹی آرام کرو تم بہت تھک گئی ہو۔ کل تمہیں سیٹھ بندو کے اسکول لے چلوں
گا" نئی جگہ اور نامانوس فضا کے باعث نجمی کی نیند غائب تھی اس کے باوجود کچھ دیر
گزرنے کے بعد نجمی کی آنکھیں بوجھل ہونے لگیں۔ عجیب وحشت ناک جنگلوں میں سے
بھاگتی ہوئی وہ اسٹیشن تک آئی تھی۔

اس کا جسم تھکان سے اب بھی چور تھا۔ اس پر غنودگی طاری ہونا شروع ہو گئی
اس نے ہلکی سی جھپکی لی تھی کہ ایک آہٹ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ یہ آہٹ ایسی
تھی جیسے کسی نے صحن کا دروازہ کھول کر بند کیا ہو۔ نجمی نے کان لگا دیئے۔ باہر سناٹا
چھایا ہوا تھا۔ دور بندرگاہ کی طرف سے ایسی آواز آ رہی تھی جیسے کوئی کسی جگہ ہتھوڑا
چلا رہا ہو۔

یہ آواز بڑی دھیمی اور وقفے وقفے سے آ رہی تھی۔ نجمی کو جب دوسری بار
کچھ سنائی نہ دیا تو وہ اسے اپنا وہم سمجھ کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ اسے کوشش
کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ آنکھیں بند کرنے کی دیر تھی کہ وہ گہری نیند میں کھو گئی۔
اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کب تک سوئی ہوگی کہ اچانک جیسے کسی کھٹکے
سے اس کی آنکھ ایک بار پھر کھل گئی۔ نجمی خواب آلود آنکھیں کھولے چھت کو تک
رہی تھی۔ وہ اندازہ نہیں کر پا رہی تھی کہ یہ کس چیز کا کھٹکا تھا جس کی وجہ سے

اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ باہر موت جیسی خاموشی طاری تھی۔ بندرگاہ کی طرف سے آنے
والی دھیمی آواز بھی اب بند ہو چکی تھی۔ نجمی نے ایک بار پھر اسے اپنا وہم سمجھ کر آنکھیں
بند کی ہی تھیں کہ اسے کمرے کے باہر انسانی قدموں کی چاپ سنائی دی یہ آواز دروازے
کے پاس آکر رک گئی۔ نجمی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

اس نے جسم پر ساڑھی کو درست کیا اور ایک طرف سمٹ کر بیٹھ گئی۔ اس
کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ آنکھیں بند دروازے پر جمی تھیں۔ وہ سمجھ گئی کہ کسی
خطرے میں گھر گئی ہے۔ کمرے میں کوئی کھڑکی بھی نہیں تھی۔ صرف ایک ہی روشندان
تھا جو فرش سے کافی اونچا چھت کے قریب تھا۔ نجمی نے اندر سے چٹخنی لگا رکھی
تھی۔ اس نے سوچ لیا کہ خواہ کچھ ہو جائے وہ دروازہ نہیں کھولے گی۔

اتنے میں فضا کے سناٹے میں دروازے کے باہر اسے ہریل کی بیوی رانی
کی آواز سنائی دی۔ وہ درد بھری آواز میں کہہ رہی تھی۔

"چندا بیٹی تمہارے دادا منی کو کچھ ہو گیا ہے۔ بھگوان کے لئے اسے آکر
دیکھو۔ وہ بے ہوش پڑا ہے۔"

رانی نے سسکیاں بھرنی شروع کر دیں نجمی کا آدھے سے زیادہ خوف دور
ہو گیا۔ وہ تو خواہ مخواہ گھبرا گئی تھی۔ مگر ہریل دادا کیوں بے ہوش ہو گیا ہے؟ یہی
سوچتی نجمی اٹھی اور اس نے دروازہ کھول دیا دھڑاک سے دروازے کو ایک
طرف کرتے دو ہٹے کٹے آدمی اندر گھس آئے۔ رانی ان کے پیچھے ہو گئی تھی انہوں
نے آتے ہی نجمی کو دبوچ کر چٹائی پر گرا لیا۔ ایک نے اس کے منہ پر کپڑا کس کر
باندھا اور دوسرے نے اس کی ٹانگیں اور بازو رسی سے باندھے۔ نجمی بوکھلائی ہوئی
آنکھوں سے انہیں تکنے لگی۔ رانی نے اندر داخل ہو کر کہا۔

"چاہے اسے اوپر والے گودام میں بند کر دو چاہے تو ابھی لے جاؤ۔"

دونوں آدمیوں میں سے ایک نے نجمی کو اٹھا کر اپنے کاندھے پر ڈال لیا اور
بولا۔

"روپا جب مال کے پیسے چکا دیتا ہے تو اسے اٹھا کر لے جاتا ہے بائی۔"

اس آدمی کا نام روپا تھا وہ اپنے ساتھی کے ہمراہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ نجمی
کا منہ اس طرح بند کر دیا گیا تھا کہ وہ چیخ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں
بھی بندھے ہوئے تھے۔ اس نے آنکھیں بند کر کے اپنی گردن نیچے ڈال دی شاید
اس کی اذیتوں اور بھیانک مصائب کا ایک نیا دور شروع ہونے والا تھا۔

دونوں آدمی رات کے اندھیرے اور سناٹے میں مکان کے صحن میں آئے تو
وہاں ہریل موجود تھا۔ وہ آہستہ سے بولا۔

"اسے لے جا رہے ہو تو جیٹی کی پہلی چورنگی سے مڑ جانا۔ ادھر رات کو
سپاہی راؤنڈ پر ہوتے ہیں۔"

روپا نے اسے گالی دے کر کہا "ہمیں معلوم ہے کدھر سے جانا ہے۔"

مکان سے کچھ فاصلے پر ایک ٹیکسی کھڑی تھی جو خالی تھی۔ نجمی کو پچھلی سیٹ پر
گرا دیا گیا۔ اس کے ساتھ روپا کا دوسرا ساتھی جس کو روپا کالی کہہ کر پکارتا تھا بیٹھ
گیا۔ روپا خود اسٹیئرنگ پر جا بیٹھا۔ اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی کو کچے
سے نکال کر بڑی سڑک پر ڈال دیا۔

نجمی نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ آنکھیں بند کرنے کے سوا کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی
ٹیکسی طوفانی رفتار کے ساتھ دوڑی جا رہی تھی۔ نجمی نے دو ایک بار آنکھیں کھول
کر ٹیکسی کی چھت کو دیکھا۔ سڑک کی روشنیوں کا عکس چھت پر سے تیزی سے گزر جاتا
اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ کون سا علاقہ ہے۔ وہ کہاں سے گزر رہی ہے اور اسے
کہاں لے جایا جا رہا ہے۔

ہریل دادا اور رانی نے اسے آگے بیچ دیا تھا جس شخص نے اسے خود بیٹی
کہہ کر پکارا تھا اس نے اس کا سودا کر دیا تھا۔ ایک ایک کر کے نجمی کے دل میں
اخلاقی قدروں کے شیشے چور چور ہو رہے تھے۔ انسانی رشتوں پر سے اس کا اعتماد اٹھتا
چلا جا رہا تھا۔ ان مقدس رشتوں کا وہ اپنی آنکھوں کے سامنے خون ہوتا دیکھ رہی تھی

کسی وقت اس کا خون انتقام کی آگ سے بھڑک اٹھتا۔ لیکن یہ آگ سوائے اسے ہی جلانے کے اور کچھ نہیں کر رہی تھی۔

روپا گاڑی چلا رہا تھا۔ اس کا ساتھی کالی نجی کے تقریباً اُوپر بیٹھا ہوا تھا۔ نجی کا ایک پورا بازو اس کے نیچے دبا ہوا تھا۔ روپا نے تیز آواز میں کالی کو گالی دے کر بنگلہ میں کہا۔

"وہ تیری ماں وہاں پر ہو گی اس وقت؟"

کالی نے فوراً جواب دیا۔

"دادا وہ کیوں نہیں ہو گی میں نے اسے تھوڑی دیر پہلے اطلاع کروا دی تھی کہ ہم مال لے کر آ رہے ہیں۔" وہ اڈے پر پہنچ جائے۔

دونوں ایک بار پھر خاموش ہو گئے۔ ٹیکسی خدا جانے کلکتے کے کون سے علاقے میں سے گزر رہی تھی اب سڑکوں کی روشنیوں کے عکس بھی ٹیکسی کے اندر چھت پر نہیں پڑ رہے تھے۔ کوئی ٹرک تیزی سے ٹیکسی کے قریب سے گزر گیا۔ اس کی ہیڈ لائٹس کی روشنی پڑی تو کالی نے نجی کے اُوپر اپنی چادر ڈال دی۔

کافی دیر تک سڑکوں پر دوڑنے کے بعد ٹیکسی کی رفتار دھیمی ہونے لگی اور پھر وہ ایک موڑ گھوم کر غیر ہموار سڑک پر آ گئی۔ پہلی بار نجی کو دھچکے لگنے لگے دور کسی جانب سے رات کے سناٹے میں کسی کتے کے بھونکنے کی آواز تھوڑی دیر بلند ہو کر غائب ہو گئی۔ ٹیکسی نے تیزی سے ایک اور موڑ کاٹا اور پھر جیسے ایک گیراج میں پہنچ کر رک گئی۔

روپا نے انجن بند کر کے دروازہ کھولا اور بولا۔

"نکال اس سالی کو باہر اور ادھر لے چل وہ تمہاری ماں یہاں کہیں نہیں ہے کالی۔"

کالی نے نجی کو سیٹ پر اٹھا کر بٹھا دیا۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں کھول دیئے منہ پر کپڑا بندھا رہنے دیا۔ کالی نے زور سے ایک طمانچہ نجی کے منہ پر مارا۔ نجی کی آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔ ساتھ ہی کالی نے اسے گالی دے کر کہا۔

"میرے آگے آگے چل۔"

اور اس نے دروازہ کھول کر نجی کو باہر کھڑا کر دیا۔ یہ ایک گیراج تھا۔ نجی کا سر چکرانے لگا تھا۔ منہ پر کپڑا بندھا ہونے کی وجہ سے وہ کتنی دیر سے مسلسل ناک سے سانس لے رہی تھی۔ اس کا سانس یوں پھول رہا تھا جیسے وہ بھاگتی ہوئی آ رہی ہو۔ چکر آنے کی وجہ سے وہ گرنے لگی تو اس نے ٹیکسی کے دروازے کو تھام لیا۔ روپا نے گیراج کے اندر ہی بنا ہوا ایک چھوٹا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"اسے پیچھے لے آ تیری ماں لکھی بائی کی گاڑی باہر نہیں تھی۔"

کالی نے نجی کو سہارا دیا پھر اس کو بازو سے پکڑ کر آگے کو دھکیل دیا۔

"آگے آگے چل ری سیدھی۔ ہم تیری ایسی عورتوں کو خوب جانتے ہیں چل"

گیراج کے اندر والا دروازہ ایک تنگ و تاریک کمرے میں کھلتا تھا۔ روپا نے کمرے میں آتے ہی بتی روشن کر دی۔ نجی کی آنکھیں چکا چوند سی ہو گئیں۔ روپا نے اسے اپنے پلنگ پر دھکا دے کر پھینک دیا۔

"یہاں لیٹ جا ری چندا۔"

کمرے کی فضا میں گھٹن اور عجیب قسم کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ نجی پلنگ پر سمٹی ہوئی پڑی تھی۔ روپا نے جیب سے ڈبی نکال کر سگریٹ سلگایا اور لوہے کی کرسی گھسیٹ کر اس پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"کالی باہر جا اور اپنی ماں لکھی بائی کو دیکھ۔ اگر وہ نہ آئی تو میں ساری رقم تم سے دھر لوں گا۔"

کالی اپنے بالوں کو جھٹکتا ہوا دروازے میں سے واپس گیراج میں چلا گیا۔

روپا لوہے کی کرسی پر بیٹھا سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگا رہا تھا۔ کمرے میں چھت کے ساتھ لٹکتا ہوا بلب روشن تھا۔ روپا کے بال کالے سیاہ گھنگھریالے تھے اس نے دھاری دار ٹی شرٹ اور میلی کچیلی پتلون پہن رکھی تھی۔ کلائی پر سنہری زنجیر چمک رہی تھی۔ اس نے گردن گھما کر نجی کی طرف دیکھا اور سگریٹ کا کش لگا کر

دھواں چھوڑا اور بولا۔

"کیوں ری اس سے پہلے تو کس کے پاس تھی؟ تیرا اس میں سے کوئی بچّہ وچّہ تو نہیں ہے؟ ہے تو ابھی بتا دے؟"

نجمی نے اپنے منہ پر بندھے ہوئے کپڑے کی طرف اشارہ کیا۔ روپا نے اُٹھ کر نجمی کے منہ پر بندھا ہوا کپڑا کھول دیا۔ نجمی کو ایسے لگا جیسے وہ قبر کی فضاء سے نکل کر ایک دم کھلی فضاء میں آ گئی ہو۔ روپا ایسے جرائم پیشہ افراد کی باتیں سن سن کر نجمی ان کی نفسیات سے کافی حد تک واقف ہو گئی تھی۔ ایک بات اس کے ذہن میں واضح ہو گئی تھی کہ ان کے آگے رونے دھونے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ان پر کسی دوسرے طریقے سے ہی اثر ڈالا جاتا ہے۔

نجمی نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔" مجھے پہلی بار اٹھایا گیا ہے۔ میں ایسی ویسی عورت نہیں ہوں۔" روپا نے نجمی کو گھور کر دیکھا۔ پھر طنزیہ انداز میں ہنسا اور چٹکی سے سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر بولا۔" سب یہی کہا کرتی ہیں سالیاں کئی کئی مردوں کے ہاتھوں میں بک چکی ہوتی ہیں اور کہتی ہیں ہمیں پہلی بار اٹھایا گیا ہے۔"

نجمی پلنگ پر اُٹھ کر بیٹھنے لگی تو روپا نے ڈانٹ کر اسے ایک فحش گالی دی اور کہا۔

"اسی طرح لیٹی رہ۔۔۔۔۔"

نجمی وہیں سہم کر لیٹ گئی۔ اتنے میں باہر کسی گاڑی کی آواز سنائی دی۔ روپا اُٹھ کر گیراج والے دروازے میں سے جھانکنے لگا۔ گاڑی کا انجن بند ہو گیا تھا۔ کالی نے گیراج میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"روپا! لکھی بائی آ گئی ہے۔"

"اسے آنے دے اس سالی کو بھی۔"

یہ کہہ کر روپا واپس کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ کالی اندر آیا اس کے پیچھے پیچھے ایک بھاری بھرکم عورت تھی جس نے پھولدار ساڑھی پہن رکھی تھی۔ عمر پچاس سے اوپر

ہو گی چہرے سے کرختگی اور سنگدلی ٹپکتی تھی اس کے ہاتھ میں سگریٹ تھا اور پان چبا رہی تھی۔ آتے ہی نجمی کو قریب سے جھک کر دیکھا۔ اس کی پسلیوں میں ہاتھ ڈال کر ٹٹولا۔ انگلی سے آنکھوں کے پپوٹوں کو کھول کر گھورا پھر ہوں کہہ کر دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔

روپا بولا۔

"لکھی بائی! روپا ہمیشہ کھرا مال بیچتا ہے۔ لڑکی کی عمر بیس سال سے اُوپر نہیں گوری چٹی بھی ہے جسم بھی سڈول ہے۔ تجھ سے جو سودا ہوا ہے میں اس سے ایک ہزار روپے زیادہ لوں گا۔"

لکھی بائی نے سگریٹ کا کش لگا کر گل جھاڑا اور نرمی سے بولی۔

"جتنی رقم تم نے مانگی تھی وہ میں لے آئی ہوں۔ گاڑی میں پڑی ہے جا کر تھیلا اُٹھا لاؤ۔ یہ لو چابی۔"

لکھی بائی نے پرس میں سے گاڑی کی چابیاں نکال کر روپا کی طرف بڑھائیں روپا کچھ دیر لکھی بائی کو تکتا رہا پھر چابیوں کا گچھا ہاتھ بڑھا کر لے لیا اور بولا۔

"سوچ لو لکھی بائی تمہیں آگے بھی مجھ سے کام پڑے گا۔"

لکھی بائی نے نجمی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"تم کو معلوم ہے ہمیں اس پر ابھی کتنی محنت کرنی پڑے گی گانے بجانا نہ سہی کم از کم ڈانس تو سکھانا پڑے گا۔ پھر اس کی چوکیداری بھی کرنی ہو گی۔ ابھی اس میں شرم اور خوف ہے ان دونوں چیزوں کو اس کے اندر سے نکال پھینکنا ہو گا۔ ایسے ہی اس کو آگے سپلائی نہیں کرنا مجھے۔"

روپا بدمعاش سر کو جھٹک کر باہر نکل گیا۔ نجمی ایک دلدل سے نکل کر دوسری دلدل میں گر پڑی تھی۔ یہاں سے وہ کیسے نکل سکے گی؟ یہ اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ لکھی بائی نجمی کے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی اور کالی کی طرف دیکھ کر بولی۔

"ابھی اسے تم لوگ میرے جنگل والے ڈیرے پر پہنچاؤ گے۔" کالی نے بڑی

کا کش لگاتے ہوئے کہا۔

"لکھی بائی تمہارے ساتھ ہمارا یہ ٹھیکہ نہیں ہوا۔"

اتنے میں روپا بدمعاش بھی آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں چمڑے کا تھیلا تھا۔ لکھی بائی نے کہا۔ "رقم پوری کر لی تم نے روپا۔"

"کر لی ہے۔ اب تم اسے لے کر یہاں سے چلتی بنو لکھی بائی۔"

کالی بولا۔ دادا! یہ کہتی ہے مال اس کے جنگل والے ڈیرے میں پہنچانا ہو گا۔"

روپا تنک کر بولا "وہ کس حساب میں؟ تمہارے اپنے آدمی کہاں ہیں؟ وہ بدمعاش تم نے کس لئے پال رکھے ہیں؟"

لکھی بائی سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے بولی۔

"ان میں سے کوئی بھی اس وقت فارغ نہیں تھا۔ اچھا چلو میں تمہیں اپنے ڈیرے تک مال پہنچانے کے پانچ سو روپے الگ دیئے دیتی ہوں۔"

روپا اسی وقت راضی ہو گیا۔ فوراً نجمی کے منہ پر کپڑا باندھ کر اس کی مشکیں کس دی گئیں اسے گاڑی میں ڈال دیا گیا اور گاڑی لکھی بائی کے خفیہ اڈے کی طرف روانہ ہو گئی۔ پیچھے پیچھے لکھی بائی کی گاڑی آ رہی تھی۔ دونوں گاڑیاں کلکتہ شہر کے مضافات سے نکل کر ویران علاقے میں آ گئیں۔ ایک جگہ سے انہوں نے دریا بھی عبور کیا۔ نجمی کو ایک بار پھر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر اوندھا لیٹا کر اس کے اوپر کپڑا ڈال دیا گیا تھا۔

کالی بدمعاش اس کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ گاڑیاں ایک گھنٹے تک سفر کرتی رہیں اب وہ رات کے اندھیرے میں پٹ سن اور دھان کے کھیتوں اور آبادی سے، بہت دور جنگل کے ایک غیر آباد خطے میں آ گئی تھیں۔ یہاں زمین اونچی نیچی تھی جگہ جگہ جنگلی گھاس اور جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں ناریل کے درختوں میں کسی پرانی مڑھی کا کھنڈر تھا اس سے ذرا آگے ٹوٹی پھوٹی چار دیواری کے اندر ایک ڈھلوان چھت والا بوسیدہ مکان بنا ہوا تھا۔ اس کی کھڑکیوں کے چھجے ٹیڑھے ہو کر ایک طرف کو

جھک گئے تھے اس مکان کے ایک حبس زدہ کمرے میں نجمی کو لکڑی کے پلنگ پر ڈال دیا گیا جس پر صرف پٹ سن کا پتلا سا گدا ہی بچھا تھا۔ پلنگ پہ مچھر دانی لگانے کے لئے چار بانس لگے تھے مگر مچھر دانی غائب تھی۔ چھت پر کوئی پنکھا نہیں تھا مچھروں کی بھرمار تھی۔ نجمی کی رسیاں اور منہ پر بندھا ہوا کپڑا کھول دیا گیا۔ روپا کالی چلے گئے لکھی بائی کمرے میں رہ گئی۔

نجمی نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے اور عاجزی سے کہا۔

"موسی! مجھ پر رحم کرو۔ میں ایک شریف عورت ہوں۔"

لکھی بائی پرس میں سے چھوٹا سا چینی پنکھا نکال کر اپنے چہرے کو ہوا دینے لگی اس کی نظریں دروازے پر لگی تھیں۔ نجمی نے ایک بار پھر لکھی بائی سے التجا کی کہ وہ اس کی زندگی کو تباہی کے راستے پر نہ ڈالے لکھی بائی پر اس کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ برابر دروازے کی طرف تک رہی تھی۔ پھر ایک دم سے چلائی۔

"دھومل! ہریا! تم لوگ کہاں مر گئے ہو۔"

اور پھر نجمی نے دو ناٹے قد کے گٹھے ہوئے جسم والے کالے کالے آدمیوں کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا جن میں سے ایک کے ہاتھ میں ہنٹر تھا۔

"بائی اب تم جاؤ۔ ہم جانیں ہمارا کام۔"

لکھی بائی کو وہاں سخت گرمی لگ رہی تھی۔ وہ تیز تیز چلتی کمرے سے نکل گئی۔ اس حبس آلود کمرے میں نجمی اور وہ دونوں ہندو بنگالی اکیلے رہ گئے۔ یہاں دیوار کے ساتھ ایک لالٹین لٹک رہی تھی جس کی روشنی ناکافی تھی۔ ایک آدمی نے کمرے کا دروازہ بند کر کے اندر سے چٹخنی لگا دی۔

نجمی کا دل کانپ گیا۔ اس پر گھناؤنے مظالم کی ابتداء ہونے والی تھی۔ تھوڑا بہت اعتماد جو نجمی کے پاس تھا وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا اور نجمی اپنے آپ کو ایک انتہائی کمزور اور مظلوم عورت محسوس کرنے لگی۔ دھومل نے ہنٹر کو آہستہ سے پھٹکارا اور ہریا سے کہا۔

"ہریا! کام شروع کر دو۔"

ہریا نے پہلا کام یہ کیا کہ ڈھولو کی مدد سے نجمی کے دونوں پاؤں اور ہاتھ پلنگ کے چاروں بانس کے ڈنڈوں سے کس کر باندھ دیئے۔ پھر ہریا نجمی کے سرہانے کی جانب اسٹول رکھ کر بیٹھ گیا اور بنگلہ زبان میں اسے انتہائی واہیات قسم کی گالیاں دینی شروع کر دیں۔ نجمی کو یوں لگا جیسے اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالا جا رہا ہے وہ اپنے کان بند نہیں کر سکتی تھی۔

اس کے دونوں ہاتھ بانسوں سے بندھے ہوئے تھے۔ دس منٹ تک ہریا گالیاں دیتا رہا۔ اس کے بعد اس کی جگہ ڈھولو اسٹول پر بیٹھ گیا اور اس نے نجمی کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔ وہ یوں مشین کی طرح بول رہا تھا جیسے منتر پڑھ رہا ہو۔ یہ نجمی کی برین واشنگ کا ایک طریقہ تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ نجمی کی شخصیت میں جو عورت کا تقدس اور روحانی پاکیزگی کا جذبہ ہے۔ وہ تڑپ تڑپ کر جان دیدے۔

نجمی نے آنکھیں بند کر کے اپنے ہونٹ دانتوں تلے دبا رکھے تھے۔ پھر اس کے حلق سے ایک چیخ نکل گئی چیخ جیسے کمرے کی چھت میں شگاف ڈال کر آسمان کی وسعتوں میں گم ہو گئی تھی مگر ڈھولو اور ہریا پر اس چیخ کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ باری باری مسلسل گالیاں بک رہے تھے۔

○
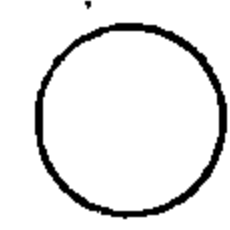
سات روز تک نجمی کو پلنگ کے ساتھ باندھے رکھا گیا صرف غسل خانے میں لے جانے کے لئے تھوڑی دیر کے لئے کھول دیا جاتا۔ نجمی کے پاؤں لڑکھڑا رہے ہوتے تھے۔ اسے ایسی ایسی اذیتیں دی گئیں کہ بعد میں ان کا تصور کر کے بھی نجمی کی روح کانپ اٹھتی تھی اور مردوں کے خلاف نفرت کا لاوا اس کے سینے میں ابلنے لگتا اس دوران اس کے کانوں میں ناشائستہ الفاظ کے زہر گھولنے کا سلسلہ باقاعدگی سے جاری رہا اسے ساری ساری رات جگائے رکھا جاتا۔ صرف دن میں تھوڑی دیر کے لئے

اس کی مشکیں کھول کر اسے سونے کی اجازت تھی۔ نجمی کا وجود زخموں سے چھید چھید ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھیں ہر وقت پتھرائی ہوئی رہتی تھیں۔ وہ احتجاج اور التجائیں بھول چکی تھی اسے اپنے ماں باپ شبانہ ندیم اور لاہور کے اپنے پیارے چہرے بھی بھولتے جا رہے تھے آٹھویں روز نجمی کو پلنگ سے کھول دیا گیا۔

اب اسے اچھی خوراک دی جانے لگی۔ اسے جی بھر کر سونے کی اجازت مل گئی نجمی بے سدھ پڑی رہتی۔ ایک ہفتے تک اسے عمدہ غذا اور آرام پہنچایا گیا۔ تیسرے ہفتے ڈھولو اور ہریا ایک ماسٹر جی کو وہاں لے آئے جس نے نجمی کو رقص کی تعلیم دینی شروع کر دی۔

نجمی ذرا تساہل سے کام لیتی تو ڈھولو اور ہریا اسے گالیاں دیتے، پیٹنے لگتے اسے دبوچ کر جسم کو جلتے ہوئے سگریٹ سے داغا جاتا۔ نجمی کی چیخیں نکل جاتیں۔ ایک مہینے تک ماسٹر جی نجمی کو مجرا کرنا سکھاتے رہے۔ اب لکھی بائی نے بھی وہاں روزانہ آنا شروع کر دیا تھا۔ جب ماسٹر چلا جاتا تو لکھی بائی نجمی کے پاس بیٹھ کر اس سے محبت کا اظہار شروع کر دیتی۔ اسے بتاتی کہ اب وہ ساری زندگی عیش کرے گی۔ اس کی زندگی کا شاندار دور شروع ہونے والا ہے وہ قیمتی کپڑے پہنے زیوروں میں لدی پھنسی رہے گی۔ پھر وہ ایک دم پلٹ کر نجمی کو بالوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچتی اور غضبناک آنکھوں سے گھورتے ہوئے کہتی۔

"لیکن اپنے دل میں کبھی بھاگنے کا خیال بھی نہ لانا۔ ہریا اور ڈھولو ہی میرے پاس نہیں ہیں میرے پالے ہوئے قاتل غنڈوں کی تعداد بہت زیادہ ہے تو کلکتہ میں کیا سارے ہندوستان میں جہاں بھی ہو گی وہ تیری بو سونگھ کر وہاں پہنچ جائیں گے اور تیرے پیٹ میں چاقو گھونپ دیں گے۔"

نجمی کا ذہن اب ماؤف ہونا شروع ہو گیا تھا۔ وہ نہ کسی سے التجا کرتی اور نہ کسی کے خلاف احتجاج کرتی تھی۔ ماسٹر جیسے کہتا ڈانس کرتی اس نے کبھی خواب میں بھی رقص نہیں کیا تھا مگر ماسٹر نے اسے مجرے کی طرز پر دو چار توڑے سکھا دیئے تھے

نجمی کسی مشین کی طرح ڈانس کرتی مگر نفرت کی انتقام کی آگ اس کے سینے کے اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔ وہ اس خیال کی اندر ہی اندر پرورش کر رہی تھی کہ اسے ایک دن بدلہ لینا ہے انتقام لینا ہے ان لوگوں سے جنہوں نے اس کی عزت نفس سے کھلونا سمجھ کر کھیلا۔

اسے عورت سے کوڑے کرکٹ کا ڈھیر بنا دیا۔ موجمدار، ہربل، کالی، روپا اور ہر پایہ سب نجمی کی تباہی و بربادی کے نشان تھے اور اب لکھی بائی جو اسے طوائف بنا رہی تھی۔ جس نے اسے طوائف بنا دیا تھا۔

ویران علاقے میں واقع اس گیراج والے مکان کے کمرے میں نجمی کو رہتے ہوئے اذیتیں سہتے اور اب مجرے کی تعلیم حاصل کرتے اور اب سرمایہ دار تماش بینوں کے دل لبھانے کے نرت بھاؤ سیکھتے تیسرا مہینہ شروع ہو گیا تھا۔ لکھی بائی اب نجمی کو اپنے ساتھ مکان سے باہر نکال کر ٹہلوانے بھی لے جاتی تھی۔

دھوبل اور کالی جیب میں پستولیں لئے ان کے پیچھے پیچھے ہوتے تھے۔ لکھی بائی نے نجمی سے کئی بار پوچھا کہ وہ کالی پور میں اپنے خاوند کا پتہ بتائے تاکہ اس کے آدمی اس کے پاس جا کر اسے نجمی کی قیمت ادا کر آئیں مگر نجمی نے ہر بار یہی کہا کہ اس کا خاوند اسے چھوڑ کر مدت ہوئی چلا گیا ہے اور وہ دنیا میں اکیلی ہے۔ نہ اس کا کوئی رشتہ دار ہے نہ بہن بھائی نہ ماں باپ۔ لکھی بائی کو ابھی تک اس حقیقت کا علم نہیں ہوا تھا کہ نجمی ہندوستان کی رہنے والی بنگالی لڑکی چیترا نہیں بلکہ پنجابی لڑکی ہے جسے مشرقی پاکستان کی سرحد سے انڈیا میں اسمگل کیا گیا تھا۔ امید کی ایک ننھی سی جوت ابھی تک نجمی کے دل کے کسی کونے میں روشن تھی کہ اگر اسے کبھی موقع ملا تو وہ اس گناہ کی دلدل سے نکل کر مشرقی پاکستان یا کلکتے کے پاکستانی قونصل خانے میں جا کر پناہ حاصل کر لے گی۔

نجمی اپنا سب کچھ کھو چکی تھی اس کے پاس سوائے اپنی جان کے اور کچھ بچانے کے لئے نہیں تھا۔ وہ اب کسی وقت لکھی بائی سے ہنس کر بات بھی کر لیتی تھی۔

اس نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا اور وقت کا انتظار کر رہی تھی۔ اپنی تباہی اور بربادی کے ذمے دار افراد سے سنگین بدلہ لینے کا یا وہاں سے فرار ہو کر پاکستانی قونصلیٹ پہنچنے کا۔

لیکن بہت جلد اس کا یہ راز بھی طشت ازبام ہو گیا۔ ابھی وہ گیراج والے ویران مکان میں ہی تھی کہ ایک روز مونچھوں والا موجمدار وہاں آ گیا۔ لکھی بائی اس کے ساتھ تھی۔ وہ اسے نیا خریدا ہوا اور منڈی کے لئے تیار کیا ہوا مال دکھانے لائی تھی۔ موجمدار نے نجمی اور نجمی نے موجمدار کو دیکھا تو دونوں جیسے دم بخود سے ہو کر رہ گئے۔ موجمدار نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "لکھی بائی تو یہ ہے تیرا نیا مال۔"

"ہاں۔ کیوں تجھے پسند نہیں لڑکی؟" لکھی بائی نے تعجب سے پوچھا۔

موجمدار لکھی بائی کو ساتھ والے کمرے میں لے گیا اور بولا۔ "لکھی بائی۔ یہ لڑکی میں نے مشرقی پاکستان سے خریدی تھی میں ہی اسے انڈیا کا بارڈر کراس کروا کر لایا تھا مگر یہ کالی پور والے ٹھکانے سے فرار ہو گئی۔ میں تو کئی روز سے اس کی تلاش میں تھا۔"

موجمدار نے لکھی بائی کو بتایا کہ یہ لڑکی مشرقی پاکستان کی رہنے والی ہے اور مسلمان ہے۔ اس کے بارے میں کسی نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ یہ اصل میں پنجابن ہے۔ کوئی اسے جھانسہ دے کر اغوا کر کے کراچی لے گیا وہاں اس سے زبردستی بیاہ کر کے مشرقی پاکستان لے آیا اور پھر یہ ہمارے پاس پہنچ ہی گئی۔

"بائی میں نے اس کے بدلے پورے تین ہزار کی رقم ادا کی ہے۔ یہ رقم اب تمہیں مجھے دینی ہوگی۔"

لکھی بائی موجمدار کے آگے رعب نہیں دکھا سکتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ موجمدار ایک خونی بدمعاش ہے۔ کئی آدمیوں کا خون کر چکا ہے۔ ویسے بھی لکھی بائی جس دھندے میں تھی اسے ایسے لوگوں سے بنا کر رکھنی پڑتی تھی۔ وہ یک مشت

موجمدار کو اتنی رقم ادا بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کہنے لگی۔
"موجمدار۔ اگر تو سچ کہہ رہا ہے تو تیری رقم مجھ پر ادھار رہی۔ ابھی تو میرا اس پر خرچ ہی خرچ چل رہا ہے جب یہ دھندے پر بیٹھے گی میں وعدہ کرتی ہوں پہلے تیری رقم ادا کروں گی۔"
یہ لوگ آپس میں دیانت داری سے کاروبار کرتے تھے۔ کوئی کسی کی رقم مارنے کا خطرہ مول نہیں لیتا تھا۔ موجمدار بولا۔
"ٹھیک ہے۔ میں اسے تیرے حوالے کرتا ہوں۔ تو اس سے بے شک دھندا کرا۔ مگر ایک بات کا خیال رکھنا۔ یہ لڑکی بغیر پاسپورٹ کے انڈیا میں لائی گئی ہے۔ یہ پاکستان کی رہنے والی ہے۔ اگر یہ کسی طرح سے بھاگ کر پاکستان کے سفارت خانے والوں کے پاس پہنچ گئی تو نہ صرف یہ کہ لڑکی تیرے ہاتھ سے جائے گی بلکہ اُلٹا بھارتی پولیس تجھے بھی پکڑ کر لے جائے گی۔"
لکھی بائی نے کہا۔ "پولیس کو تو میں ماہانہ دیتی ہوں۔"
موجمدار بولا۔ "پولیس کو مجبوراً ہاتھ ڈالنا پڑے۔ کیونکہ یہ انڈیا اور پاکستان کے تعلقات کا معاملہ ہوگا اخبار والے اسے ضرور اُچھالیں گے۔ خاص طور پر کلکتے کے مسلمان بہت شور مچائیں گے۔ اب تو میری بات سمجھ گئی ہو گی۔"
لکھی بائی سوچ میں پڑ گئی پھر کہنے لگی۔ "میں تو اس پر سینکڑوں روپے خرچ کر چکی ہوں۔ اس پر بڑی محنت کی ہے۔ اب یہ بالکل تیار ہو گئی ہے۔ ویسے بھی ایسی خوبصورت اور صحت مند گوری چٹی لڑکی مجھے اتنی آسانی سے نہیں ملے گی۔"
موجمدار بولا۔ "تو گھبراتی کیوں ہے بائی۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں تو ایسا کر کہ اس چندا کے دھندے میں میری دو آنے کمیشن رکھ دے۔ میں جانوں اور میرا کام۔ تو بے فکر ہو جانا۔ چندا تیرے ڈیرے سے اگر مجرا کرنے باہر بھی جائے گی تو میرے آدمی خنجر پستول لئے اس کے ساتھ ساتھ ہوں گے۔ بول تجھے منظور ہے؟"
دو آنے کی کمیشن کا سودا لکھی بائی کے لئے مہنگا نہیں تھا اسے نجمی سے

ہزاروں روپے کے فائدے کی اُمید تھی بلکہ اسے یقین تھا کہ وہ اس گوری چٹی خوبصورت لڑکی کی وجہ سے کسی نہ کسی ریاست کے دیوان یا وزیر کو پھنسا کر اس سے لاکھوں کی رقم حاصل کر سکے گی۔ کہنے لگی۔
"مجھے منظور ہے۔ لیکن میری ایک شرط ہے اگر میں نے اس لڑکی چندا کو کہیں آگے بیچ دیا تو تمہیں پوری رقم میں سے صرف ایک آنہ کمیشن دوں گی۔"
موجمدار ہنستے ہوئے مونچھوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ "لکھی بائی۔ تو بڑی سیانی ہے۔ بڑی اصلی اور پکی نائکہ ہے۔ اب میں جاتا ہوں چندا سے میرے بارے میں کوئی بات نہ کرنا۔ تم کب اس لڑکی کو اپنی کوٹھی پر لاؤ گی؟"
لکھی بائی نے کہا۔ "ایک مہینے بعد۔"
"ٹھیک ہے۔ میں ایک مہینے بعد تمہارے پاس آؤں گا۔"
یہ کہہ کر موجمدار گیراج کے دروازے سے نکل گیا باہر اس کے دو ساتھی گاڑی میں بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ لکھی بائی واپس آئی تو نجمی نے اسے ذرا سا گھور کر دیکھا۔ اسے یقین تھا موجمدار نے لکھی بائی کو سب کچھ بتا گیا ہو گا۔ مگر لکھی خاموش رہی اور دوسری باتیں کرنے لگی۔ نجمی نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔
"یہ موجمدار ہی تھا جو مجھے مشرقی پاکستان میں خرید کر یہاں لایا۔ تمہیں وہ سب کچھ بتا گیا ہے۔ میں بھی تمہیں بتائے دیتی ہوں بائی کہ میں مشرقی پاکستان کی رہنے والی ہوں۔ میں مسلمان ہوں۔ ہندو نہیں ہوں اور شریف ماں باپ کی بیٹی ہوں لیکن ایک لڑکے کی محبت میں گرفتار ہو کر اس کے ساتھ گھر سے بھاگنے کی بھیانک غلطی کر بیٹھی جس کا خمیازہ آج تک بھگت رہی ہوں۔"
نجمی نے لکھی کو یہ نہ بتایا کہ وہ پنجاب کی رہنے والی ہے وہ اپنے آپ کو ابھی تک مشرقی پاکستان میں آباد بہار کی رہنے والی ظاہر کر رہی تھی۔ لکھی بائی کو اس قسم کی باتوں اور واقعات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس کے پاس جو لڑکیاں آتی تھیں ان سب کے حالات ایک جیسے ہی ہوتے تھے۔ وہ ایک جیسی کہانیاں ہی دہراتی تھیں

لکھی بائی ان پر پیسہ خرچ کرتی تھی اور ان سے رقم کماتی تھی۔ لکھی بائی کی کوٹھی پر آئی ہوئی کوئی بھی لڑکی آج تک اس کے چنگل سے فرار نہیں ہو سکی تھی۔ جب وہ دیکھتی کہ لڑکی میں اب پہلے جیسی دلکشی نہیں رہی تو وہ اسے گھٹیا قسم کے دلالوں کے ہاتھ اونے پونے فروخت کر دیتی تھی۔ لکھی بائی کے پالتو غنڈے اس کے مال کی حفاظت کرتے تھے۔ وہ خود بھی ایک جابر اور سنگ دل عورت تھی۔ ساری ساری رات وہ لڑکیوں کے ہاتھ چارپائی کے پایوں کے نیچے رکھ کر اوپر بیٹھی رہتی اور اس کا ضمیر ایک لمحے کے لئے بھی اسے ملامت نہیں کرتا تھا۔

لکھی بائی چھوٹی سی تھی کہ اسے اغوا کر کے اس دھندے میں ڈال دیا گیا تھا۔ اس کے ضمیر کو بھی رونگٹے کھڑے کر دینے والی اذیتیں دے کر مار دیا گیا تھا۔ اس نے نجمی کی طرف قہر آلود آنکھوں سے دیکھا۔ پھر چٹاخ سے ایک بھرپور طمانچہ نجمی کے رخسار پر مارا اور اسے گالی دے کر کہا۔

"مجھے تیرے بارے میں سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ تو بہار کی نہیں پنجاب کی رہنے والی ہے۔ تو جو کوئی بھی ہے اب میرا مال ہے اور میں اپنے مال کی حفاظت کرنا خوب جانتی ہوں۔ میں نے تجھ پر اپنا وقت اور پیسہ یونہی برباد نہیں کیا۔ ایک بات اپنے دماغ میں بٹھا لے کہ تو نے کلکتے میں کسی مسلمان یا پاکستان والوں کے دفتر میں جانے کی کوشش کی تو میرے آدمی تمہیں اسی جگہ شوٹ کر دیں گے۔ تو جہاں بھی جائے گی میرے آدمی بھرے ہوئے پستول لئے سائے کی طرح تیرے ساتھ ساتھ ہوں گے۔ اب ساڑھی بدل ماسٹر آنے والا ہے۔"

نجمی اپنا گال سہلاتی ہوئی اُٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی۔ اس کے دل میں آگ سی لگ رہی تھی۔ کھولتے ہوئے لاوے کا ایک طوفان تھا جو باہر آنے کو بے چین تھا۔ نجمی کی انتقامی فہرست میں لکھی بائی کا نام اب سب سے پہلے نمبر پر آ گیا تھا۔

مزید ایک مہینے تک نجمی کو اس گیراج والے مکان میں رقص کی تعلیم دی گئی۔ اسے تھوڑا تھوڑا گانا بھی سکھایا گیا تھا۔ جب لکھی بائی نے سمجھا کہ اب نجمی کو اس کی

کوٹھی میں منتقل ہو جانا چاہیئے تو وہ ایک دن صبح صبح وہاں آ گئی۔ ڈھولو اور ہریا کے علاوہ تین دوسرے غنڈے بھی وہاں چوبیس گھنٹے پہرے پر موجود ہوتے تھے۔ لکھی بائی نے انہیں ہدایت کی کہ آج رات نجمی کو لے کر اس کی کوٹھی پر آ جائیں۔ پھر وہ نجمی کے پاس آ گئی اور بولی۔

آج رات تو یہاں سے میری کوٹھی پر جائے گی۔ وہاں تمہیں ہر طرح کا آرام ملے گا۔ وہاں تیری دوسری سہیلیاں بھی ہوں گی۔

اسی رات نجمی کو گیراج والے ویران مکان سے لکھی بائی کی کوٹھی پر منتقل کر دیا گیا۔ یہ کوٹھی دریائے ہگلی کے کنارے شہر سے کافی دور ایک غیر آباد جگہ پر واقع تھی۔ پرانی بوسیدہ ایک منزلہ کوٹھی تھی جس کے احاطے میں بارش اور دھوپ کی مار کھائی چار دیواری کے ساتھ ناریل اور پپیتے کے درخت اُگے تھے۔

گیٹ کا ایک دروازہ غائب تھا۔ گیٹ کے اوپر بورڈ لگا تھا جس پر بنگلہ اور انگریزی زبان میں "شارٹ ہینڈ اینڈ ٹائپنگ اسکول فار ویمن" لکھا تھا۔ ایک چوکیدار باہر اسٹول پر بیٹھا رہتا تھا۔ نجمی کو شام کے جھٹپٹے میں گیراج والے ویران مکان سے گاڑی میں بٹھا کر اس کوٹھی میں پہنچا دیا گیا۔

ڈھولو اور ہریا بھری ہوئی پستولوں والے ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ڈالے نجمی کے دونوں جانب بیٹھے تھے۔ کوٹھی کے برآمدے میں خالی بنچ پڑے تھے نیم روشن راہ داری کی جانب دو اُونچی چھت والے کمرے تھے جن میں پرانی وضع کی چھوٹی میزوں پر ٹائپ کی چھ سات مشینیں پڑی تھیں۔ آگے جا کر راہ داری بائیں جانب گھوم گئی یہاں ایک دروازے پر تالا پڑا تھا۔ ڈھولو بدمعاش نے تالا کھولا۔

ہریا نجمی کو لے کر اندر داخل ہو گیا۔ یہ کمرہ اسٹور تھا اور کاٹھ کباڑ سے بھرا ہوا تھا۔ یہاں سے ایک تنگ و تاریک زینہ خفیہ دروازے سے نکل کر نیچے جاتا تھا۔ نیچے دو کشادہ تہہ خانے تھے جس تہہ خانے میں نجمی کو لے جایا گیا وہاں قالین کے فرش پر سفید چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ گاؤ تکیے اِدھر اُدھر پڑے ہوئے تھے۔ دیوار

... تین اگالدان رکھے تھے۔ چھت سے لگا بلب جل رہا تھا جس کی روشنی کافی تھی دیواروں پر عورتوں کی نیم عریاں تصویریں لگی تھیں۔ اس تہہ خانے کا بھی ایک دروازہ تھا جو دوسرے نسبتاً چھوٹے تہہ خانے میں کھلتا تھا نجمی کو اس چھوٹے تہہ خانے میں لے جایا گیا۔

یہاں دیواروں کے ساتھ تین پلنگ لگے تھے جن کی مسہریاں لپیٹ کر اوپر ڈال دی گئی تھیں ایک میز پر کچھ چینی کے برتن پڑے تھے۔ ایک تخت دیوار کے ساتھ لگا دیا گیا تھا۔ دو تین کرسیاں بھی موجود تھیں۔ دھومل نے نجمی کے کپڑوں والا اٹیچی کیس تخت پر رکھتے ہوئے کہا۔

"غسل خانہ ساتھ ہی ہے۔ اب تو آرام کرو۔"

دھومل اور ہریا چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد نجمی نے تہہ خانے کا جائزہ لیا۔ اس تہہ خانے میں کسی کھڑکی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اوپر ایک جانب چھت کے قریب ایک چھوٹا سا ایگزاسٹ فین لگا تھا۔ جسے جاتے ہوئے ہریا بدمعاش نے چلا دیا تھا۔ اس فین کی آواز بہت مدھم تھی۔

نجمی نے منہ ہاتھ دھو کر دوسری ساڑھی پہنی اور پلنگ پر لیٹ گئی۔ میز پر پڑے کالے رنگ کے ٹیبل فین کا رخ پلنگ کی طرف تھا۔ نجمی نے اٹھ کر ٹیبل فین چلا دیا۔ ہوا چلی تو تہہ خانے کا حبس دور ہو گیا۔ فضا میں مرطوب سی بو رچی ہوئی تھی۔ کھانا اسے گیراج والے مکان میں ہی کھلا دیا گیا تھا۔ نجمی پلنگ پر لیٹی اپنے ماضی اور حال کے بارے میں غور کرنے لگی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے جذبات میں وہ پہلے ایسا حساس پن نزاکت اور نچھاور کا احساس نہیں رہا تھا۔ اس کی پیاری سہیلی شبانہ کی شکل بھی اسے دھندلی دھندلی نظر آتی تھی۔

ندیم سے اسے کوئی گلہ نہیں رہا تھا۔ وہ اپنے دل میں ندیم کے لئے وہ پہلی سی محبت بھی محسوس نہیں کرتی تھی۔ نجمی کو وہ بھی ایک ایسا مرد معلوم ہوتا جو کبھی اس سے محبت جتایا کرتا تھا اور پھر ایک اتفاق سے اس سے جدا ہو گیا تھا۔ نجمی

کی نفسیات نے آہستہ آہستہ ایک نیا رخ اختیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ایک ایسے خوش آشام طوفان سے گزر کر اس تہہ خانے میں آئی تھی کہ اس کے اندر کی قدریں ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں جو باقی رہ گئی تھیں۔ وہ ٹوٹ پھوٹ رہی تھیں نجمی جب ان لوگوں کے بارے میں سوچتی جنہوں نے اسے اس مقام تک پہنچایا تھا تو اس کے دل سے بددعاؤں کی جگہ گالیاں نکلنے لگتیں۔ یہ ان گالیوں کی بازگشت تھی جو بڑے التزام کے ساتھ سات روز تک دھومل اور ہریا نے اس کے سرہانے بیٹھ کر اس کو دی تھیں۔

یہ گالیاں نجمی کے خون میں جیسے زہر بس گئی تھیں۔ ایک خیال نجمی کے ذہن میں ہر بار اپنے پورے جلال اور غضب کے ساتھ نمودار ہوتا تھا اور وہ ان لوگوں سے بدلہ لینے کا خیال تھا جنہوں نے اس کی عزت نفس کو تباہ کیا تھا۔ نجمی کی پوری شخصیت پر اس خیال کا غلبہ تھا۔ یہ غلبہ اس قدر شدید تھا کہ اب اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر وہ ان لوگوں سے انتقام لئے بغیر یہاں سے فرار ہو گئی تو وہ اپنے آپ کو ساری زندگی معاف نہیں کرے گی۔ غیر شعوری طور پر نجمی نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی عزت کے قاتلوں سے بدلہ لئے بغیر اس شہر سے فرار نہیں ہو گی۔

وہ بدلہ کس طرح لے گی؟ اس سوال کا جواب نجمی کے پاس نہیں تھا لیکن اس سوال کے ابھرتے ہی نجمی کا خون کھول اٹھتا اور اس کے سینے میں دہکتا ہوا لاوا باہر نکلنے کو بے تاب ہو جاتا وہ انہی پریشان خیالوں میں غلطاں تھی کہ ساتھ والے تہہ خانے سے ایسی آوازیں آئیں جیسے وہاں کوئی داخل ہوا ہو۔ پھر دھیمی آواز میں کوئی سارنگی بجانے لگا۔ یہ آواز تھوڑی دیر بعد رک گئی۔ کسی نے بنگلہ میں کسی کو آواز دے کر پانی مانگا۔ نجمی سمجھ گئی کہ ساتھ والے تہہ خانے میں محفل رقص و سرور گرم ہونے والی ہے۔ یہاں کی کوئی بات اس سے پوشیدہ نہیں رہی تھی۔

پھر کسی عورت کے ہلکے سے قہقہے کی آواز آئی۔ نجمی خاموشی سے پلنگ پر لیٹی رہی۔ کسی نے دروازے کی باہر سے کنڈی کھولی۔ نجمی نے گردن گھما کر دروازے

ن طرف دیکھا۔ زرق برق نیلی ساڑھی میں ملبوس ایک سانولے رنگ کی جوان لڑکی مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ نجمی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ لڑکی نے مسکراتے ہوئے بنگلہ میں کہا۔

"اری چندا آرام کر۔ ابھی اُٹھنے کی ضرورت نہیں۔" وہ ہنستی ہوئی پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی کمرے میں عطر کی تیز خوشبو پھیل گئی تھی۔ نجمی نے لڑکی کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ خوبصورت نہیں تھی مگر بڑی بنی سنوری تھی۔ آنکھیں ضرور بڑی بڑی تھیں چہرے پر ایک بے باکی اور بے ساختگی تھی۔ اس نے نجمی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولی۔

"میرا نام کملا ہے۔ تیرا نام مجھے معلوم ہے۔ چندا بڑا پیارا نام ہے۔ اری تو نے یہ دھوتی ایسی ساڑھی کیوں پہن رکھی ہے؟"

پھر نجمی کے سر کے ساتھ اپنا سر لگا کر بولی۔

"فکر نہ کر کل تو بھی بنارسی ساڑھی میں گہنے پاتے سے لدی پھندی ہوگی۔"

اور وہ نجمی کو گدگدانے لگی۔ نجمی نے پیچھے ہٹ کر کملا کو گھورا۔ کملا قہقہہ لگا کر اٹھی اور ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"چندا تو بڑی خوبصورت ہے۔ تیرا رنگ بھی گورا ہے تیری تو قسمت کھل جائے گی۔ موسی نے تو ابھی سے تمہاری تعریفیں شروع کر دی ہیں۔"

نجمی نے پلنگ کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے پوچھا۔

"کون موسی؟"

کملا نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھماتے ہوئے کہا۔

"تمہیں نہیں معلوم؟ ارے ہاں تجھے ابھی کہاں معلوم ہوگا۔ اری ہم بائی جی کو موسی کہتی ہیں۔"

نجمی نے یونہی پوچھا۔

"یہاں اور لڑکیاں بھی ہیں؟"

کملا نے ہنستے ہوئے اپنا سر کرسی کی پشت سے لگا دیا اور بولی۔

"میری چندا جان۔ آہستہ آہستہ سب سے تیری ملاقات ہو جائے گی۔ ویسے یہاں لڑکیاں آتی جاتی رہتی ہیں۔ کوئی تمہیں اپنا اصلی نام اور پچھلی زندگی کے بارے میں نہیں بتائے گی۔ تم بھی کسی کو کچھ نہ بتانا۔ یہ کملا میرا اصلی نام نہیں ہے۔ میں تمہیں اپنا اصلی نام نہیں بتا سکتی۔ موسی تمہیں سب کچھ سمجھا دے گی۔"

کملا اچانک اُٹھی۔ ساڑھی کو ذرا سا ہٹا کر اس نے نجمی کو اپنا پیٹ دکھایا جس پر زخم کا دو تین انچ لمبا نشان تھا۔ نجمی کانپ سی گئی۔ کملا کرسی پر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

"ایک بار میں نے اپنا اصلی نام کسی کو بتا دیا تھا۔ دھول نے میرے پیٹ میں چاقو مار دیا۔ ایک مہینہ اسپتال میں پڑی رہی تھی۔ تم ایسی غلطی نہ کرنا۔ بس چندا ہی تمہارا نام ہے۔ یہی یاد رکھنا۔"

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی "اچھا میں جاتی ہوں۔ سیٹھ آ رہا ہوگا۔ آج میری باری ہے مجرا گانے کی۔"

کملا نے ہنستے ہوئے آگے بڑھ کر نجمی کو پیار کیا اور اسی شوخی سے مسکراتی گنگناتی بڑی خوشی کے عالم میں دوسرے تہہ خانے کی طرف چلی گئی۔ نجمی نے ایک گہرا سانس لیا اور سر جھکا لیا۔ اس گہرے سانس میں نجمی کو چنگاریاں چھوٹتی محسوس ہوئی تھیں۔

اس نے سر اُٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا جس کے باہر کملا کنڈا لگا گئی تھی۔ نفرت اور جذبہ انتقام کی ایک زہریلی لہر نجمی کے سینے سے اٹھی۔ اس کا حلق کڑوا ہو گیا اس نے اپنے جسم پر ایک نگاہ ڈالی۔ یہ وہ جسم نہیں تھا جس کو لے کر وہ لاہور سے چلی تھی۔ اس جسم پر لوگوں کے لگائے ہوئے گہرے گھاؤ تھے جن سے ابھی تک خون ٹپک رہا تھا۔ یہ زخم تب سے لے کر اب تک ہرے تھے ان زخموں پر تمام قاتلوں کے ہاتھوں کے نشان محفوظ تھے۔

نجمی ان ہاتھوں کو پہچانتی تھی اسے ان ہاتھوں کو قلم کرنا تھا تاکہ وہ کسی دوسرے معصوم جسم کی طرف نہ اُٹھ سکیں۔ اس سے زیادہ نجمی خاک میں نہیں مل سکتی تھی اب

اسے خاک سے اُٹھا کر ان لوگوں کو مٹانا تھا جنہوں نے اس کو خاک میں مٹا دیا تھا۔ نجی پلنگ سے اُٹھ کر تہہ خانے کے فرش پر ٹہلنے لگی۔ وہ دیر تک اضطراب کے عالم میں ٹہلتی رہی۔ رات گزرتی چلی جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ساتھ والے تہہ خانے سے گھنگروں اور سارنگی طبلے کی آواز آنے لگی۔

کملا نے پہلے بنگلہ کا ایک گانا گایا۔ پھر ایک گھٹیا قسم کی بازاری غزل گانے لگی بیچ بیچ میں کسی آدمی کی داد دینے کی مخمور سی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ نجی پلنگ پر لیٹ گئی۔ وہ سونے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس کی آنکھوں میں تپش تھی۔ گرم لہروں کا دھواں سا اُٹھ رہا تھا۔ شاید آدھی رات گزر چکی تھی کہ مجرے کی آواز بند ہو گئی۔ کبھی کبھی کملا کا شوخ قہقہہ سنائی دے جاتا تھا۔ کسی وقت لکھی بائی کی بھی آواز سنائی دیتی۔ آہستہ آہستہ یہ آوازیں غائب ہو گئیں۔ کوئی نجی کے کمرے میں نہ آیا وہ سو گئی۔ دوسرے روز اس کی آنکھ کھلی تو چھت والے گول سوراخ میں جہاں ایگزاسٹ فین چل رہا تھا دن کی چمکیلی روشنی اندر آ رہی تھی۔

نجی کے پاس گھڑی نہیں تھی۔ وہ اُٹھ کر غسل خانے میں گئی۔ آج پہلی بار اس نے بڑے شوق اور اہتمام سے غسل کیا۔ پلنگ پر بیٹھ کر چھوٹا شیشہ سامنے رکھ کر بال سنوارے۔ ہلکا میک اپ کیا جو اسے لکھی بائی کی طرف سے رات ہی کو دیا گیا تھا۔

جب لکھی بائی کمرے میں آئی تو نجی کو بنا سنورا اور ہلکے میک اپ میں دیکھ کر حیران بھی ہوئی اور خوش بھی ہوئی۔ نجی نے اسے بنگلہ میں پرنام کیا۔ لکھی بائی نے آگے بڑھ کر اسے غور سے دیکھا۔

"تو پڑھی لکھی ہے نہ اس لئے حالات کو بہت جلد بھانپ گئی ہے۔ اری میرے ساتھ تجھے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی۔ میں تجھے عیش کراؤں گی۔ یہ کملا کرشنا اور دوسری لڑکیاں تو تمہارے سامنے کچھ بھی نہیں ہیں اب ناشتہ کر کے بیشک سو جانا میں شام کو تمہارے پاس آؤں گی آج کلکتے کا ایک بہت بڑا مالدار سیٹھ

تجھ سے ملاقات کرنے آ رہا ہے دیکھ چندا میں تجھے ابھی سے کہہ دیتی ہوں وہ جو تجھے انعام دے گا نا۔ اس میں سے تو مجھے اپنی خوشی سے بس تیسرا حصہ دے دینا بس۔ لے سگریٹ پی۔"

نجی کو لکھی بائی پہلے بھی سگریٹ کا کئی بار کہہ چکی تھی مگر نجی نے ہر بار انکار کیا تھا لیکن اس روز اس نے سگریٹ لے کر سلگا لیا۔ اسے اچھو آ گیا لکھی بائی مسکراتی ہوئی بولی۔

"ارے ابھی دھواں منہ میں ہی رکھ کر پھینک دیا کر۔ ایک دم سے دھواں نگلے گی تو کھانسی تو آئے گی ہی۔"

دھول اور ہریا دونوں بدمعاش چوبیس گھنٹے وہیں رہتے تھے۔ ہریا نجی کے لئے ناشتہ لے کر آ گیا۔ اس نے بھی نجی کو کچھ کچھ بنے سنورے دیکھا تو خوش ہو کر بولا۔

"اری واہ تیرا تو جوبن چاندنی کی طرح لگ رہا ہے۔"

نجی نے پہلی بار ہریا کو ڈانٹ دیا۔ ہریا ہکا بکا ادھر اُدھر تکنے لگا۔ نجی نے بے ضرر سی عام گالی دی اور کہا۔

"ہریا پھر کبھی ایسی بات کی تو میں تیرا خون پی جاؤں گی۔"

ہریا ہنسنے لگا "اری چندا، ہم بھلا ایسی ویسی بات کر سکتے ہیں بس تو یہاں خوش خوش رہ لے ہمیں اور کیا چاہیئے۔"

لکھی بائی نجی کی اس تبدیلی کو محسوس کرتے ہوئے دوپہر کو بھی اس کو کریدنے آ گئی کہ اس خوشگوار تبدیلی کی اصل وجہ کیا ہے۔ دونوں نے مل کر بڑے تہہ خانے میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ نجی اب بات کرتے ہوئے مسکرا بھی رہی تھی۔ لکھی بائی نے کھانے کے بعد پان لگاتے ہوئے نجی سے پوچھ ہی لیا کہ وہ اتنی جلدی کیسے بدل گئی؟

نجی نے سگریٹ سلگا کر منہ سے دھوئیں کے چھوٹے چھوٹے کولے باہر پھینکتے ہوئے کہا۔

"موسی جب زندگی اسی ڈھب سے گزرنی ہے تو پھر رونے پیٹنے سے کیا ہوگا ٹھیک ہے میری تقدیر میں یہی لکھا تھا۔ اب مجھے اسی زندگی میں خوش رہنے کی کوشش کرنی چاہیئے بس یہی سوچ کر میں نے میک اَپ بھی کر لیا تھا۔"

لکھی بائی بڑی دور اندیش اور تجربہ کار عورت تھی۔ وہ اتنی جلدی نجمی کے بیان پر یقین نہیں کر سکتی تھی۔ پان منہ میں دبایا اور ہاتھوں سے نجمی کی بلائیں لیتے ہوئے بولی۔

"اری چندا تو دوسری لڑکیوں سے بہت سیانی ہے خوبصورت تو تو ہے ہی۔ یہ تم نے بالکل ٹھیک فیصلہ کیا اور پھر ہم بھی تو محنت مزدوری کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ تمہیں تھوڑی سی محنت مزدوری کرنے کا معاوضہ اتنا ملے گا کہ تو حیران رہ جائے گی۔"

لکھی بائی نے نجمی کو پان دیا جو اس نے منہ میں دبا لیا اور سگریٹ کا دھواں نکالنے لگی۔ لکھی بائی ہنس دی۔

"اری تو تو کارخانے کی چمنی کی طرح دھواں نکال رہی ہے۔"

اور بائی نے نجمی سے سگریٹ لے لیا۔

رات کو بڑے تہہ خانے میں پھر وہی محفل سجائی گئی۔ نئی چاندنی بچھ گئی پھولوں کے ہار آ گئے نجمی کو بیش قیمت ساڑھی پہنا کر عطر خلیل میں بسایا گیا۔ سونے کے گہنے پہنائے گئے۔ جو ماسٹر اسے جوا سکھاتا تھا وہ ہارمونیم لے کر بیٹھ گیا۔ سارنگی والا ایک بوڑھا بھی آ گیا۔

نجمی کو دوسرے کمرے میں ہی رکھا گیا۔ لکھی بائی خود پاندان کر گاؤ تکیہ کے سہارے چاندنی میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی اور پان لگانے لگی۔ وہ ماسٹر اور سارنگی والے سے کبھی کبھی کوئی بات کر لیتی تھی۔ ان لوگوں پر بھی لکھی بائی کی ظالمانہ طبیعت کلکتے کے پولیس کے اعلیٰ افسران تک رسائی اور اس کے قاتل غنڈوں کا اس قدر دباؤ تھا کہ دونوں سازندوں نے کبھی لکھی بائی سے زیادہ بات نہیں کی تھی۔ بلکہ وہ ہمیشہ خوشامدانہ انداز میں اس کی ہاں میں ہاں ہی ملاتے تھے۔ ل کشادہ تہہ خانے میں

بھی ایگزاسٹ فین چل رہا تھا۔ اس میں سے باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ لکھی بائی کے سازندوں کو چپ رہنے کا اشارہ کیا اور اُٹھ کر زینہ چڑھ کر کوٹھی کی راہ داری میں آ گئی۔ جب وہ واپس تہہ خانے میں آئی تو نجمی نے دیکھا کہ اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کا ہندو سیٹھ تھا جس نے سلک کا کرتا پاجامہ پہن رکھا تھا اور گلے میں سفید موتیوں کا ہار تھا۔ جیسا کہ نجمی کو سکھایا گیا تھا۔ اس نے اُٹھ کر اسے آداب کیا اور بیش قیمت ریشمی ساڑھی سمیٹ کر چاندنی پر بیٹھ گئی۔

نجمی نے شاید زندگی میں پہلی بار طوائف کی اداکاری کی۔ یہ اداکاری اتنی مکمل اور پر اثر تھی کہ سیٹھ سو سو کے نوٹ لٹانے لگا۔ نجمی نے مناسب انداز میں نرت بھاؤ کئے بنگلہ کا ایک گانا بھی گایا۔ ساتھ ساتھ جان بوجھ کر اس نے سیٹھ کو کچھ ایسے انداز دکھائے کہ وہ اس کا دیوانہ ہو گیا۔ ویسے بھی ریشمی ساڑھی اور بناؤ سنگھار میں نجمی کا حسن دوبالا ہو گیا تھا۔ سیٹھ جاتے جاتے نجمی کو پانچ ہزار روپے اور سونے کی ایک انگوٹھی دے گیا۔

لکھی بائی بے حد خوش تھی۔ اس نے نجمی سے صرف دو ہزار روپے لے لئے اور انگوٹھی اس کے پاس رہنے دی۔ اس کا ماتھا پیار سے چوم کر کہا "واری جاؤں میری چندا میں دیکھ رہی ہوں تو بھارت ورش کی کسی ریاست کی مہارانی بنے گی تو سونے کا تاج پہن کر راج کرے گی۔"

نجمی کے سینے میں زہر کی وہی لہر ایک بار پھر اُٹھ کر اس کے حلق تک آ گئی اس نے گہرا سانس بھرا۔ اس سانس میں آگ کی چنگاریاں تھیں۔ وہ مسکرا کر بولی۔ "موسی میں تو تمہارے پاس ہی رہوں گی مجھے کسی راجے کی رانی نہیں بننا۔"

لکھی بائی نے نجمی کو گلے لگا لیا۔ دھوبل غنڈہ اور رہبا ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور تعجب سے سر بھی ہلایا۔ لکھی بائی نے نجمی سے کہا۔ "ان دونوں کو دو سو روپے دیدے۔"

نجمی نے کوئی اعتراض نہ کیا اور پرس میں سے سو سو کے چار نوٹ نکال کر

ڈھول اور ہریا کی طرف پھینک دیئے۔ کچھ روز تک لکھی بائی نجمی کے رویّے کا جائزہ لیتی رہی۔ سیٹھ ہر رات آکر نجمی کا گانا سُنتا اور دولت لٹا کر چلا جاتا۔ لکھی بائی کو کافی حد تک یقین ہو گیا تھا کہ نجمی نے ہتھیار پھینک کر نئی زندگی کو قبول کر لیا ہے۔ دوسری طرف وہ سیٹھ کی آتشی ہوس کو بھی تیز کرنا چاہتی تھی۔

اس نے نجمی کو وہاں سے ایک دوسری کوٹھی میں بھجوا دیا جہاں کملا اور کرشنا رہتی تھیں۔ یہ کوٹھی وہاں سے زیادہ دُور نہیں تھی۔ نجمی کملا کے گلے لگ کر ملی کملا نے نجمی کا تعارف کرشنا سے کرایا۔ وہ بڑی خوش تھی کہ نجمی نے حالات کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا ہے۔ نجمی نے بھی یہی ظاہر کیا اور کہا۔

"کملا ہم اور کر بھی کیا سکتی ہیں۔ بس حیات ہے یہی زندگی ہمارے لئے بہت اچھی ہے اور بہترین ساڑھیاں پہننے کو ملتی ہیں۔ پرس میں ہر وقت روپے رہتے ہیں بس اس بات کا افسوس ہے کہ موسی مجھے کہیں سیر و تفریح کے لئے ساتھ نہیں لے جاتی مجھے سینما دیکھے مدّت ہو گئی ہے۔"

کرشنا نے نجمی کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔ "فکر نہ کر شروع میں ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک ہوتا تھا۔ جب موسی کو ہم پر بھروسہ ہو گیا تو دیکھ لو اب ہم سیر و تفریح کو بھی جاتی ہیں موسی کے ساتھ۔" نجمی نے بھویں اُوپر اٹھالیں اور کہا۔

"کیا موسی ہمیں کبھی اکیلا نہیں جانے دے گی؟ کملا نے سر کو ذرا سا جھٹک کر کہا۔ اری چندا ہمیں اکیلی باہر جا کر کرنا کیا ہے خواہ مخواہ لوگ پیچھے لگ جاتے ہیں اور پھر پولیس بھی تنگ کرتی ہے۔ یہ کم بخت ہمیں شکل ہی سے پہچان لیتے ہیں۔ کہتے ہیں لائسنس دکھاؤ۔" کرشنا بولی۔

"موسی کے غنڈے بھی تو سائے کی طرح ہمارے ساتھ ہوتے ہیں۔ اکیلی جانے کا فائدہ بھی کیا کہ جب ہم کبھی اکیلی نہیں ہوتیں۔ کلکتے کی پولیس تو موسی کا دم بھرتی ہے۔ تم کچھ کر لو پولیس تمہیں پکڑ کر پھر موسی کے پاس لے آئے گی اور پھر تمہارے پیٹ میں چاقو گھونپ کر ہسپتال میں پہنچا دیا جائے گا۔" کملا جھٹ بولی۔ "میرے ساتھ

بھی تو یہی ہوا تھا۔"

نجمی نے ان کی باتوں سے اندازہ لگا لیا تھا کہ لکھی بائی ہی ان کے لئے ان داتا تھی۔ وہ نہ صرف ان کا واحد سہارا تھی بلکہ وہ اس سے اور اس کے خونی غنڈوں سے بے حد خائف بھی تھیں۔ ویسے بھی کملا اور کرشنا کا دنیا میں سوائے لکھی بائی کے اور کوئی نہیں تھا۔ خدا جانے انہیں کہاں سے اغوا کر کے کب لایا گیا تھا۔ وہ اس بارے میں حیرانی کی حد تک خاموش تھیں۔ انہوں نے نجمی سے بھی کبھی نہیں پوچھا تھا کہ وہ کہاں کی رہنے والی ہے اور اسے کس نے کہاں سے اغوا کیا تھا۔ اور وہ لکھی بائی کے اڈے پر کیسے پہنچ گئی۔

ایک بات کا احساس ان کی باتوں سے شدت سے ٹپکتا تھا کہ اگر انہوں نے کسی طرف بھاگ جانے کی کوشش کی تو لکھی بائی کے غنڈے شمشان تک ان کا پیچھا کریں گے اور انہیں ہلاک کر ڈالیں گے۔ بہت جلد نجمی کو پتہ چل گیا کہ لکھی بائی کا کلکتے کے ریڈ لائٹ ایریا سوناگاچی میں بھی ایک چوبارا ہے جہاں وہ باقاعدہ لائسنس کے ساتھ گانا بجانا کراتی ہے۔ یہاں سے وہ اپنی مرضی کے مطابق کسی نہ کسی لڑکی کو ٹرینڈ کرنے کے بعد اپنی سوناگاچی والی بیٹھک پر بھی پہنچا دیتی ہے۔

اس کی بیٹھک پر ہندو لڑکیاں مجرا کرتی تھیں۔ وہ اس کوٹھی میں کبھی نہیں لائی گئی تھیں۔ یہ دریائے ہنگلی والی کوٹھی لکھی بائی کا گویا ٹریننگ سینٹر بھی تھا۔ ویسے سوناگاچی میں وہ مارکیٹ سے طوائفیں خرید کر بھی ان کا گانا کراتی تھی۔ نجمی کے ذہن میں اپنے قاتلوں سے انتقام لینے کا ایک دھندلا سا خاکہ ضرور تھا مگر ابھی اسے کوئی واضح راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بہر حال اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ لکھی بائی کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ وہ جانتی تھی کہ لکھی بائی ایک جہاں دیدہ اور عیار عورت تھی۔ وہ اتنی آسانی سے اس پر بھروسہ کرنے والی نہیں ہے۔ لیکن نجمی نے اپنی کوششیں جاری رکھیں اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لکھی بائی نجمی کو ایک دوبارہ اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کر سینما دکھانے بھی لے گئی

نجمی نے لکھی بائی کی باتوں سے اتنا بھانپ لیا تھا کہ وہ اسے سونا گاچی میں نہیں بٹھانا چاہتی بلکہ اسے کسی ریاست کے راجہ کے ہاں فروخت کر کے منہ مانگی دولت پانے کا منصوبہ بنائے ہوئے ہے۔ نجمی بھی خونی انتقام کے جس منصوبے کو لے کر آگے بڑھ رہی تھی اس میں لکھی بائی کا نام سرفہرست تھا۔

نجمی ایک غیر ملک میں اپنی نادانیوں اور غلطیوں کی وجہ سے پیدا ہونے والے حالات کی ستم ظریفیوں کا مقابلہ کر رہی تھی اور دوسری طرف رومان پسند اور خوابوں کی دنیا میں رہنے والی شبانہ کی زندگی کا دریا سرسبز وادیوں کے پھولوں بھرے کنجوں سے نکل کر آگ برساتے آسمان اور دہکتے تپتے صحراؤں میں داخل ہو رہا تھا واشنگٹن میں بیٹھے ظفر نے شبانہ کے والد کو لکھ کر شادی کی تاریخ مقرر کرالی کیپال بینک والی عالی شان کوٹھی "کیپال لاج" پہلے ہی وہ اپنے نام کروا چکا تھا۔ شبانہ کو اس نے ایم اے اس لئے نہیں کرنے دیا تھا کہ وہ شبانہ کی انا کو ٹھیس پہنچانا چاہتا تھا۔ وہ خود معمولی تعلیم یافتہ تھا۔ اس لئے اسے یہ ہرگز گوارا نہیں تھا کہ شبانہ جس سے وہ اپنی بے عزتیوں کا بدلہ لینے کے لئے شادی کر رہا تھا۔ اس سے زیادہ تعلیم حاصل کر کے اس کے پاس آئے۔

شبانہ خوابوں کی دنیا میں رہنے والی خیال پرست نازک مزاج لڑکی تھی۔ مگر اسے اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کی عزت کا اس حد تک پاس تھا کہ وہ ان کی خاطر نہ صرف اپنے خواب بلکہ اپنی زندگی بھی قربان کر سکتی تھی چنانچہ جب اس کے باپ نے بتایا کہ ظفر سے اس کی شادی کی تاریخ پکی کر دی گئی ہے تو اس پر جیسے بجلی گر پڑی مگر اس نے اُف تک نہ کی۔ زبان سے اس شادی کے خلاف ایک لفظ تک نہ نکالا۔

شبانہ نے اپنے حق کی حفاظت کرتے ہوئے اس شادی کے خلاف آواز ضرور بلند کی تھی۔ اس نے اپنے بھائی، والدہ اور بڑی بہن غزالہ کے ذریعے اس احتجاج کو اپنے والد تک پہنچا دیا تھا۔ وہ اس رشتے پر نظرثانی کرتے ہی والے تھے کہ

ان پر اچانک ایک مصیبت آن پڑی اور ظفر نے اپنی دولت سے انہیں کاروباری تباہی سے بچا لیا۔ ظفر نے کوٹھی بھی اپنے نام لکھوا لی تھی۔ وہ امریکہ میں شبانہ کے چھوٹے بھائی عامر کو بھی تعلیم دلوا رہا تھا۔

شبانہ کے ابو ظفر کے اب بھی لاکھوں روپے کے مقروض تھے۔ یہ خاندان اسی صورت میں بربادی سے محفوظ رہ سکتا تھا کہ شبانہ چپ چاپ ڈولی میں سوار ہو کر ظفر کے گھر چلی جائے۔ اپنے تمام سنہری خوابوں اور حسین سپنوں کو پامال کرتی ہوئی۔ اور شبانہ ایسا ہی کر رہی تھی۔ نجمی نے اخلاقی روایات کو توڑ پھوڑ کر اپنی مرضی کی شادی کرنے کی کوشش کی اور اس کی زندگی تباہی کے راستے پر چل نکلی۔ شبانہ ان روایات کو ساتھ لے کر ان کی پابندی کرتے ہوئے آگے بڑھی اور تباہی اس کا مقدر بن گئی اس کے سارے خواب ٹوٹ کر بکھر گئے۔ اسے سوائے اندھیروں کے آگے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر کون جیتا کون ہارا؟

شبانہ کی شادی میں ایک مہینہ باقی رہ گیا تھا۔ "کینال لاج" میں شادی کی تیاریاں جاری تھیں۔ شبانہ کی بھابھی اور اس کی پھوپھی کی لڑکیاں ان تیاریوں میں پیش پیش تھیں۔ دُلہن کے لئے جوڑے بنوائے جا رہے تھے۔ شبانہ کے بھائی اور ابو نے بینک سے مزید قرض لے کر زیورات کے سیٹ بھی تیار کروا لئے تھے۔

شبانہ ان تمام تیاریوں سے بے تعلق ظفر کے ساتھ گزاری جانے والی زندگی، کے نشیب و فراز پر سوچتی رہتی وہ ظفر کو ناپسند کرتی تھی۔ ظفر اس سے انتقاماً شادی کر رہا تھا۔ صرف شبانہ کو نیچا دکھانے کے لئے اس کی انا اور شخصی وقار کو ٹھیس پہنچانے کے لئے۔ شبانہ اپنے خاندان کے ناموس کی خاطر خاموشی سے اپنے مقتل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ کالج اس نے چھوڑ دیا تھا۔

ان ہی دنوں شبانہ کے بڑے بھائی عقیل کو کاروبار کے سلسلے میں سلہٹ جانا پڑا۔ شبانہ کا دل مشرقی پاکستان جانے کو مچل اٹھا۔ وہ اس سے پہلے وہاں دو ایک بار ہی گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ناریل اور دیودار کے جنگل لہرانے لگے اور دریائے پدما کی موجوں پر کشتیاں کھینے والے مچھیروں کے میٹھے گیت کانوں میں رس گھولنے لگے۔ اس نے سوچا کہ اب وہ امریکہ چلی جائے گی جانے زندگی کا کیا انداز ہو گا اس کے بعد پھر کیوں نہ وہ ایک بار مشرقی پاکستان کی مرطوب ٹھنڈی ہواؤں میں سیر کرے۔ اس نے عقیل بھائی کے ساتھ جانے کی خواہش ظاہر کی تو

عقیل شبانہ کی دلجوئی کی خاطر اسے ساتھ لے جانے پر تیار ہو گیا سلہٹ میں عقیل کے ایک گہرے دوست کی فیملی رہائش پذیر تھی۔

چنانچہ ایک روز شبانہ اپنے بھائی کے ساتھ پی آئی اے کے طیارے میں ڈھاکہ جانے کے لئے سوار ہو گئی ڈھاکہ پہنچ کر انہوں نے ڈھاکہ کے کملا پور ریلوے جنکشن سے سلہٹ جانے والی ٹرین پکڑی اور سلہٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ستمبر کا آغاز ہو چکا تھا مشرقی پاکستان کا آسمان بادلوں میں چھپا ہوا تھا کسی ریلوے اسٹیشن سے گزرتے ہوئے بارش شروع ہو جاتی تو شبانہ کھڑکی سے باہر ہرے بھرے سبزے لہلہاتے دھان کے کھیتوں اور ناریل و تاڑ کے جھنڈوں کو دیکھتی۔ اسے ایک عجیب طرح کی سرمدی خوشی محسوس ہوتی۔ یہ خوشی تمام خوشیوں سے نرالی تھی۔ نہ اس کا کوئی نام تھا۔ نہ اس کی کوئی قیمت تھی۔ نہ اس کا کوئی آغاز تھا اور نہ اس کی کوئی انتہا تھی۔ یہ بادلوں سے بارش کی ٹھنڈی شفاف بوندیں بن کر جیسے شبانہ کے دل کے کنول کی پنکھڑیوں پر گرتی محسوس ہوتی تھی۔ یہ خوشی تمام رنگوں خوشبوؤں اور شکلوں سے بے نیاز تھی۔

بارش میں بھیگتی ٹرین تالاب میں کھلے ہوئے کنول کے پھولوں ڈھلوان چھتوں والے مکانوں اور سنبل کے کیسری پھولوں والے گنجان درختوں کو پیچھے چھوڑتی اپنی منزل کی طرف دوڑی چلی جا رہی تھی۔ شبانہ کا جی چاہا کاش وہ ساری زندگی اسی طرح گاڑی میں سفر کرتے گزار دے۔ بارش ہوتی رہے۔ ٹرین چلتی رہے اور کنول کے پھولوں سے بھرے ہوئے تالاب اور ناریل کے جھنڈ اور کیسری پھولوں والے سنبل کے درخت گزرتے چلے جائیں اور یہ سفر کبھی ختم نہ ہو ان دلکش مناظر کو دیکھ کر شبانہ کو بے اختیار پراسرار راحیل کا خیال آ گیا۔

کیا وہ سلہٹ میں اسے ملے گا؟ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا تھا مگر ایسا کبھی کبھی ہو جایا کرتا تھا۔ اسے لگتا کہ پراسرار راحیل اس کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا ہے۔ محبت اور رومانس کی ایک پاکیزہ مہکتی لہر کی طرح وہ اس کے سر پر اپنا سایہ کئے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔

ٹرین سلہٹ کی طرف چلی جا رہی تھی۔ شبانہ ایک رات کے بعد راستے میں آنے والے اسٹیشنوں کو دیکھ رہی تھی۔ اسے اسٹیشنوں کے نام یاد نہیں تھے بارش میں دھل کر ہر شے پہلے سے زیادہ خوبصورت ہو گئی تھی۔ جب وہ سلہٹ پہنچے اس وقت شام ہو رہی تھی۔ عقیل بھائی کے دوست کی فیملی انہیں لینے ریلوے اسٹیشن پر موجود تھی عقیل نے ٹیلیفون پر انہیں بتا دیا تھا کہ میری بہن شبانہ بھی میرے ساتھ آ رہی ہے۔

اس فیملی سے شبانہ کی لاہور میں دو تین بار ملاقات ہو چکی تھی۔ یہ لوگ وزیر آباد کے رہنے والے تھے اور ایک مدّت سے سلہٹ میں چائے کا بزنس کر رہے تھے سلہٹ شہر کے مضافات میں چائے کے باغات کے قریب ہی ان کی ایک خوبصورت کوٹھی تھی۔ یہ کوٹھی اُنہوں نے خود بنوائی تھی۔

عقیل بھائی کے ان دوست صاحب کا نام چودھری خداداد تھا۔ عقیل بھائی سے عمر میں چار پانچ سال بڑے تھے۔ چھوٹی سی فرنچ کٹ داڑھی بھاری جسم سر پر جناح کیپ ہاتھ میں چھڑی بڑے خوش اخلاق اور ہنس مکھ تھے۔ ان کی اولاد کوئی نہیں تھی۔ دونوں میاں بیوی تنہا کوٹھی میں ہنسی خوشی زندگی گزار رہے تھے۔ بیوی کو شبانہ بھابھی کہہ کر پکارا کرتی تھی۔ گوری چٹی خاتون تھیں۔ سنہری فریم والی عینک لگاتی تھیں اور سر سے دوپٹہ کبھی نہیں گرنے دیتی تھیں۔ نماز روزے کی پابند۔ وزیر آباد میں اُنہوں نے اپنی کافی جائیداد بنائی ہوئی تھی اور وزیر آباد میں کئی رفاہی اداروں کی سرپرستی کرتے تھے۔

چودھری صاحب اور بھابھی نے شبانہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے پیار کیا۔ عقیل بھائی سے گلے ملے اور گاڑی میں بیٹھ کر اپنی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں بھابھی اور ان کے میاں نے عقیل کو شبانہ کی ہونے والی شادی کی مبارکباد بھی دی چودھری صاحب بولے۔

"بھئی ہم نے تو لاہور آنے کی ساری تیاریاں مکمل کر رکھی ہیں۔"

عقیل نے کہا۔ "چودھری صاحب آپ بھاوجہ صاحبہ کو لے کر تین چار روز پہلے ہی

آ جائیے گا آپ کی وہاں ضرورت ہو گی۔"

چودھری صاحب نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "کیوں نہیں پہلے آئیں گے بھئی۔ ہماری اپنی بیٹی کی شادی ہے۔ شبانہ تو ہمیں اپنی بچیوں کی طرح پیاری ہے۔"

بھابھی نے شبانہ کی طرف مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں نے جیسور سے تمہارے لئے سچے ریشم کی ساڑھیاں منگوائی ہیں۔ تم ساڑھی پسند کرتی ہو نا شبانہ بیٹی؟"

شبانہ نے آہستہ سے سر ہلا کر کہا۔ "جی ہاں۔" وہ موٹر کی کھڑکی سے باہر گیلی سڑک کے کنارے ہوا میں جھومتے ناریل کے درختوں کو تک رہی تھی جن کے پیچھے بادلوں کا رنگ شام کے جھٹپٹے میں گہرا سرمئی ہوتا جا رہا تھا۔ بارش نہیں ہو رہی تھی مگر آسمان بادلوں سے بھرا ہوا تھا۔ بنگلے پر نوکروں نے کھانا وغیرہ تیار کر رکھا تھا۔ اس بنگلے میں آ کر شبانہ کو ہمیشہ سکون اور مسرت کا احساس ہوا تھا۔

سلہٹ کے مضافات میں ایک پہاڑی ٹیلے پر بنا ہوا یہ خاموش اور تنہا بنگلہ تاڑ اور ناریل کے درختوں میں گھرا ہوا تھا۔ ایک جانب ڈھلان پر بانس کے دس بارہ درخت ساتھ ساتھ اُگے ہوئے تھے جن کی وجہ سے وہاں ہر وقت ٹھنڈا ٹھنڈا سبز اندھیرا سا پھیلا رہتا تھا۔

شبانہ کو یہ کنج بڑا پسند تھا جب بھی وہ یہاں آتی اس کنج میں آ کر ضرور بیٹھا کرتی تھی پتھر کی چند ایک سیڑھیاں ٹیلے کے اُوپر بنگلے تک جاتی تھیں۔ بنگلے میں روشنی ہو رہی تھی۔ لان میں بید کی کرسیاں لگی تھیں۔ برآمدے میں بھی دیوار کے ساتھ بید کے صوفے پڑے تھے۔

بید کی میز پر رکھے گلدان میں ٹراپیکل پودے کے چوڑے پتے سر جھکائے خاموش تھے فضا میں ایک ایسی مرطوب خوشبو سی رچی ہوئی تھی جس میں بانس ناریل اور چائے کی ملی جلی مہک تھی۔ جاتے ہی انہیں سلہٹ کے اناناس کا شربت پلایا گیا پھر انہوں نے منہ ہاتھ دھوئے اتنی دیر میں نوکروں نوکرانیوں نے کھانا لگا دیا تھا کھانے پر خوب باتیں ہوئیں۔

بھابھی شبانہ سے شادی پر خریدے گئے جوڑوں کی باتیں کرتی رہی شبانہ ہوں ہاں میں جواب دیتی گئی۔ چودھری صاحب عقیل بھائی سے کاروبار کی باتیں کرتے رہے کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ یہ سلہٹ کی خاص بلینڈ کی ہوئی چائے تھی۔

اس وقت شبانہ کو پراسرار راحیل کی بہت یاد آئی۔ وہ چائے کا مسافر تھا۔ چائے کی خوشبو اس کے ساتھ ساتھ سفر کرتی تھی۔ چائے اور سرخ گلاب کے پھول۔ سرخ گلاب کے پھول تو وہاں نہیں تھے مگر سلہٹ کی نازک لطیف پاکیزہ اور محبت کرنے والی محبت کی یاد دلانے والی محبت میں ڈوب جانے والی چائے موجود تھی۔

جس وقت یہ لوگ چائے پی رہے تھے تو شبانہ کو عجیب دلنواز سی آواز سنائی دی۔ وہ اس آواز سے مانوس تھی۔ وہ چائے پیتے ہوئے ہمہ تن گوش ہو گئی۔ پھر عقیل بھائی، چودھری صاحب اور بھاوج صاحبہ کی آوازیں چھٹ کر پرے ہٹ گئیں اور شبانہ نے اس مانوس آواز کو بالکل صاف سن لیا۔ یہ بارش کی آواز تھی۔ لان میں بارش شروع ہو گئی تھی۔

چائے کی پیالی شبانہ کے ہاتھ میں تھی۔ پیالی میں پڑی چائے بھی جیسے ہمہ تن گوش تھی اور بارش کی آواز کو غور سے سن رہی تھی۔ چائے بارش اور بانس کے درخت اور غروب ہوتی شام کے سائے طلوع ہوتی برسات کی اندھیری رات کے گیلے سایوں میں جذب ہو رہے تھے۔

شبانہ چائے کی پیالی لے کر ڈائننگ روم سے نکل کر برآمدے میں آگئی اب وہ بارش کے قریب تھی۔ اب بارش اس کے قریب تھی۔ یہ جنوب مشرقی ایشیاء کی بارش تھی بارش جنوب مشرقی ایشیاء میں پیدا ہوئی ہے۔ پہلی بار بارش کا جنم جنوبی جنگلوں میں ناریل اور بانس کے جھنڈوں میں ہوا اور اس نے چائے کے باغوں کے قریب اناس کے پودوں کے درمیان اپنی آنکھیں کھولیں۔

سلہٹ کی ابرآلود مرطوب ہواؤں نے شبانہ کے پریشان اور الجھے ہوئے ذہن کو بے حد سکون بخشا۔ دوسرے روز وہ چائے کے باغوں کی سیر کو گئی۔ ٹیلے

کی ڈھلانوں پر چائے کی پھولی ہوئی سرسبز جھاڑیاں ساتھ ساتھ قطاروں میں اوپر تک چلی گئی تھیں۔ مزدور لڑکیاں کہیں کہیں ٹوکرے پیچھے باندھے چائے کی پتیاں چن رہی تھیں بھابھی شبانہ کے ساتھ تھی۔ یہاں اس کے خاوند چودھری صاحب کا ایک ڈپو تھا جس کا ایک کمرہ مہمانوں کو چائے پیش کرنے کے لئے مخصوص تھا۔

شبانہ نے بھابھی سے پوچھا کہ چائے چننے والی لڑکیوں کو دن میں کتنی مزدوری ملتی ہے؟ بھابھی نے اپنی بیش قیمت ساڑھی کا ریشمی پلو سر کے اوپر جماتے ہوئے کہا۔

"یہ تو چودھری صاحب کو ہی معلوم ہے۔"

چائے کے کمرے میں شبانہ اور بھابھی کو چائے اور بسکٹ پیش کئے گئے۔ مگر شبانہ کا دل اداس ہو گیا تھا۔ اس نے پیالی میں دیکھا۔ چائے بھی اداس تھی۔ چائے کس لئے اداس تھی؟ شاید اس لئے کہ یہ چائے ان میلے کچیلے کپڑوں والی عورتوں کے نصیب میں نہیں تھی جن کے محنت کش ہاتھوں نے گھنٹوں باغ میں جھاڑی جھاڑی کے پاس جا کر اس چائے کی پتیوں کو چنا تھا۔ یہ بڑی قیمتی چائے تھی۔ یہ چائے کے پھولوں کی چائے تھی۔ چائے کے پھولوں کی چائے سب سے افضل ہوتی ہے۔ دوسرا درجہ چائے کی پتی کا ہے اور تیسرے درجے کی چائے پودوں کے ڈنٹھلوں سے بنائی جاتی ہے۔

شبانہ کو چائے کے پھولوں کی چائے پیش کی گئی تھی اس چائے میں چائے کی پتیاں چننے والوں کے درد انگیز گیتوں کی اداس آواز تھی۔ یہ آواز چائے کی بھاپ کی لہروں کے ساتھ بلند ہو کر شبانہ کے کانوں کو چھو کر جیسے آہیں بھرتی گزر رہی تھی۔

شبانہ چائے چننے والیوں کے لئے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ یہ کام اس کا نہیں تھا یہ کام چودھری صاحب کا تھا جس نے کل ہی اپنی بیوی کو سات ہزار روپے کی ریشمی ساڑھی خرید کر دی تھی۔ اس کے بعد چائے کے باغ میں شبانہ کا جی نہ لگا۔

رات کا کھانا مسز چوہدری کی ایک سہیلی کے ہاں تھا یہ سہیلی بنگالی خاتون تھیں۔ ان کا بنگلہ بھی ایک ٹیلے کے ٹیرس پر تھا۔ اس کتابی چہرے اور موٹی موٹی آنکھوں والی باوقار بنگالی خاتون کا نام نورالنساء تھا۔ اس کا امیر کبیر کاروباری بنگالی خاوند اسے نور

کہہ کر پکارتا تھا۔ شبانہ اس سے پہلے بھی نور سے مل چکی تھی۔ اس نے شبانہ کے لئے خاص طور پر تین چار قسم کی مچھلی پکوائی تھی۔

شبانہ اپنے بھائی عقیل، عقیل کے دوست چودھری صاحب اور ان کی بیگم کے ساتھ بیگم نور کے بنگلے میں داخل ہوئیں تو گیٹ پر ان کی چھوٹی بیٹی جنگیر میں چنبیلی کے پھولوں کے ہار لئے کھڑی تھی۔ اس نے باری باری سب مہمانوں کے گلے میں ہار پہنائے۔ بیگم نور ان کے خاوند ان کی بڑی بیٹی، بیٹی کے بچے سب استقبال کو وہاں موجود تھے۔ اس شام بھی سلہٹ کا آسمان ابر آلود ہی تھا مگر بارش نہیں ہو رہی تھی۔ فضا میں کسی قدر حبس تھا مگر بنگلے کے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں پہنچتے ہی حبس کا احساس ختم ہو گیا۔ شبانہ کو محسوس ہوا کہ وہ جنوب مشرقی ایشیاء کے کسی شہر میں نہیں بلکہ کسی سرد شمالی شہر میں آ گئی ہے۔

اُنہوں نے کچھ دوسری مہمان خواتین بھی بلائی ہوئی تھیں۔ بہت جلد کمرے کی ایئر کنڈیشنڈ فضا، چنبیلی یورپ کی عطریات پرفیومز اور کلونوں کی ملی جلی خوشبوؤں سے بھر گئی۔ بنگالی خواتین رنگ برنگی ریشمی ساڑھیوں میں ملبوس تھیں۔ ان کے ماتھوں کی بندیاں چمک رہی تھیں۔ مشرقی پاکستان کی مسلمان بنگالی خواتین میں بھی سرخ بندیا لگانے کا بڑا رواج تھا۔ ان میں کچھ کے رنگ سانولے اور کچھ کے کندنی تھے۔ کسی نے ٹیپ ریکارڈر پر قاضی نذر الاسلام کے گیت کی ٹیپ لگا دی نور کا خاوند قاضی نذر الاسلام کے گیت کا اُردو ترجمہ کرتا جاتا تھا بنگلہ گیتوں کی مدھر لے شبانہ کو شروع ہی سے بڑی فکر انگیز لگتی تھی۔

قاضی نذر الاسلام کا گیت ایک خاص دھن میں تیار کیا گیا تھا جسے پری نذرل گیتی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہ صنف موسیقی رابندر ناتھ ٹیگور کے رابندر سنگیت کے مقابلے میں ایجاد کی گئی تھی۔ گول چہرے اور لمبے سیاہ بالوں اور سیدھی مانگ والی بنگالی لڑکی جہاں آرا شبانہ کو بڑی پیاری لگی۔ اسے شبانہ نے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ چٹا گانگ سے اپنی آنٹی کے پاس آئی ہوئی تھی۔ اس نے شبانہ سے کہا۔

"ہمارے گھر چٹا گانگ چلیں نا۔ میری ممی آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گی، ہمارے گھر کے باغ میں انناس کے پودے لگے ہیں۔ ہم آپ کو تازہ انناس کھلائیں گے۔"

شبانہ نے تصوّر میں اس گھر کے باغ کو دیکھا جہاں انناس کے نیم قد پودے بارش میں بھیگ رہے تھے اور جن کی جھاڑیوں کے اندر سنہری انناس بارش سے چھپنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ جہاں آرا چٹا گانگ میں میڈیکل کے دوسرے سال کی طالبہ تھی۔ وہ اُردو بھی بول لیتی تھی۔

کھانے کے بعد چائے کا دور چلا تو بیگم نور نے نوکر کو اشارہ کیا۔ نوکر دوسرے کمرے سے ہارمونیم اُٹھا لایا۔ سب سے پہلے ہارمونیم ایک بنگالی خاتون کے آگے میز پر رکھا گیا۔ اُنہوں نے علامہ اقبال کی نظم گا کر سنائی پھر ہارمونیم دوسری خاتون کے سامنے آ گیا۔ انہوں نے ہارمونیم بجاتے ہوئے سوھنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد گا کر سنایا۔ آخر میں ہارمونیم ایک دُبلی پتلی بنگلہ خاتون کے سامنے رکھا گیا۔

اس نے ایک قدیم بنگلہ لوک گیت گانا شروع کیا جہاں آرا شبانہ کے پاس ہی بیٹھی تھی۔ وہ اسے گیت کا ترجمہ کر کے آہستہ آہستہ سناتی جاتی تھی۔ خاتون کی آواز میں عجیب طرح کا درد اور سوز تھا۔ خشک اور اداس آواز تھی۔ جب شبانہ نے گیت کا ترجمہ سُنا تو وہ اس سے بہت متاثر ہوئی۔ لوک گیت چاہے کسی زبان میں ہوں ہمارے جذبات کے حقیقی ترجمان ہوتے ہیں۔ بنگلہ لوک گیت کسی ہرنی کے بارے میں تھا جس کو شکاری شکار کر کے لے جا رہا ہے اور ہرنی دور کھڑے اپنے ساتھی ہرنوں اور ہرنیوں سے باتیں کر رہی ہے۔

شنگیر   شنگی   را   بھائی

کوئی   اوہر   نیاز   ٹھائیں

دودھیر   شیشو راکھی   نے   جتنے رے

کی شیل ماری لی بھائی   تیر ندازے رے

"او میرے ساتھیو اور بھائیو! میرے ہرن سے کہنا کہ وہ دودھ پیتے بچے

کو جتن سے پالے پوسے۔ کیسے تیکھے تیر سے گھائل کر دیا ہے تو نے او بھائی تیر انداز۔"

جنمیر منتو دیکھا تشنا

بلو تارے آ رہے نہ

بھرائی لوسکل سادھ شکاریر بانے رسے

کی بشیل ماری لی بھائی تیر ندانہ سے رسے

"جنم بھر درشن اور بات چیت اب نہ ہو گی اسے بتا دینا۔

لو اب خاتمہ ہوا سب امنگوں کا رے

کیسے تیکھے تیر سے گھائل کر دیا ہے تو نے

او بھائی تیر ندازے رسے

اس بنگلہ گیت نے وہاں سب کو متاثر کیا۔ ایک لمحے کے لئے سب کے چہروں پر سنجیدگی طاری ہو گئی۔ ان میں ہرنی بھی تھی جس کو شکاری کا تیر لگا تھا اور وہ شکاری بھی تھا جس نے ہرنی کو گھائل کیا تھا ہرنی آم کے پیڑ تلے کھڑی تھی۔ کسی طرف سے آیا شکاری؟ ہرن ہرنی کو اکیلا چھوڑ کر چل دیا۔

شبانہ کی آنکھوں کے کنارے آنسوؤں سے بھر گئے۔ وہ اُٹھ کر لان کے ٹیرس کے جنگلے کے پاس آ گئی ایئر کنڈیشنڈ کمرے سے نکل کر رات کی کھلی فضاء میں آتے ہی شبانہ کو محسوس ہوا جیسے وہ زخمی ہرنی کے پاس آ گئی ہے اور فضاء اس کی گرم آہوں سے نیم گرم ہے کمرے سے ہارمونیم کی دھیمی دھیمی آواز کے ساتھ کسی اور عورت کے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ ہرنی کی فریاد دم توڑ چکی تھی۔

سلہٹ کے آسمان پر مرطوب رات کے ستارے چاندنی کے زیوروں کی طرح چمک رہے تھے۔ اسے بے اختیار پر اسرار راحیل کی یاد آنے لگی وہ ستاروں پھولوں بارشوں کا باشندہ تھا۔ یہ اس کے ملک کی چیزیں تھیں۔ مگر وہاں وہ موجود نہیں تھا۔

شبانہ اسے اپنی شادی کی خبر بتانا چاہتی تھی۔ اسی مہینے شبانہ کی شادی ہونے

والی تھی پھر وہ امریکہ چلی جائے گی۔ راحیل کو کیسے خبر ہو گی؟ کیا وہ کبھی اس سے ملنے امریکہ آئے گا نہیں اسے امریکہ آ کر شبانہ کی حالت زار کو نہیں دیکھنا چاہیئے۔ شبانہ آسمان کی طرف تکنے لگی۔ جانے کیوں دور ایک جھلملاتے ستارے کو دیکھ کر شبانہ کو اپنی پیاری سہیلی نجمی کا خیال آ گیا۔

نجمی کی گمشدگی اس کے لئے ایک معمہ بن گئی تھی۔ یہ معمہ ایک اندوہناک حقیقت بھی تھا۔ شبانہ اپنی پیاری اور بدنصیب سہیلی کے بارے میں سوچنے لگی۔ وہ کہاں ہو گی؟ کس حال میں ہو گی؟ شبانہ اس کے بارے میں یہی سوچ سکتی تھی۔ یہ دو ایسے سوال تھے جن کے جواب اس کے پاس نہیں تھے۔

"ہیلو!" پیچھے سے کسی کی آواز آئی۔

لان کے ٹیرس میں کوئی بتی روشن نہیں تھی۔ یہاں صرف سامنے والے برآمدے میں جلتی بتیوں کی روشنی ہی آ رہی تھی۔ شبانہ نے پلٹ کر دیکھا چٹا گانگ کی میڈیکل اسٹوڈنٹ جہاں آراء اپنی ساڑھی سنبھالتی اس طرف بڑھ رہی تھی۔

"تم یہاں کیوں آ گئیں شبانہ۔ یہاں تو حبس ہے۔"

شبانہ مسکرا دی جہاں آراء اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ دور نیچے سلہٹ شہر کے بنگلوں کی روشنیاں ٹیلے کے نشیب میں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ فضاء میں رات کی رانی کی ایک لہر کسی وقت کسی جانب سے آ کر گزر جاتی تھی۔ شبانہ نے کہا۔

"مجھے نیچرل فضاء زیادہ پسند ہے۔"

جہاں آراء اپنے چھوٹے سے رومال سے ماتھے پر آیا ہوا ہلکا ہلکا پسینہ پونچھتی ہوئی بولی۔

"تم کبھی کبھی یہاں آتی ہو ناں۔ اس لئے۔ ستمبر کی راتیں ادھر بڑی حبس آلود ہوتی ہیں تم لاہور کب جا رہی ہو؟ میں نے لاہور کی بہت تعریف سنی ہے دیکھو میں اتنی بڑی ہو گئی ہوں مگر ابھی تک لاہور نہیں دیکھا۔"

شبانہ نے آہستہ سے اپنی ساڑھی کے پلو کو کاندھے پر درست کیا اور بولی ”کبھی آؤ ناں لاہور۔ آج کل تو لاہور میں بڑا اچھا موسم شروع ہو رہا ہے۔“

جہاں آراء نے کہا۔ ”میں دسمبر میں آؤں گی۔ ہمیں دسمبر کی چھٹیاں ہوں گی ناں۔“

شبانہ نے اسے یہ کہنا پسند نہ کیا کہ دسمبر میں وہ لاہور میں نہیں بلکہ واشنگٹن میں ہو گی۔ وہ صرف ایک ہلکا سا گہرا سانس بھر کر رہ گئی۔ جہاں آراء کہہ رہی تھی۔ ”میں نے سنا ہے تم انگریزی میں ایم اے کر رہی ہو تمہیں بھی تو دسمبر میں چھٹیاں ہوں گی۔ تم دسمبر میں چٹاگانگ آ جاؤ۔ میں تمہیں لینے ایئرپورٹ پر آؤں گی۔

ہمارا بنگلہ بڑی پر فضا جگہ پر ہے ہمارا ایک مکان رانگا ماتی میں بھی ہے۔ تم آؤ گی تو ہم رانگا ماتی جانے کا پروگرام بنائیں گے۔ وہاں میرے ڈیڈی کا اپنا جنگل ہے۔“ شبانہ نے پوچھا۔

”رانگا ماتی کہاں ہے؟“

جہاں آراء بولی ”چٹاگانگ سے دور پہاڑی علاقے میں ہے وہاں اس کی دوسری طرف دریائے کرنافلی بہتا ہے۔ ساتھ ہی سندربن ہے۔ سندربن کے شیروں کی تصویر تم نے ضرور دیکھی ہو گی۔ زرد دھاری دار شیر اسے بنگال ٹائیگر بھی کہتے ہیں۔ رانگا ماتی میں چکمہ لوگ رہتے ہیں۔“

شبانہ نے یونہی کہہ دیا۔ ”سنا ہے سندربن میں رات کو پریاں اترتی ہیں۔“

جہاں آراء ہنس پڑی۔ ”میں میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ بھلا میں اس قسم کی باتوں پر کیسے یقین کر سکتی ہوں۔“

شبانہ نے کہا۔ ”مگر میں نے ایک جگہ پڑھا تھا کہ سندربن کی پریاں کرنافلی کے کنارے آ کر نہاتی ہیں اور پھر ساری رات ان کا رقص جاری رہتا ہے۔“

جہاں آراء نے شبانہ کو گردن جھکا کر دیکھا اور مسکرا کر بولی۔ ”کیا تم کو بچوں کی کہانیاں بہت پسند ہیں؟ سندربن میں رات کو پریاں تو نہیں لیکن آدم خور شیر ضرور اپنی کچھاروں سے نکل کر کرنافلی دریا پر پانی پینے جاتے ہیں۔ ہاں سندربن میں چکمہ

قبیلے کے لوگ ضرور رہتے ہیں۔ ان کی عورتیں پورن ماشی کی رات کو آگ کے الاؤ کے گرد ساری رات رقص کرتی رہتی ہیں۔“ شبانہ بولی۔

”وہی پریاں ہوں گی۔ پریاں بھی تو عورتیں ہی ہوتی ہیں اور سب عورتیں پریاں ہوتی ہیں کوئی رقص کرتی ہے۔ کوئی خودکشی کرتی ہے۔“

جہاں آراء نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”شاید ایسا ہو مگر تم وعدہ کرو کہ دسمبر میں ہمارے ہاں ضرور آؤ گی۔“

شبانہ خاموش رہی۔ وہ نشیب میں دور کوٹھیوں میں جگمگاتی روشنیوں کو تک رہی تھی جہاں آراء کے لباس سے کسی بڑے قیمتی عطر کی خوشبو آ رہی تھی۔ شبانہ نے پوچھا۔ ”تم نے کونسی خوشبو لگا رکھی ہے؟“

جہاں آراء نے شبانہ کا ہاتھ پکڑ کر کمرے کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔ ”بھئی اسے سبھی میں چلو۔ میرا تو یہاں دم گھٹ رہا ہے۔“

اور شبانہ کو زخمی ہرنی کا گیت یاد آ گیا جہاں آراء اس درد بھرے گیت کو جیسے فراموش کر چکی تھی۔ تین روز سلہٹ میں رہ کر شبانہ اپنے بھائی عقیل کے ساتھ ڈھاکہ روانہ ہو گئی ڈھاکہ میں عقیل کو ایک دن گزارنا تھا۔ یہاں بھی عقیل کی ایک دوست فیملی گلشن کے علاقے میں رہتی تھی۔ یہ بنگلہ فیملی تھی۔

ان لوگوں نے شبانہ کو دریا کی سیر کرائی سورج غروب ہونے سے ذرا پہلے شبانہ ایک کشتی میں بیٹھ کر دریا کی سیر کو نکل گئی بنگلہ فیملی کی دو عورتیں اس کے ساتھ تھیں۔ غروب ہوتے سورج کی روشنی میں دریا کی لہریں سونے [illegible] رہی تھیں شبانہ کا ڈھاکہ میں جی نہ لگا یہاں کافی رش اور شور تھا۔ رات [illegible] میں موسلا دھار بارش ہوئی دوسرے دن صبح صبح کی فلائٹ میں شبانہ کو عقیل بھائی کے ساتھ واپس لاہور جانا تھا۔

بنگلہ فیملی کی گاڑی میں بیٹھ کر وہ لوگ ایئرپورٹ پر آ گئے۔ ڈھاکہ میں پو پھٹے کا وقت تھا بارش پچھلی رات رک گئی تھی۔ سڑکوں پر کہیں کہیں پانی کھڑا تھا۔ ایئرپورٹ

پر قدرے رونق تھی۔ نبگلہ فیملی الوداع کہہ کر چلی گئی عقیل اور شبانہ لاؤنج میں آ گئے پھر بورڈنگ کارڈ لیا اور جہاز میں آ کر سوار ہو گئے ٹھیک وقت پر جہاز ٹیک آف کر گیا شبانہ کی قسمت میں ایک بار مزید ڈھاکہ آنا لکھا تھا۔ لیکن اس بار شبانہ پر کیا گزرنے والی تھی؟ اس کی شبانہ کو خبر نہیں تھی۔

ڈھاکہ ایئرپورٹ سے اڑان بھرتے ہی پی آئی اے کے جہاز نے ایک چکر لگایا پھر ایک طرف کو جھک گیا پھر سیدھا ہوا۔ ڈھاکہ ایئرپورٹ پر ہمیشہ ایسا ہوتا تھا۔ پھر اس نے اپنا رُخ لاہور کی طرف متعین کر لیا اور ایک خاص رفتار سے پرواز کرنے لگا وقت بھی شاید اسی رفتار سے اڑا جا رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے شبانہ کی شادی کا دن آ گیا۔

ظفر ایک ہفتہ پہلے ہی واشنگٹن سے لاہور آ گیا تھا وہ گر دن اکڑائے کینال لاج والے نبگلے کے کمروں میں چلتا پھرتا تھا۔ شبانہ کے مشرقی پاکستان سے لاہور واپس آنے پر وہ اپنی ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی میں آ گیا جو اس نے شادی کی خاطر کرائے پر لے لی تھی۔ اس کے خاندان والے بھی شہر سے اُٹھ کر اسی کوٹھی میں آ گئے تھے شادی کے نغمے کوٹھی میں گونج اُٹھے۔ سب رسمیں پوری کی گئیں۔ شبانہ کو دُلہن بنانے والی نہ اس کی بہن غزالہ تھی نہ اس کی پیاری سہیلی نجمی ہی وہاں پر تھی۔

پھر شادی کا دن آ گیا۔ شبانہ چپ تھی اسے لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اپنے وجود سے نکل کر دُور کھڑی یہ سارا تماشا دیکھ رہی ہے۔ وہ ایک روز پہلے گاڑی لے کر ڈولنٹن مارکیٹ والی پرانی لائبریری میں گئی یہاں اس نے پہلی بار پُراسرار راحیل کو دیکھا تھا جافری والی میز خالی تھی۔

میز پر گلاب کا کوئی باسی پھول نہیں تھا وہاں گلاب کی خوشبو سے بغل گیر ہوتی پائپ کی خوشبو بھی نہیں تھی کتابوں کی قد آدم الماریاں اپنے سینے میں ہزاروں محبتوں کے الم انگیز واقعات چھپائے خاموش کھڑی تھیں۔ شبانہ بوجھل قدموں سے لائبریری سے نکل کر گاڑی میں بیٹھی اور یونیورسٹی کیمپس والی نہر پر آ گئی لکڑی کے پُل کے قریب

سے نکل کر وہ پرانی کچی کوٹھی کی طرف آ گئی۔ کوٹھی پہلے سے زیادہ ویران لگ رہی تھی اس کے کمروں پر تالے پڑے تھے کوئی چوکیدار بھی شبانہ کو وہاں نظر نہ آیا ایک عجیب طرح کا حسرت و یاس تھا وہاں کی فضاء میں۔ شبانہ دل میں اپنی شکستہ محبت کا درد چھپائے واپس اپنی کوٹھی میں آ گئی تھی۔ اس کے بعد وہ گھر سے باہر نہیں نکلی تھی۔

شام کو ماڈل ٹاؤن سے اس کی بارات آئی شبانہ کے کالج کی سہیلیاں، رشتے دار لڑکیاں اور کینال بینک والے بنگلوں کی خواتین اس کے اردگرد بیٹھی تھیں۔ شبانہ دُلہن بنی ہوئی تھی وہ سر جھکائے بیٹھی تھی جب اسے دُولہا کے ساتھ سجی سجائی کار میں بٹھایا جانے لگا تو شبانہ اپنے ابّو کے گلے لگ کر بہت روئی اس کے ابّو کی بھی ہچکی بندھ گئی عقیل بھی سر جھکائے آنسوؤں بھری آنکھوں کو لئے خاموش کھڑا تھا وہ جانتے تھے کہ شبانہ نے ان کے لئے کتنی بڑی قربانی دی ہے۔

ظفر امریکی سوٹ میں ملبوس سہرے کی جھالر کو ایک طرف اٹھائے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ لئے کار کے دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ جیسے اس نے کوئی شہر فتح کیا ہو کسی آہن پوش قلعے کو توڑ کر اس کی دیوار پر اپنی فتح کا جھنڈا لہرا دیا ہو۔ شبانہ دُلہن بنی کار میں بیٹھ کر ظفر کے ساتھ ماڈل ٹاؤن کی طرف چل دی اور کینال لاج میں اس کا کمرہ خالی رہ گیا کمرے کی کھلی کھڑکی اپنے دونوں کیواڑ کھولے شبانہ کو آواز دیتی رہ گئی۔

لان کے یوکلپٹس کے درختوں نے اپنی شاخوں کو ہلا ہلا کر شبانہ کو آخری بار الوداع کہا ایک ہفتہ لاہور میں رہنے کے بعد ظفر واپس واشنگٹن چلا گیا شبانہ کو ویزے وغیرہ کی ضروری دفتری کارروائیوں کے بعد امریکہ روانہ ہونا تھا وہ ماڈل ٹاؤن میں اپنے سسرال والوں کے پاس ہی رہی دن میں کسی وقت اس کا بھائی اور ابّو اسے ملنے آ جاتے آخر واشنگٹن سے ضروری کاغذات امریکن قونصل والوں کے پاس پہنچ گئے اور دو ہفتوں کے بعد شبانہ اپنے بھائی عقیل کے ساتھ واشنگٹن روانہ ہو گئی۔

امریکہ کی جانب شبانہ کا یہ پہلا سفر تھا اسے نہ امریکہ سے کوئی دلچسپی تھی نہ ظفر

سے جو وہاں اس کا انتظار کر رہا تھا ایئر پورٹ پر اس کے سسرال والے اس کے ابو بھابھی اور کالج کی سہیلیاں بھی موجود تھیں مگر ان میں نجمی نہیں تھی۔ اس روز شبانہ کو نجمی بہت یاد آئی۔

شبانہ ان سب سے رخصت ہو کر آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ جہاز میں سوار ہو کر کراچی کی طرف پرواز کر گئی کراچی میں انہیں پی آئی اے کی انٹرنیشنل فلائٹ کے ذریعے رات کے چار بجے روانہ ہونا تھا رات پونے تین بجے عقیل بھائی اور شبانہ انٹرنیشنل لاؤنج میں آ گئے وہاں کئی غیر ملکی چہرے نظر آئے۔

شبانہ بھائی کے ساتھ ایک کرسی پر خاموشی سے بیٹھ گئی پھر وہ بھائی کے ساتھ چلتی گیٹ میں سے گزر کر طیارے کی طرف چلنے لگی نومبر کا مہینہ شروع ہو چکا تھا کراچی کی رات خنک تھی پی آئی اے کا جمبو جیٹ اپنے عظیم پر پھیلائے پو پھٹے کے جھٹ پٹے میں رن وے سے ہٹ کر کھڑا تھا جمبو جیٹ میں شبانہ کا یہ پہلا سفر تھا عقیل نے ایئر سک نس کی گولیاں اپنے پاس رکھ لی تھیں اور دو گولیاں اس نے شبانہ کو لاؤنج سے روانہ ہوتے وقت کھلا دی تھیں ٹھیک وقت پر عظیم جمبو جیٹ ٹیک آف کر گیا۔

کراچی سے فرینکفرٹ تک تقریباً سوا سات گھنٹے کی فلائٹ تھی شبانہ کی سیٹ کھڑکی کے پاس ہی تھی عقیل بھائی اس کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ جہاز اتنی بلندی پر تھا کہ شبانہ کو نیچے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے جہاز خلاء میں رک گیا ہے اور وہ کہیں نہیں جا رہی اسے راحیل کا خیال آ گیا اسے کون بتائے گا کہ شبانہ کی شادی ہو گئی ہے؟

شبانہ نے آنکھیں بند کر کے سر سیٹ کے ساتھ لگا دیا پھر وہ سو گئی دو گھنٹے تک سوئی رہی جب آنکھ کھلی تو باہر دن کی گلابی روشنی پھیلی ہوئی تھی عقیل نے اسے بتایا۔

"ہم خلیج کے ملکوں کے اوپر سے گزر رہے ہیں۔"

شبانہ نے کھڑکی کے شیشے میں سے نیچے دیکھا۔ اسے سوائے دھندلی دھندلی بھوری اور سیاہ پہاڑیوں کی لکیروں کے اور کچھ دکھائی نہ دیا۔ جہاز میں اس کی طبیعت

خراب نہیں ہوئی تھی مگر وہ بیٹھے بیٹھے تھک گئی تھی۔ وہ اٹھ کر باتھ روم تک گئی۔ واپس آ کر پھر سو گئی۔ اس کے بعد شبانہ کی آنکھ کھلی تو عقیل بھائی نے کہا۔

"ہم یورپ کے علاقے میں داخل ہو گئے ہیں شبانہ۔"

شبانہ نے کھڑکی میں سے نیچے جھانکا۔ اسے دور بہت دور نیچے شطرنج کی بساط کی طرح چھوٹے چھوٹے کھیت اور کہیں کہیں سرخ چھتوں والے کاٹج نظر آ رہے تھے پھر جہاز میں اعلان ہوا کہ ہم تھوڑی ہی دیر میں فرینکفرٹ کے ایئر پورٹ پر پہنچنے والے ہیں برائے مہربانی حفاظتی پیٹیاں باندھ لیجئے اور سگریٹ بجھا دیجئے شکریہ۔

فرینکفرٹ میں بارش ہو رہی تھی۔ شبانہ جہاز سے نکل کر جھکتی ہوئی راہداری میں سے گزرتی ٹرانزٹ لاؤنج میں آئی تو اسے شدید سردی کا احساس ہوا۔ عقیل پہلے بھی کئی بار یورپ اور امریکہ کا سفر کر چکا تھا۔ اس نے پہلے ہی سے شبانہ کے لئے فر کا گرم لمبا کوٹ اور مفلر نکال کر اسے دے دیا تھا۔ ان گرم کپڑوں میں بھی شبانہ کو سردی لگ رہی تھی۔ حیرانی کی بات تھی کہ فرینکفرٹ کا ٹرانزٹ لاؤنج ہیٹڈ نہیں تھا۔ لال چہروں والے مرد اور زرد بالوں والی عورتیں ادھر ادھر چل پھر رہی تھیں۔

شبانہ شیشے کی بلند و بالا دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ بارش میں ایک جہاز پر سامان لاد رہا تھا۔ موٹر ٹرالیاں اور نیلے رنگ کی ویگنیں بڑے نظم و ضبط سے آ جا رہی تھیں۔ دیوار کے موٹے شیشے کی وجہ سے شبانہ کو ان موٹر گاڑیوں کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اسے بارش کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ پہلی بار شبانہ بارش کو گرتے دیکھ رہی تھی مگر اس کی آواز نہیں سن رہی تھی۔

اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی خاموش فلم دیکھ رہی ہے۔ اس نے بارش کی آواز سے ہمیشہ ہی محبت کی تھی اور یہ آواز اس سے جدا ہو رہی تھی۔ دیوار کے اتنے موٹے شیشے بھی یورپ کی سردی کو روکنے میں ناکام ہو رہے تھے۔ شبانہ کو سردی لگنے لگی تو عقیل بھائی اسے ایک اسٹال پر لے گئے جہاں انہوں نے گرم گرم کافی پی [illegible] پینے سے شبانہ کو سکون محسوس ہوا۔ اسے بے اختیار آج سے پانچ سو برس پہلے سے

جرمن کاؤنٹوں کے وہ قدیم قلعے یاد آ گئے جن کی نیم روشن راہداریوں میں خادمائیں بے آواز قدموں سے چلا کرتی تھیں اور جہاں آتشدانوں کے پاس اونچی گدے دار کرسیوں پر بیٹھ کر کاؤنٹ اپنی بیگم کے ساتھ چائے پیتے ہوئے ایرانی قالینوں پر اپنے بچوں کو کھیلتے دیکھا کرتے تھے۔

لندن کے ہیتھرو ایئرپورٹ پر شبانہ کو انیسویں صدی کے برطانوی شاعر یاد آئے اور اس کا جی چاہا کہ وہ لندن اور مضافات کے قدیم پرسکون قبرستانوں میں جا کر ان شاعروں کی قبروں کو دیکھے کہ کیا آج بھی خزاں میں ان کی تربتوں پر درختوں کے زرد پتے گرتے ہیں۔

لندن سے واشنگٹن تک کا سفر کافی طویل تھا۔ شبانہ آہستہ آہستہ مغربی موسم اور وہاں کی فضاء سے مانوس ہوتی جا رہی تھی۔ لاہور سے لندن تک جہاز بھرا ہوا تھا لندن سے آگے جہاز میں بہت کم مسافر رہ گئے۔ انہیں بتایا گیا کہ جہاز نیویارک کے ایئرپورٹ پر شام کے سات بجے پہنچے گا۔ یہ ساری پرواز سمندر کے اوپر تھی۔ شبانہ سو گئی۔ دو ایک گھنٹے سونے کے بعد اس کی آنکھ کھل گئی۔

جہاز کی پرواز جاری تھی۔ دوپہر کا کھانا آ گیا۔ کھانا کھانے کے بعد شبانہ پھر سو گئی اس کے ذہن میں طرح طرح کے خدشے اور اندیشے آ رہے تھے۔ امریکہ پہنچ کر ظفر کا اس کے ساتھ کیسا سلوک ہو گا۔ لاہور میں اس کے ساتھ دو ایک روز گزار کر شبانہ نے محسوس کیا تھا کہ ظفر کا رویہ سرد مہرا اور متکبرانہ ہے۔ اس نے بھی ظفر کی خوشامد نہیں کی تھی۔ لیکن اس نے بے تعلقی اور نفرت کا اظہار بھی نہیں کیا تھا۔

امریکہ کا براعظم شروع ہوا تو جگہ جگہ روشنیاں نظر آنا شروع ہو گئیں۔ امریکہ کے وقت کے حساب سے شام کے سات بج رہے تھے کہ جہاز نیویارک کے جان ایف کینیڈی ایئرپورٹ کی روشنیوں سے جگمگاتی فضاؤں میں آہستہ آہستہ اترنا شروع ہو گیا۔ شبانہ پہلی بار نیویارک کی روشنیوں کو دیکھ رہی تھی۔ یہ سچ مچ روشنیوں کی دنیا تھی جہاز رن وے پر اتر آیا۔

جان ایف کینیڈی ایئرپورٹ پر ہر طرف روشنیاں ہی روشنیاں تھیں جن میں آ رہے مردوں اور عورتوں کے ہیولے گھوم پھر رہے تھے۔ شبانہ ان کا مشاہدہ کرتی عقیل بھائی کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ عقیل اسے نیویارک کے بارے میں بتاتا جا رہا تھا۔ یہاں سے انہیں نو بجے ٹی ڈبلیو اے واشنگٹن تک کی فلائٹ مل گئی۔ ٹی ڈبلیو اے اندرونی پرواز والا جہاز چھوٹا تھا۔

شبانہ نے محسوس کیا کہ پی آئی اے کی جو ایئربسیں پاکستان کی اندرونی پرواز کے لئے استعمال ہوتی تھیں وہ ان جہازوں سے زیادہ کشادہ اور آرام دہ تھیں۔ لال لال چہروں والی امریکی ایئرہوسٹس ہر ایک کو دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔ مسافروں کو قوم کے تکیے دے رہی تھیں۔ یہ ایک گھنٹے سے بھی کم وقت کی پرواز تھی۔ عقیل بھائی نے شبانہ کو بتایا کہ ڈیلس ایئرپورٹ پر ظفر آیا ہوا ہو گا۔ انہوں نے چلنے سے پہلے ٹیلی گرام بھی دے دیا تھا۔ اور اسے فون بھی کر دیا تھا۔

نیویارک ایئرپورٹ سے عقیل بھائی نے ظفر کے واشنگٹن والے مکان پر فون کیا تو کسی امریکی خاتون نے اسے بتایا کہ مسٹر ظفر ایئرپورٹ پر گئے ہوئے ہیں۔ عقیل نے شکریہ ادا کر کے فون بند کر دیا۔ یہ امریکی خاتون ظفر کی ملازمہ کے سوا اور کون ہو سکتی تھی؟ امریکہ میں ظفر ایسا سرمایہ دار کاروباری آدمی ہی ایک امریکی خادمہ کا بوجھ اٹھا سکتا ہے۔

شبانہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ اسے نیچے روشنیاں اس طرح دکھائی دے رہی تھیں جیسے کسی نے ستارے توڑ کر بکھیر دیئے ہوں۔ جہاز واشنگٹن کی ڈیلس ایئرپورٹ پر اتر آیا۔ یہاں لندن کے مقابلے میں زیادہ سردی تھی۔ ظفر لاؤنج کے باہر موجود تھا اس نے تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا۔ مسکراتے ہوئے آگے بڑھ کر اس نے عقیل بھائی اور شبانہ سے ہاتھ ملایا۔ پھر پوچھا۔

"راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔" شبانہ جواب دینے ہی والی تھی کہ عقیل بھائی بول پڑے۔

"بالکل نہیں بالکل نہیں۔ بڑے سکون سے سفر کٹا۔ کیوں شبانہ؟" شبانہ نے اثبات

میں سر ہلا دیا۔ ظفر اس شان سے آگے آگے چل رہا تھا جیسے وہ عقیل اور شبانہ کو اپنا مقتدر علاقہ دکھانے والا ہو۔ اس نے شبانہ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ شبانہ ایک آہ بھر کر رہ گئی۔ خدا جانے اس شہر میں اس کے ساتھ کیا گزرنے والی تھی۔